ہوالکریم

دیوانِ ذوق

یعنی

ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام

جس قدر بہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانحعمری

مؤلفہ

شمس العلما مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

حسبِ فرمائش

آغا محمد طاہر مالک آزاد بکڈپو دہلی

محبوب المطابع دہلی میں طبع ہوا

سنہ ۱۹۳۲ع

۱۳۵۱ھ

شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلہ کے شوقین نوجوان دلوں کی امنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوالیجاتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ پڑھتا پھرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حُسنِ اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں۔ اُس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اُس کا مزا اب تک نہیں بھولتا۔ اُنہیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذ پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے اُنکا ذہن بھی تیزی اور براقی میں لاجواب تھا۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لیئے اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے ✦

(حاشیہ: اسی عالم میں بیقرار تخلص کرتے تھے۔)

(بقیہ صفحہ گزشتہ) لکھا ہوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردہ پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردہ پر

کہ زلک مژگان چشم ستمگر آکے جگر میں گھوپ چلی — آکے ہمدم ساتھ اُدھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی

وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوق جنہوں نے کل دنکو — آج وہ آپ پاس مرے جب ڈیڑھ پہر کی دھوپ چلی

فاقہ مست عدو سے بد ایسا ہی جھنی کا رجاتا ہے — نانی جسکی آئی چھٹی میں دھوم سے لیکر کھی کھچڑی

شیخ بگھارے شیخی اپنی مفت کے نقمے کھاتا ہے — دود ملید اُٹھاتے ہیں یا مست قلندر کھی کھچڑی

ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے ساتھ بڑھے۔ ہر معرکہ میں شریک حال رہے۔ اور تھوڑے دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اسطرح حضوری خدمت ہر وقت پاس بیٹھکر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اسطرح سنے ہیں گویا سامنے گذرے ہیں۔

تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنیوالے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے لیکن نہیں! اُس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اسکی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

خاندان

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انہیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علیخاں نے انہیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کا داروغہ مقرر کر رکھا تھا۔

۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے

۱۱۔ ذیحجہ ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اُن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلہ کے اکثر لڑکے اُنہی کے پاس پڑھتے تھے انہیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

تعلیم و تربیت

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوق تخلص کرتے تھے[1]۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے

---

[1] نمونہ کلام یہ ہے۔ مزا انگور کا ہے رنگترے میں۔ اثر زنبور کا ہے رنگترے میں۔ ہیں اشعار بلالی اسکی پھانکیں۔ یہ مضمون درد کا ہے رنگترے میں۔ نہیں ہے اسکی ان پھانکوں میں زیبا۔ یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں۔ ہے گلگوں مجسم یا بھرا خون۔ کسی مجبور کا ہے رنگترے میں۔ مزاج اب جیسا صفراوی ہے اے شوق۔ دل اس رنجور کا ہے رنگترے میں۔ (دیکھو دیگر)

اور مباحثے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل پر جو معرکہ ہوا ردیف ی میں درج ہے دیکھو۔ ع

یہاں کے آنے کا مقدر قاصد اوہ دن کرے

اگرچہ لوازمات شاعری جو ایک ہونہار سخنور کے لیئے چاہئیں سب انکی طبیعت میں جمع تھے۔ لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوشِ نقش پا۔ آغوشِ نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لیگئے انہوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ یہ وہاں سے چپکے چلے آئے دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے احتیاط شرط ہے۔ قریب شام کے افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک جا پہنچے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے۔ وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے انہیں پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا انہوں نے بیان کیا میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہیں تو سناؤ! انہوں نے وہی غزل سنائی۔ میر صاحب کو انکے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک ان کے لیئے دعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب موصوف کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا تھا اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لیئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ دیکھو ردیف الف میں۔ ع

رکھتا بہر قدم ہے یہ وہ ہوشِ نقش پا

اس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ طبیعت کی

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُنہی سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُن کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

اِسے عطاء الہٰی کہنا چاہیئے کہ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا۔ میاں عبدالرزاق ایک فاضل اسی محلہ میں صاحبِ تدریس تھے اُن کے درس میں جاکر شامل ہونے لگے۔ وہیں والدِ مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں پلتی رہی۔ نیکی کی بنیاد ہمیشہ استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ اخیر دم تک قایم رہا۔ یہ بات اب سکے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوتی +

سلسلہ اصلاح جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمن کے آئینوں کا جوہر ہے اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقعوں پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے اُن کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہدیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر اُنھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی اور پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ کبھی بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد ہے۔ یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے اس لیئے اُنہیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جسقدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں جوانی کے جوش بھرے ہوئے تھے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل مشکل طرحیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض کہ اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی

میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کیساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کیلیے ولیعہد سے شقہ چاہا مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں اُن کے مختارِ کُل تھے اور وہ ہر وقت اِس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان ہو گیا۔ اور وہ چلے گئے ✦

ولیعہد شاگرد ہوتے ہیں

چندروز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ اِنہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہا در بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم اور کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لیئے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ابو ظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اِسکا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپیہ کے فقط پانسو روپیہ مہینا ملتا تھا۔ غرض چندروز اصلاح جاری رہی اور آخر کار سرکار ولیعہدی سے للعہ مہینا بھی ہو گیا۔ اُسوقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب وداب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو نوکری سے روکا۔ لیکن اِدھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ، نہ سمجھنا۔ یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قایم ہوئے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولیعہد کے استاد ہو گئے ✦

نواب الٰہی بخش خاں اصلاح لیتے ہیں

دلی میں نواب علی بخش خان معروف ایک عالی خاندان امیر۔ علوم ضروریہ سے

شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثرِ برقی کیطرح دوڑی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکلکر کوچہ و بازار میں رنگ اڑانے لگیں +

قلعہ میں کس تقریب سے پہنچے

اکبر شاہ بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اسلیئے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق میر غالب علیخاں سید۔ عبد الرحمٰن خان احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ حکیم قدرت اللہ خان قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم مرزا عظیم بیگ عظیم۔ شاگرد سودا۔ میر قمر الدین منت۔ اور ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع طرح میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا۔ مصرع پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اس اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے +

قدرتی سامان

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے انہی دنوں میں جان الفنسٹن صاحب پشاور پنجاب سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ اُنہیں ایک

شروع کر دیے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا کان بدمزہ ہوگئے کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستاد مرحوم نے اُنہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلعے اُس کے پڑھے :-

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہوگیا کہ ہفتہ میں دو دن جاتے اُن سے غزل لے آتے اور اصلاح کی ہوئی دے آتے۔ چنانچہ جو دیوانِ معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال اُن ہی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نوابِ مرحوم اگرچہ ضعفِ پیری کے سبب سے خود کاوش کرکے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر سخن کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچے تھے کہ جو حق ہے۔ اُس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمائش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاوشیں اُٹھانی پڑیں۔ مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے ؛

نواب الٰہی بخش خاں معروف فن شعر کے کامل ماہر تھے

فرماتے تھے کہ اپنی مدتِ شوق میں وہ بھی کبھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر اخیر میں کچھ مقتضائے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحبدل اور صاحبِ نسبت تھے خواجہ میر درد کی طرز میں آگئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اور تھا۔ جوانی دوانی۔ جرأت کے رنگ میں۔ کبھی سودا کے انداز میں۔ اور وہ رد کرتے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہکر دکھاتے۔ اب اُن کا دیوان ویسا بنا دیتے جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے۔ اور کہتے ہائے الٰہی بخش خاں۔ ان کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اور اس طرح ذکر کرتے تھے۔ جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سینکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا

باخبر اور شاعری کے کہنہ مشاق- اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں- جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے- زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے اُن کا کلام گذرانا تھا- ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے- اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا- جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انہیں اشتیاق پیدا ہوا- یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے دولتِ فقر کی برکت سے ترک دنیا کرکے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا- استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹- ۲۰ برس کی عمر تھی گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے بعد وہاں بیٹھا وظیفہ پڑھا کرتا تھا ایک دن چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا- وظیفہ سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور کا تھا چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے- یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچتا ہے- مگر آپ سے سننے کو جی چاہتا ہے- استاد نے کہا کہ کل تو کام ہے- یہ کہہ دینا کہ پرسوں حاضر خدمت ہوؤنگا - تیسرے دن تشریف لے گئے وہ بزرگانہ اخلاق سے ملے اور بعد گفت گوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی انہوں نے ایک غزل شروع کی تھی اُس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی   چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور لطف حاصل ہوا- اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں- عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آنکلے ؛

استاد کا ادب-

نواب اُنہیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح اُٹھ کر سلام کیا جو سعادتمند شاگردوں کا فرض ہے- وہ ان سے خفا رہتے تھے- کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا- غرض انہوں نے اپنے شعر پڑھنے

سے لیا تھا وہ انہیں دیا ✤

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اس کا نام **تسبیح زمرد** رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی اُستاد مرحوم نے پروئی تھی۔ اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہکر لگائی تھی جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کے بذل و کرم اور حسن اخلاق اور علو رتبہ کے سبب سے اکثر شرفا خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے۔ اور اشعار سنتے سناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں **آشفتہ** ایک پرانے شاعر شاہ محمدی **مائل** کے شاگرد اور ان کے مرید تھے عمدہ وظیفہ بھی پاتے تھے۔ آشفتہ کے شعر میں ہری چُگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا:۔

تسبیح زمرد

سوروپیہ کو ایک محاورہ خریدا

آج یہاں کل وہاں گزرے یونہی چُگ ہیں	کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہیں

آشفتہ کو سو روپئے ایک رومال میں باندھ کر دے دیے کہ تمہاری کاوش طبع کیوں خالی جائے ✤

فرماتے تھے ایک دن مجھے ایک غزل دی اور کہا کہ میاں ابراہیم یہ غزل ہماری مدت سے پڑی ہے۔ دیوان میں درج نہیں کی۔ ردی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مقطع اس کا ہمیں پسند ہے۔ **مطلع**:۔

میں جو کھٹنے لگا کچھ یار کے ناخونوں میں	بولے رکھو چھوٹے ہیں تجھ سا کے ناخونوں میں

اُسی وقت عذر معقول میری سمجھ میں آگیا۔ اور **معروف** اس خوبی سے موزوں ہوا:۔

غلط العام فصیح ہے سخن میں معروف	پھر سخن کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں

دلی میں آب حیات کو دیکھکر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کرامت

کے کاموں کا دستور العمل ہیں +

الٰہی بخش خاں مرحوم کی سخاوت

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر۔ فقیر۔ بچہ بوڑھا اُسے بغیر دیے نہ رہتے تھے۔ اور دینا بھی وہی جو کہ اُس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھکر بناتے جاؤ۔ سُناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر اُن کی خوشی اُسی میں دیکھی تو مجبور رہا اور یہی خوب ہوا +

ایک دن میں اُن کا دو غزلہ بنا رہا تھا۔ اُس کا مقطع تھا :۔

اک غزل پر دردی معروف لکھا اس طرح میں	ذوق ہے دل کو نہایت درد کے شعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے	جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

تلوار کی قدردانی

سوداگر آیا اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ اُن میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی وہ پسند آئی۔ خم دم آبداری اور جوہر دیکھکر تعریف کی اور میری طرف دیکھکر کہا :۔ ع

اس ضعیفی میں یہانتک شوق ہے تلوار سے

میں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا۔ بہت خوش ہوے +

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج	اِس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے حالات و خیالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲ - ۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو اُنھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ممدوح کی کمر سے بندھوائی اور کہا ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش	چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر

سُنائی۔ اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے آسے میں اُستاد مانتا ہوں[1]۔ دوسرے مشاعرہ میں اُنہوں نے اس پر غزل پڑھی شاہ صاحب کی طرف سے۔ بجاے خود اُس پر کچھ اعتراض ہوے جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کی صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنہوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ مگر ولیعہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے جو کہا تھا۔ وہی جواب میں لکھدیا اور یہ شعر بھی لکھا:۔

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں	کسے بہ دیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا۔ اور دربارِ شاہی میں جاکر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں۔

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو۔ بہ سر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کرکے فرمایا کہ اُنہوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابلِ خطاب ہوں اُنہوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ اُنہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا۔ کہ خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے۔ کہ فاصلہ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے۔ قصیدہ کا مطلع تھا:۔

معرکۂ عجیب

صرصرِ کوہ میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد	آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو پھٹنے کے سبب سے حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض

[1] یہ غزلیں شیخ مرحوم میر کرد لیر بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں سے اصلاح دکھلاتے تھے۔

بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہوگا۔ اس مضمون کو تم نکال ڈالو۔ میں کیا کہوں کہ اُستاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اُن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ دکھاؤں کسے +

ذوق کا ... ... (حاشیہ)

اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی جب میں رخصت ہوتا تو آفتاب دس دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ میں نے گوشۂ جانماز اُٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا۔ ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ میں سمجھ گیا اور لے لیے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔ پھر جب کچھ دیتے تو اسی طرح دیتے۔ یہ گوشۂ جانماز اُٹھاتے اور لے لیتے +

حقہ ... پلواتے ہیں (حاشیہ)

ایک دفعہ اُستاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے ضعف تھا اور کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ مگر نواب صاحب حقہ پلوائیں تو خالی کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی۔ نیچہ اور چلم۔ مغرق نیچہ۔ مرصع مہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دی +

بیدہ بھی خالی نہ جائے (حاشیہ)

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن اُستاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زین کسا ہوا۔ اُس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے کیا جائیگا کہ میں کس کے پاس گیا تھا +

شاہ نصیر مرحوم سے معرکہ آرائی ہوتی ہے (حاشیہ)

اِدھر ولیعہد بہادر کی فرمائشیں۔ اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں۔ کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں

نے ان سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو چنانچہ یہ نوبت ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب کا آدمی انہیں ڈھونڈکر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا +

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گُل کُشتی ہماری دیکھی ہوئی تھی مگر حکیم مرزا محمد صاحب[1] رحمہم اللہ زندہ تھے اور میرے والد مرحوم اُن ہی کا علاج کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اُن سے جاکر پوچھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ رواجِ اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے جس بحر میں چاہو لکھو۔ اُستاد کے مسودوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اُس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا۔ دو شعر اتنے یاد ہیں +

یا قلزمِ ہستی کے حباب لب جو تھے	کُھلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے
ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں	لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُنکے گلو میں

دربار شاہی سے خاقانی ہند خطاب ملتا ہے

چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ سنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد ۱۸ تھی مطلع اُس کا یہ ہے:۔

آب و ابلولہ ہوے نشو و نمائے گلشن	جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھیرا مسکن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی

[1] حکیم مرزا محمد صاحب علم و فضل کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع الکمالات تھے۔ طب میں حکیم شریف خاں مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم محمود خاں کے دادا تھے۔ حکیم مرزا احمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور اُن کے والد بھی صاحب علم و فضل شاعر تھے کامل تخلص کرتے تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر مصنف حدایق البلاغت کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک معرکہ رسالہ علم قوافی میں ہے انہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے تین باب باقی تھے کہ دنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علما نے کتاب مذکورہ کے جواب لکھے ہیں۔ مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے۔ کسی نے نہیں لکھا +

نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ! اس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انہوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان سوال و جواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر حسن تاثیر کا پڑھا:۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم	آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

مشاعرہ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گزرانا۔ ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیئے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُس نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ تغلیب ہے اس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھکر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی اُستاد نہ ہوا؟ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پیچ فیصلہ کرنا چاہیے۔ اور جلسہ برخاست ہوا ؛

تکمیل علوم کے قدرتی سامان

اُسی دن سے تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی اُستاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب رام

ردکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق ہے ذرہ ترا پرتو نورِ سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کیلیے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقع آئے۔ تو اُستاد کیلیے یہ ہوا کہ للعہ ر مہینے سے قہ ر ہو گئے۔ قہ ر سے معہ ر ہوگئے

جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا مگر اُستادِ شاہی کو صہ مہینا۔ پھر بھی انہوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کیلیے عرض نہیں کی ان کی عادت تھی کہ فکر سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کیا کرتے تھے چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون پیدا ہوا اور درستی کیساتھ موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کیطرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

یوں پھرتا ہے کمالِ آشفتہ حال افسوس ہے اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی ان سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن ان کے پاس گئے اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں ہوتی۔ زبان تک درست نہیں مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے وہ اس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنے ادنے متصدی اُس کے لکھتے پڑھتے ہونگے۔ وہ کیسا ترستا ہوگا۔ کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی۔

چندروز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترکی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا نواب حامد علیخاں مرحوم مختار ہو گئے۔ تب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا ہوا ہمیشہ

[1] فراش خانہ کی کوٹڑی رہتے تھے۔

عمر ۱۹ برس کی تھی +

حافظ احمد یار[1] نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبد الرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے۔ اور جنازہ کس کا ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں +

خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کمسن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا۔ اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے۔ اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ قصیدۂ مذکور لاکر پڑھا گیا میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُس وقت یہی کہا تھا۔ اور جب میں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا۔ تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی۔ جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی۔ اور اُس کی تاریخ کہی۔ ع

توبہ اور توبہ کی تاریخ

	اے ذوق بگو سہ بار توبہ	

مرزا **ابو ظفر** بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ تو انھوں نے یہ پہلے قصیدہ گزرانا

مبارکباد ہوئے گزر بادشاہ ہوا

[1] حافظ احمد یار سید انشا کے یار تھے۔ یہ عجب شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ سخن فہم شخص تھے۔ باوجودیکہ اُستاد جوان تھے۔ وہ بڈھے تھے۔ مگر یاروں کی طرح ملتے تھے۔ حافظ مرحوم اُنہی مولوی صاحب کے داماد تھے۔ جنھوں نے حلت زاغ کا فتوےٰ دیا تھا۔ اور سودا نے اُس کی ہجو کہی تھی۔ ترجیع بند مخمس میں ع اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے +

پھر یہ قطعہ پڑھا:-

چہ خوش گفت فردوسی پاک ذات — کہ رحمت بران تربتِ پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است — کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

خوفِ خدا میں لطیفہ

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت + چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار ان کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پہ آن بیٹھی۔ انہوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی انہوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے؟ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پہ تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ ملا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا لگائے گا اور بِسْمِ اللہِ اَللہُ اَکْبَر کر دیگا۔ دیوانی ہے جو تمہارے سر پہ آئے۔

ایسے صاحب نظر کہاں ہوتے ہیں

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں از بر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا

میں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یاد کرکے اِس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اُسوقت تیری عمر بَرس دِن سے کچھ کم تھی +

صلاحیت طبع

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دن اِملی کے درخت میں کنکوا اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اوپر چڑھ گیا۔ ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی میں نیچے آپڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اڑایا۔ نہ درخت پر چڑھا +

خوف خدا

عُمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالمِ جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوّتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہوکر اُسکے بنانے کی صلاح ٹھیری۔ ایک ایک جُزو کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذِمّہ ہوا۔ چنانچہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلادیئے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے پل مزے کے لیئے ۴۰ بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لیئے ہر قسم کی لذّتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا۔ اور اُنہیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان توڑ پھوڑ یاروں میں جاکر کہدیا کہ بھئی ہم اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے +

خوفِ خدا

عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ اُس وقت حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ تجھے کسے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر

نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک
ستارہ کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لیے دو دو برس چاہییں ۔
یہ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا ۔

نجوم و رمل

نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا کہ ولیعہدی کا زمانہ تھا ۔ مرزا مغل بیگ کا
بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم بے تربیت جاہل تھا ۔ غریبی سے
بھائی کی بدولت آسودہ ہو گیا تھا ۔ دماغ کو تراشتا تھا ۔ سرکار میں صاحبِ دست
تھا ۔ کاروبار میں دخیل تھا ۔ یہی لوگ اجزائے دربار تھے ۔ اُستاد جاتے تو اُنہیں
میں بیٹھنا اور وقت گزارنا پڑتا ۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا ۔ اُس سے ہنسا
کرتے اور دل بہلایا کرتے ۔ اُس کی ایک رنڈی بھی تھی ۔ اُستاد کبھی کبھی کہتے کہو
تمہاری وہ کیسی ہیں ؟ وہ کہتا خوب ! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی
تھی ۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے اور کہتے کیوں جی آج رات کو
تو جوتی چلتی رہی ۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات کو تو مزے میں تھے ۔ کیوں جی
وہ عطر ہی پر بگڑی تھی یا اور بات پر ۔ روشن بیگ سوچتا کہ انہیں کہاں سے
خبر ہو جاتی ہے ۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اُس سے ملتے نہ ہوں ۔ گھبراتا اور شرماتا ۔

اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انہیں نجوم میں بڑا دخل ہے ۔ ایک دن
اُستاد گئے ۔ بادشاہ محل میں تھے ۔ خبر ہوئی ۔ باہر آئے مٹھی سامنے بند کر کے
اُن سے پوچھا ۔ بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ ۔ ہمارے
ہاتھ میں کیا ہے ۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے ۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ گوشت
کی بوٹی معلوم ہوتی ہے ۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی ۔ رہی تھی ہاتھ میں
ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی ۔ انہوں نے اُس دن سے توبہ کی
پھر کبھی موقع ہی آ جائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے ۔ وہ بات نہیں تھی ۔

مکھن لعل کے کٹڑے میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے ۔ ایک مرد

تصوف

معلوم ہوتا تھا گویا نفسِ کتب دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابو سعید ابو الخیر تھے۔ کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے۔ ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سن لیا ہے آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا بڑا تعجب ہے۔ مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ان کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے ؟

علم طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو۔ بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے ؟

چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا

کہتے تھے کہ شعر کا بچپن سے عشق ہے۔ ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا۔ خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لیے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے۔ ۱۰۰ برس سیکھے ۱۰۰ برس سنتا پھرے۔ اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر ۱۰۰ برس بیٹھ کر اوروں کو سنائے اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور ؟ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم و رمل کا ایک صاحب کمال مغلپورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا

گزارہ کا انداز

ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھڑی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی جاڑا۔ برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ انہیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ۔ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دنیا کے شادی و غم سے انہیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اول روز بیٹھے وہیں بیٹھے۔ اور جب ہی اُٹھے کہ دنیا سے اُٹھے +

پاک خیال

ہر وضو کے بعد ایک لوٹے سے برابر کُلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسف ہو کر بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہکر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے — کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

اوراد و وظائف

معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھے بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کُلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیر آسمان کبھی ٹہلتے جاتے۔ کبھی قبلہ رُو ٹھہر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے مگر اکثر اوقات اس جوش دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا گویا سینہ پھٹ جائیگا +

وظیفہ پڑھکر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی کہ الٰہی ایمان کی سلامتی بدن کی صحت۔ دنیا کی عزت و حرمت۔ پھر الٰہی میرے بادشاہ کو با دولت با اقبال صحیح و سالم رکھ۔ اُس کے دشمن ردہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لیے۔ پھر اپنے عیال اور خاص خاص دوستوں کے لیے۔

دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اُنھوں نے بے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحبِ کمال ہو۔ اور غالباً کمال اُس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعث تفریح ہو۔ اس کا کمال زواج خوب یاد ہے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کیے جاتے تھے جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اس کی عمر کیا ہو؟ اُنھوں نے کہا کہ ۶۷ - ۶۸ عدد ۶۹ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرے پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے لیکن واقعہ نظر کے سامنے گزرا تھا اس لیے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا کہ اُنہیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنھوں نے مبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اُس قصیدہ کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اُس کے سنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

زہے نشاط کہ گر کیجیے اُسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ تائے سریر

اس کے آگے شعر سناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور! ظہوری کا ساقی نامہ ہو گیا۔ چپ ہو گئے۔ اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گھلا جاتا ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ ان کی طبیعت کو خدائے تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں خوش تھے۔

عجیب پیشین گوئی

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں سب ذخیرہ نکالا۔ محنت نے اُس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا۔ کیونکہ بچپن سے لیکر دم واپسیں تک کا کلام اُنہی میں تھا اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں +

چنانچہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہ و بالا ہو جائیگا حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعۃً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزندِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعۃً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ اُن کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائیگا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔ حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض درد خواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دلّی کے ساتھ برباد ہوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے۔ اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت

یا جو کسی دوست کے لیے خاص مشکل درپیش ہو۔ وغیرہ وغیرہ ایک شب اُس موقع پر سیہ۔ والد مرحوم اُنہی کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں مانگ چکے۔ چنانچہ اُن کے دروازہ کے سامنے نلہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی جما حلال خور کا بیل بیمار ہے اُسے بھی شفا دے۔ بیچارہ بڑا غریب ہے۔ بیل مرجائے گا تو یہ بھی مرجائے گا۔ والد نے جب یہ سنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ اُنہیں ایسا ولی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا +

ترتیب دیوان

فصاحت کا دل خون ہوتا ہے جب ان کے دیوان منتشر پراگندہ پر تقریب ہے اُن کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے اور مرثیہ خوانی اُس کی میرا فرض ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ ۱۵-۱۶ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جُدا کاغذ پر لکھی جاتی۔ اسی طرح طاق میں رکھ دیئے۔ کہ فرصت میں نظر ثانی کریں گے۔ جب طاق بھر گیا تکیہ کے غلاف میں بھرے۔ اور گھر میں دیدیے اور کہہ دیا کہ احتیاط سے رکھنا۔ کبھی مٹکے میں۔ کبھی ٹھلیاں میں بھرے اور گھر میں بھجوا دیے کہ ضائع نہ ہوں اس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے۔ ٹھلیاں بھر گئے تھے +

والد مرحوم نے آغاز شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کار و بار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو اُستاد کا کلام اُن سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بد اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے جاتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی +

پہنچے۔ معرفت ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ اُن کی پسند طبع کے بموجب انہیں بھی تصوف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرأت اور سید انشا و مصحفی کے مطلعے اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُن کی غزل اخیر کو گلدستہ گلہائے رنگا رنگ ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملہ کے۔ دو تین ایسے یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اُسی میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورے کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میر۔ مرزا۔ درد۔ مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا اُنہی کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا اُسی دستور العمل سے اُنہوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان اُن کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔

قصائد پر رائے

نظم اُردو کی نقاشی میں مرزا سے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور اُنہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔

کے محتاج نہیں تھے۔ باوجود اس کے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرضکہ ایک مشکل میں
کئی کئی مشکلیں تھیں۔ شاگردوں نے اس مہم کو سرانجام کیا اور سنہ ۱۲۹۰ھ میں ایک مجموعہ جس میں
اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار۔ اور چند قصیدے ہیں چھاپکر
نکالا۔ مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں عمر
کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں۔ رات کی شب براتیں تن
کے آرام۔ دل کی خوشیاں طبیعت کی امنگیں سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا
جس کی انتہا اتنا ہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہیگا۔ تاہم کار زمانہ
کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنے ادنے
شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ اس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ ع یعنی خدا جو
چاہے تو بندے کا کیا چلے ٭ ہے۔ ہاں بعض قصیدے ہیں۔ اکثر غزلیں میں یہ دخل
ہو جائیں گی یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی۔ مگر مصنف کے دریا سے پیاس بھر
پانی بھی نہیں ٭

غزلوں پر رائے

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جاتیں تو بادشاہ کے چار دیوانوں
کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان
کے کلام کا تازگی مضمون۔ صفائی کلام۔ چستی ترکیب۔ خوبی محاورہ۔ اور عام فہمی
ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا
رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے اُن دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُنکا ڈھنگ
وہی تھا۔ اس لیے اُنھوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو طبع
کے گرمانے میں۔ اور لوگوں کے لب دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں جادو کا
اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں چست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں معانی کی بلندی
الفاظوں کی شکوہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں ٭

چند روز بعد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں اور ولیعہد کے دربار میں

اپنی غزل بادشاہ کو سنانے نہ پاتے تھے۔ اگر کسی طرح پہنچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتے۔ اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زورِ طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کی شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آ جائے۔

عموماً اندازِ کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارتے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انہیں قادر الکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت ملی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بُو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سیدھے سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائیگا اور کونسا رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزی قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انہیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور

---

[1] دیکھو ردیف ت میں۔

ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔ اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصائد خاقانی شروانی سے دوچند ہوتے جب تک اکبر شاہ زندہ تھے ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر جاتے اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سناتے۔ وہ دوسرے دن ولیعہد موصوف اس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر بھیجتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے بڑھاپے کی برکت ہے۔ کئی مخمس تھے۔ کہیں بیتیں تھیں۔ رباعیاں تھیں سب اُن کے ساتھ گئیں۔

مرثیے سلام

مرثیے سلام کہنے کا انہیں ذوق نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں ہر سال تم ایک سلام مرثیہ ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔

ہزاروں گیت۔ ٹپے۔ ٹھمریاں۔ ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔

ہجو

اُن کے اور اُن کے دیکھنے والوں کے لیے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا اور چند آدمیوں سے انہیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا۔ مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اُس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی۔ مگر خدا نے اُنکی ہجو بھی کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جوہر لطیف ہے۔ اسے بدی سے آلودہ نہ کرنا چاہیے۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع اُن کے ارادہ میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالی مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اُن کا کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

ہو یا ناتمام یا تصنیف۔ اُن کے سینہ میں جو دل تھا۔ گویا ایک آدمی کا دل تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اس واسطے کلام اُن کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے۔ دل دل کے خیال باندھتے اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے +

طرز اصلاح

شاگردوں کی غزل بڑی توجہ سے درست کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اور اُستاد اس قدر زیادہ اصلاح نہیں دیتے۔ فرمایا کہ میری غزل پر اُستاد توجہ کم کرتے تھے اکثر واپس بھی کر دیتے تھے کہ دوبارہ دیکھو۔ طبیعت پر زور دیکر کہو۔ بعض شعر کاٹ دیتے تھے۔ مجھے رنج ہوتا تھا۔ اس لیے شاگردوں کے کلام کا درد آتا ہے۔ اور کاوش سے درست کرتا ہوں +

اس میں خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُس کی حیثیت اور استعداد سے گھٹنے یا بڑھنے نہ پاتا تھا۔ اور کیفیت اس کی مشاعرہ کی غزلوں میں کھلتی تھی۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے۔ ولیعہد کی غزل بھی بناتے تھے۔ اور جب جدا جدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولیعہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام بھی اصلاح کے اپنے انداز پر تھا۔ دیوان اپنی جگہ۔ داغ اپنی جگہ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ +

اعتراض

ان کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پرانی غزل کا شعر ہے

سر بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں ی زیادہ کرنی جائز نہیں۔ مگر یہ اعتراض اُن کی کم نظری کے سبب سے تھے +

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے بنیروئے مردے بر آید ز جائے

اے زدہ بر تر از گمان دامنِ کبریائے را دستِ تو کجا رسد عقلِ شکستہ پائے را

پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے ۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا ۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے ۔ جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں ۔ وہ نہیں جانتے کہ اُن کے ہونٹھوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پاکر نکلتے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی ۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے یا اُنہوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے ۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے +

ہمیشہ فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے اور اپنے کلام کو آپ الٹ پلٹ کرتے تھے یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سنے اور لکھے نظر آتے ہیں +

اُن کا کلام دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے ۔ اُن کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے ۔ وہ زور فقط اُن کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے اور یہی قدرتی رنگ ہے جو اُن کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے +

ان کے دیوان کو جب نظرِ غور سے دیکھا جاتا ہے تو اُس سے رنگارنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں ۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا ۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے ۔ اور مضامین کے طبیب تھے جس طرح برجستہ بیٹھا دیکھتے تھے اُسی طرح باندھ دیتے تھے خیال بندی

کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی ۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل عامیانہ ۔ اب ثقہ متین اور شریفانہ ہے +

آزاد ۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے :۔

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں شمشیر کا کھیت نہیں ہے +

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے :۔

منھ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نواب کلب حسین خاں نادر تلخیص معلّے میں فرماتے ہیں (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے ۔ پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہیے ۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا +

نقل ۔ شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا ۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے ۔ ابھی نوجوانی کا عالم تھا حسب معمول اُستاد بھی گئے ۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے ۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لیے ہوئے آئے ۔ اُس میں دہی تھا ۔ کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے ۔ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا ۔ انہیں ریزش ہو رہی تھی ۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے ؟ شاہ صاحب نے کہا سنکھیا ہے ۔ کھاؤگے تو مر جاؤگے ۔ اُستاد نے ہنس دیا اور کہا کہ ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

مصرع میاں مجذوب کا ہی مگر کھانے کا موقع تھا اس لیے سب کو بہت مزا دیا +

ایک دن حسب معمول حضور میں گئے مرزا شاہرخ[1] ایک بیٹے حضور کے تھے اُنہوں نے اُن دنوں بہت سے کاروبار کی خدمتیں قبضہ میں لے رکھی تھیں اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے ۔ انہیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجیے وہ بھی آہی پہنچے ۔ معلوم ہوا کہ حضور کی ایک غزل ہے اُس کے ہر شعر میں ایک مصرع لگا کر مثلث کرنا چاہتے

[1] مرزا رفیع سودا کے بیٹے کہلاتے تھے ۔ شاید متبنّٰی تھے +

ایک پُرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی:۔

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو آئے ہے جُز میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جُزو مع واو کے ہے۔ فقط جُز صحیح نہیں۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

ہر چہ کند در جزو در کُل اثر کُلی و جُزئیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں:۔

جُز مرتبۂ کُل کو حاصل کرے ہے آخر ایک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

ایک دن میں اوج سے ملا اور اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا:۔

یہاں جو برگ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے دھول دستار فلک پر لگے تڑ کا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو اُستاد نے باندھا ہے۔ یہ جائز نہیں۔ مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لاکر! میری طرف دیکھکر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی +

دوسرے دن میں اُستاد مرحوم کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اُس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی نہ ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ۔ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لُطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرزِ بیاں میں ایک وسعت

بدیہہ

فرماتے تھے کہ جوانی کا آغاز اور میری بدیہہ گوئی پر نظریں پڑتی تھیں کہ ایک دن میر محمد خاں اعظم الدولہ کے بالاخانہ کے نیچے سے میرا گذر ہوا۔ وہ پُرانے شاعر تھے اور سرور تخلص کرتے تھے۔ مجھے دیکھکر آواز دی۔ میں گیا۔ بیٹھتے ہی فرمایش کی کہ تذکرہ ہم نے تمام کردیا۔ اب اس کی تاریخ کہدو۔ میں نے کہا۔ اچھا فکر کرونگا۔ اُنہوں نے کہا۔ فکر کرونگا کی سہی ہیں۔ ابھی فکر کرو۔ اور کہدو۔ فرماتے تھے۔ خدا کی قدرت ان کے خطاب کے خیال سے اُسی وقت ذہن میں آیا دریاے اعظم حساب کیا تو عدد برابر۔ عجب خوشی دل کو ہوئی۔ میں نے جھٹ کہدیا۔ ہنسے اور کہا پہلے سے کہہ رکھی ہوگی۔ پھر کہا۔ مصرع ابھی لگادو۔ میں نے کہا کہ مصرع پھر انشاءاللہ۔ جو بات تھی وہ ہوگئی ۔

زہے طبع حاضر

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے وہ شاید تی اور مرشد زادے کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لیکر آئے تھے۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے عرض کی صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لیجانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ "اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھکر فرمایا کہ اُستاد دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ آخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین ہی مہینے بعد انتقال ہوگیا ۔

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہوکر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بلالیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال

تر . نگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے ۔ بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے ۔ غرض بادشاہ نے وہ غزل انہیں دی کہ اُستاد اس پر مصرع لگا دو ۔ انہوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی ۔ اور فوراً مصرع لگا دیا ۔ اسی طرح دوسرے میں ۔ تیسرے میں سلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اُسی وقت پڑھکر سنائی ۔ سب حیران ہو گئے ۔ بلکہ مرزا شاہ رُخ نے کہا کہ اُستاد آپ گھر سے کہکر لائے تھے ۔ بادشاہ بولے بھلا انہیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے ؎

نقل ۔ برسات کا موسم تھا ۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب میں تھے مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ آخر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) شب مہتاب میں تلاؤ کے کنارے پر چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے ۔ اُستاد مرحوم پاس کھڑے تھے اُنہیں بھی شعر کا شوق تھا اور شاگرد تھے ۔ اُن کی زبان سے یہ مصرع نکلا ع

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ان سے کہا کہ اُستاد اس پر مصرع لگائیے گا ۔ انہوں نے فوراً کہا ۔ ع

عکس رُخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

نواب حامد علیخاں کے خسر نواب فضل علیخاں سے اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا ۔ اس لیے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے ۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سنتے سناتے تھے ۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا :-

جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُستاد مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کوا چھڑواتے ہیں اس لیے زیادہ تر مناسب ہے :-

زاغ بھی جب ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔
جب اُس نے کٹورا لا کر دیا تو یہ مطلع کہا۔ کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری　　خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

تاریخ

تاریخ کی کمائی بھی سب بادشاہ کے حصے میں آئی۔ کیونکہ اکثر اُنہی کی فرمائش سے کہتے تھے اُنہی کا تخلص ہوتا تھا۔ نواب زینت محل بیگم۔ بادشاہ بیگم تھیں اور کُل احکام سلطنت کی حاکم تھیں۔ اُنہوں نے شہر میں ایک مکان بنوایا۔ تاریخ کے لیے بادشاہ سے عرض کی۔ اُنہوں نے دربارِ خلوت میں اُستاد سے فرمایا۔ بیگم بولیں کہ حضور اُستاد سے کہیے کہ آج تاریخ لکھ جائیں۔ اُستاد نے دم میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل　　تاریخ گفتم برمحل۔ ایں خانۂ زینت محل

ایسی ایسی تاریخیں سینکڑوں کہہ دیتے تھے۔ یاد کہاں! اور لکھے کون؟

والد مرحوم نے بہ نیت رقت امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لیے کہا۔ اُسی وقت تامل کر کے کہا۔ "تعزیت گاہ امام دارین" پوری تاریخ ہے۔

برجستہ

حکیم میر فیض علی مرحوم طب میں ان کے اُستاد تھے اور اُنہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آ کر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعۃً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو یہی تاریخ ہے۔ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ یہ تاریخیں سینکڑوں کہہ دیں۔ کہاں تک لکھوں! اور یاد کہاں؟

ایک شخص نے کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آئیے گا۔ انشاء اللہ ہو جائیگا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہونگے

پوچھا۔ کہ وہ ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لیے کہا تھا اُس کے دو ایک شعر آج ہمیں
یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا مگر ساتھ ہی
خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر
بیٹھے گا اُس کے لیے کہ دو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں خیمہ پیچھے گرتا
ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے
اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں
تھے ؟ فردوس منزل کے امراء ان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل
کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے
عرش آرامگاہ کے امراء آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں ! بس یہی خیال فرما لیجیے۔
جو جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔
اور اپنا سامان مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی
آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں
مانگتے ہیں خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال
بھی نہیں۔ میاں ! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے ✤

حسب حال

شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے اواخر عمر میں روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر
اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا
تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں
خدا کے گنہگار ہیں وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اُس کی تو شرم نہیں ہو سکتی
بھلا بندے کی تو شرم رہے ✤

پھر ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے
شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پہ تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلیے
چونکہ وہ اُس وقت کچھ لکھوا رہے تھے بمصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا

یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائیگی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو۔ اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جالی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ لو یار بڑی قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا منھ پھاڑ کر گرا۔ اور ساتھ ہی منھ سے مغز تک گویا بارود اُڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا اور جل کر کہا واہ یہی دلّی! انہوں نے کہا۔ اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں +

لطیفہ۔ مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حقدار ہوئے تھے وہ بھی اُستاد سے اصلاح لیتے تھے۔ شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر کی باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴ - ۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک دن اُستاد کو بلا بھیجا۔ یہ گئے۔ اُنہوں نے غزل عنایت کی اور کہا کہ اُستاد اسے یہیں اصلاح دیدیجئے۔ اُستاد غزل بنانے لگے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچہ میں سے نکالی۔ اُسے دیکھا اور کہا کہ اُستاد ذرا اسے دیکھیے۔ اُستاد سمجھ گئے کہ اُسی کی تصویر ہے۔ دیکھ کر کہا۔ بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا دیکھیے تو سہی۔ اگر واقعی ایسا معشوق ہو تو کیسا ہو۔ اُستاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے چاہتا ہے کہ میں بھی بُڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی نہ رہا تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا۔ بھلا اُستاد اس حُسن میں کچھ نقص تو بتائیے اُستاد نے دیکھا اور کہا "ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں"۔ اُستاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا۔ لڑکا ہے۔ اور ایک بیسوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔ میں نے اُستاد سے پوچھا

جو نوکر ہے کہا کہ محمد بخش بلانا انہیں۔ لینا لینا۔ خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہو گئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:۔ ع

پڑھ غلام محمد پہ غلام علی

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سن کر مصرع طرح بھیجا اور بلایا ہے۔ آپ نے غزل لکھکر بھیجی اور مقطع میں لکھا ؎

آجکل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن　　کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

انہوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا:۔

نقل۔ کوئی مسافر دلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرہ پہنچکر دلّی یاد آئی اور رہ گیا۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا گردنیں فربہ بدن تیار چکنی چکنی پشم۔ ایک کتا انہیں دیکھکر خوش ہوا۔ اور دلّی کا سمجھکر بہت خاطر کی حلوائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دکان سے ایک بالوشاہی اڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دکان سے ایک کلہ جھپٹا۔ یہ نعمتیں کھاتے اور دلّی کی باتیں سناتے رہے۔ تیسرے دن رخصت مانگی۔ اُس نے روکا۔ انہوں نے دلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کیے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا اور ایک دن دلی کا رخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کتّے مردار خوار۔ خونی آنکھیں۔ کالے کالے منھ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا دیر تک کنارہ پر پھرے۔ آخر کود پڑے۔ مرکھپ کر پار پہنچے۔ شام ہو گئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے۔ بظاہر خوش ہوئے اور کہا اہو اس وقت تم کہاں؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا۔ ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اُسے لے کر ادھر اُدھر پھرنے لگے

پائخانے سے نکلے فرمایا کہ لوجی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا حضرت کیونکر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائی مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا۔ فرمایا۔ ع

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر۔ ۳ ۴ مصرعے اُلٹ پلٹ کیے تھے ایک اس وقت خیال میں ہے۔

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ کے پاس ہی مکان تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامینِ کتابی۔ خیالات علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں غوں غاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔ ع

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا ہاں درست ہے ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام میں گزر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں +

اس مطلع پر حضور نے کئی دفعہ جال مارے مگر یہ ٹال گئے مضمون آنہ سکا مطلع انہوں نے نہ دیا

کیا کہوں اُس ابروئے پیوستہ کے دل بسمل ہے ایک طعمہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان

حضرت! پھر مرزا نے کیا کہا۔ فرمایا۔ پہلو میں رکھ لی۔ میں نے کہا۔ بارے اُس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ فرمایا۔ کہتے کیا؟ پی گئے +

لطیفہ ۔ دلّی میں ایک شریف خاندانی ۔ خوش اخلاق خوش مزاج تھے۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ نوکر کے پاس خاصدان میں ہر وقت چند گلوریاں رکھتے تھے۔ جہاں جاتے یا راہ میں کوئی دوست ملتا۔ مزاج پُرسی کے بعد اُسے ایک گلوری بھی دیتے تھے۔ اور اسی واسطے **میر گلوری** مشہور تھے انہوں نے بیٹے کی ختنہ کی۔ اور بعد غسلِ صحت کے تمام احباب کو بلا کر کھانا کھلایا۔ جلسہ ضیافت میاں عنایت افزوں خواجہ سرا کے مکان میں تھا۔ اُستاد مرحوم بھی گئے۔ کھانا کھا کر دوسرے مکان میں آبیٹھے۔ چند بزرگ اور بھی موجود تھے کہ اتنے میں میر گلوری صاحب آئے۔ سپینی میں ایک شخص گلوریاں لیے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں دیں +

حکیم آغا جان عیش اُستاد سے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب سے گلوری لے کر کہا۔ آج تو دست مبارک سے گلوریاں کھلانی واجب تھیں۔ اُستاد نے کہا۔ ہاں ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب ہنسے اور کہا۔ حضرت! میر صاحب کی ظرافت کے نکتے کوئی کہاں تک پائے۔ ختنہ کی ضیافت کی۔ خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ اُستاد نے کہا ظرافت پر ظرافت یہ کہ کھلایا بھی خصّی پلاؤ[لے] +

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹی کے دن اُس وقت جایا کرتا تھا۔ اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے۔ ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے

لے خصّی پلاؤ۔ اُس پلاؤ کو کہتے ہیں کہ گوشت کی جگہ اس میں چنے کی دال دم دیتے ہیں۔ گویا گوشت کا پلاؤ مردہ ہے +

کنجڑے کی ہی ہاٹ ہی دُنیا جنس ہے ساری کھٹی ۔ میٹھی چاہے میٹھی لے لے کھٹی چاہے کھٹی

لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

روپ رنگ کے پھول دلمیں دیکھ عقل کے بیری ۔ اوپر میٹھی نیچے کھٹی ۔ انبوا کی سی کیری

لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

ایک فقیر صدا کہتا پھرتا تھا ۔ کچھ راہِ خدا دیجا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا ۔ حضور کو پسند آئی ان سے کہا ۔ انہوں نے بارہ دوہرے اُس پر لگا دیے ۔ مدتوں تک گھر گھر سے یہی گانے کی آواز آتی تھی ۔ اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے (حافظ ویران کو خدا سلامت رکھے انہی نے یہ شعر بھی لکھوائے) :-

کچھ راہِ خدا دیجا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

محتاجِ خراباتی ۔ یا پاک نمازی ہے ۔ کچھ کر نہ نظر اس پر ۔ واں نکتہ نوازی ہے

کچھ راہِ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

دُنیا ہے سَرا اُس میں تو بیٹھا مسافر ہے ۔ اور جاتا ہے یاں سے ۔ جانا تجھے آخر ہے

کچھ راہ خدا دیجا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

جو رب نے دیا تجھکو ۔ تو نام پہ رب کے دے ۔ گر یاں نہ دیا تو نے ۔ واں دیویگا کیا بندے

کچھ راہِ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

دنیا کے کیا کرتا ہے سینکڑوں تو دھندے ۔ پر کام خدا را بھی تو کرلے کوئی بندے

کچھ راہ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

دیگا تو اُسی کو تو ۔ وہ جس کو ہے دلواتا ۔ پر ہے یہ ظفر تجھ کو ۔ آواز سُنا جاتا

کچھ راہ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں ۔ ٹپے ٹھمریاں ۔ پہیلیاں ۔ سیٹھنیاں ۔ کیا کیا لکھوں ؛

ایک دن ٹہل رہے تھے ۔ حافظ ویران ساتھ تھے ۔ بہ تقاضائے استنجا

سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے اُن کا نظام دسرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار ہو جائے۔ مسوّدۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک۔ آدھا مصرع۔ فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حُسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایجادی فرمائشوں کی حد نہ تھی۔ چند شعر اس غزل کے لکھتا ہوں جس کے ہر شعر کے نیچے مصرع لگایا ہے:۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا	یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا	
نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھ کو	عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا	
اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا	کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا	
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر	ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا	

ایک بُڈھا چورن مرچن کی پُڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا۔

ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

حضور نے سُنا۔ ایک دو مصرعے اس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دیے۔ انہوں نے دس دوہرے لگا دیے۔ حضور میں کنچنیاں ملازم تھیں۔ اُنہوں نے یاد کر لیے۔ دوسرے دن بچہ بچہ کی زبان پر یہی گیت تھا۔ دو بند یاد رہ گئے:۔

ہے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش
سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا +

ایک شب والدِ مرحوم کے پاس آ کر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے۔ لاؤ
یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں۔ ان میں سے یہ طرح کہنی شروع کی محبت کیا ہے۔
صورت کیا ہے۔ مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت
کر کے فرمایا۔ کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ دو مطلعے پڑھے :-

سودا

نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے — نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منھ دیکھے کی الفت ہے

میر

بگولے سے جسے آسیب صرصر سے زحمت ہے — ہماری خاک یوں برباد ہوا ے ابر رحمت ہے

اتفاق۔ فرماتے تھے کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے
ابھی درست کر کے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔
میں دیوانِ خاص میں جا کر اسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی
دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پُشت پر ایک صاحب انگلے
فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا "غزل
ہے"۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعا گوئی کیا کرتا ہوں۔
فرمایا۔ کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں
نے کہا فارسی، عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا
کوئی خاص موقع ہو تو اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ
یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے غیر کی زبان میں
نہیں کر سکتا۔ پوچھا۔ آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا۔ کیوں
نہیں پڑھا؟ میں نے کہا کہ ہمارا لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں

بیٹھ گئے۔ اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ اُنھوں نے قریب جا کر خیال کیا۔ تو کچھ گنگنا رہے ہیں۔ اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اُس کا خیال آ گیا۔ پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا۔ اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں۔

حافظ ویران کہتے ہیں۔ ایک دن عجب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کے اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی ‍ ‍ ‍ ‍ تلوار آج ماہِ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوئے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا۔ تو کھاری باولی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی۔ اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویران سُن رہے تھے۔ ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا واں موجود تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہل ذوق کے لطفِ طبع کے لیے لکھ دیا۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی ‍ ‍ ‍ ‍ سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں۔

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھُلی تو فرمایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الالف

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروف قلم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نامِ محمد لب پہ یارب اوّل و آخر
اُلٹ جائے بوقتِ نزع جب سینے میں دم میرا

محبت اہلبیتِ مصطفےٰ کی نور برحق ہے
کہ روشن ہوگیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا

دکھائی مجھکو راہ شرعِ اصحابِ پیمبر نے
چراغِ راہ ہے اکرامِ اصحابِ کرم میرا

کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا
کہ ہے دُرِ نجف ہو کر چمکتا دُرِّ یم میرا

رہیگا دانہ افشاں مزرعِ اُمید بخشش میں
غمِ آلِ نبیؐ سے دانۂ ہر اشک نم میرا

[illegible]

شہِ بغداد کا خطِ غلامی ذوق رکھتا ہوں
نہ کیوں دل اس خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

ہوا یہ سینہ یکسر خارزارِ دشتِ غم میرا
کہ آیا پا بجوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

صراطِ عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دمِ شمشیرِ قاتل پہ بھی خوں جاتا ہے جم میرا

مری خواری کے رتبہ کا کمالِ اوج تو دیکھو
کہ ہے چرخِ زحل بھی سایۂ بختِ دژم میرا

وہ ہوں میں آتشیں گل تازہ نخلِ شمعِ اُلفت کا
نہیں ہے کوئی گلچیں غیر مقراض ستم میرا

نشانِ بے نشانی گر دکھائے زور مٹ جائے
جھپک سے دیدۂ صراف کی نقشِ درم میرا

رواں ریگِ رواں ہے جائے آبِ اشکِ مژگاں سے
کدورت بار ہے دیکھو سحابِ رنج و غم میرا

وہ ہوں میں آہوئے وحشی رمیدہ دامِ ہستی سے
کہ ہے اک کوچۂ رم جادۂ دشتِ عدم میرا

جھپکتی آنکھ شب جوں حلقۂ زنجیر کیا میری
[illegible] خواب [illegible] تھا [illegible] الف الم میرا

کہوں میں [illegible] دہن سے حرفِ قطعِ آرزو نے [illegible]
لبِ [illegible] ہے جوں لبِ شمشیر دم میرا

مری افسردہ حالی گر چمن آرائے دل سردی
عجب کیا شیر برفیں ہو اگر شیرِ علم میرا

پھپھولا کام آئی میں نے وہاں اب تک جہاں ٹپکا
[illegible] جام سے یک قطرۂ زہرابِ غم میرا

ہے - صاحب نے کہا - وَل یہ کیا بات ہے - دیکھئے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں -
میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی - بہت مشکل معاملہ ہے - اُنھوں نے پھر
کہا کہ وَل ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا - آپ ہمارا ایک زبان
نہیں سیکھ سکتے - یہ کیا بات ہے ؟ اور تقریر کو طول دیا - میں نے کہا - صاحب ہم
زبان کا سیکھنا اسے کہتے ہیں کہ اُس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس
طرح کریں جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں - آپ فرماتے ہیں - ام آپ کا
تین زبان سیکھ لیا - بھلا یہ کیا زبان ہے - اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا
نہیں کہتے اسے زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں +

اللّٰھُمَّ تَمِّمْ بِالْخَیْر

باندھوں میں مضموں جو اپنی شورِ بختی کا کوئی / ہو زمینِ شعر میں عالم زمینِ شور کا

میں وہ ہوں نخچیر جس کو دیکھتا ہے وقتِ ذبح / دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہرِ ساطور کا

اس نزاکت پر نظر کرنا کہ وہ رشکِ پری / بال بھی باندھے جو مستی پر تو زلفِ حور کا

دل کا یہ احوال ہے غم سے ترے اے مستِ ناز / جیسے مرجھایا ہوا دانا کوئی انگور کا

تفتہ دل وہ ہوں کہ آکر داغِ سوزاں پر مرے / اُڑ گیا مرہم کے پھاہے سے اثر کافور کا

گر ترے فریادیوں کے نامہ پیچیدہ کو / لب پہ رکھ کر پھونکئے پیدا ہو نالہ صور کا

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجب غماز ہے / قصہ پہنچایا نہ یاں دار پر منصور کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سے تیز ذہن / تین دن چاٹے اگر تعویذ میری گور کا

زخم میرا ہے وہ ایذا دوست خوں تھوکنے لگے / منہ سے گر جراح کے سن پائے نام انگور کا

جھانکتے تھے وہ ہمیں روزنِ دیوار سے / وائے قسمت ہو اُسی روزن میں گھر زنبور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری / بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

تو ہو بعد از مرگ بھی گر اے محبت دستگیر / استخواں سے ہو مری دستہ ترے ساطور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا / لکھ دیا تھا کوہکن بھی نام اک مزدور کا

بل ہے وحشت اب تلک بھی شاخِ آہو کی طرح / پیچ کھاتا ہے دھواں میری چراغِ گور کا

دیکھنا زہر آب پیکانِ محبت کا اثر / چشمِ افعی بن گیا روزن ہر اک ناسور کا

کھینچے مانی اُس پری کی کیونکہ تصویر کفک / جمع ہو جب تک نہ رنگ سُرخ رونے حور کا

تیرے قامت سے جو ہو برپا قیامت سرو پہ / کام لے منقار سے فریاد قمری صور کا

ذوق راہِ عشق وہ کوچہ ہے جس کی خاک میں / ہے دُرِ تاجِ سلیمان بیضہ بیضہ مور کا

لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا / پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویر نہالی / کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ / پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

ہوا روشن چراغِ کعبہ زاہد جس کے شعلے سے
اُسی آتش کا رکھتا ہے شررِ سنگِ صنم میرا

نہ ہوئے وقرِ ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا

وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ اعظمِ وحشت
کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

مری صورت سے معنی ہیں نفخت فیہ من روحی
حدوثِ بے ثبات اثبات کرتا ہے قدم میرا

وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے
برنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

تخیل نے مرے باندھا طلسمِ تازہ کیفیت
نہ کیوں ہو کاسۂ سر ذوق رشکِ جامِ جم میرا

لکھنؤ سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح میں آئی۔ شہر میں چرچا ہوا کہ ان شعروں پر شعر نہیں ہو سکتے۔ شاہ نصیر مرحوم اُستادِ وقت تھے۔ اُن کی صحبت میں بھی یہ باتیں پہنچیں۔ اُستاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چکی تھی۔ مگر آدابِ شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ اُن کی خدمت میں گئے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ میاں ابراہیم تم نے بھی وہ غزل دیکھی؟ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ عرض کی حضرت سنتا ہوں ایسی تو نہیں جیسی لوگ کہتے ہیں۔ فرمایا پھر تم نہیں کہتے؟ کہا۔ جو ارشاد ہو۔ اُنہوں نے فرمایا کہ ہم بھی کہیں گے۔ تم کیوں نہیں کہتے۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ جبھی اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ وہ غزلیں پھر لکھنؤ گئیں وہاں بھی تعریفیں ہوئیں +

شوقِ نظارہ ہے جب سے اُس رخِ پُر نور کا
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پُر شور کا
ہوں صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا

لطف جاتا ہے سرِ ہر نالۂ پُر شور کا
خونِ دل پینا ہے یہ کھانا مجھے سیندور کا

نزع میں بھی دھیان تھا اُس نرگسِ مخمور کا
جھلکۂ شربت میں مزا آیا مے انگور کا

وادیِ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا
مہر اک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ دور کا

تیرے کوچہ میں تنِ لاغر ترے رنجور کا
اک غبارِ ناتواں ہے کاروانِ مور کا

تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہمپایا نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

کیا تھا یا نہ تھا سب ہم پہ گزرا — فلک تو نے کیا اپنا نہ پایا

سُراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے — کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملکِ فنا کی — کہ اس بازار میں سودا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی خوش فہم کو سیدھا نہ پایا

تہ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے — ذرا تاب و تڑپنے کا نہ پایا

ترے مجنوں کی تربت پہ جنوں نے — بگولے کے سوا سایا نہ پایا

فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو — نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

چراغِ داغ لیکر دل میں ڈھونڈا — اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

یہی ہر دم ہے زخمِ دل کو رونا — دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

سوا تیرے خطِ مشکیں کے کوئی — مجرّب نسخۂ سودا نہ پایا

وہ بولے دیکھکر تصویرِ یوسف — سُنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا

کیا ہم نے سلام اے عشق تجھکو — کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل — ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اُس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پر وہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

واہ - کیا مرہمِ زخمِ دلِ بیتاب بنا
آب سے نشترِ سرتیز کے تیزاب بنا

نہ بجھے اشک کے دریا سے مری سوزشِ دل
گرچہ دے شعلۂ جوالہ کو گرداب بنا

دلِ بیتاب کو ہم سینہ میں ٹھہرا نہ سکے
شعلہ خور دیکھتے ہی تجھ کو وہ سیماب بنا

پوچھیں گر مجھ سے کہ عشق ہوئی کب سے تلخ
کہوں جس دن سے فلک کاسۂ زہراب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب
کہ مری خاک سے بھی جامِ مےِ ناب بنا

تیرہ روزی نے مری مہرِ جہانتاب کا نور
جب اُڑایا تو وہیں کرمکِ شب تاب بنا

اسے چھپاتا ہوں کیوں اُس سے کیا میں نے گناہ
کہ جواب پھرتا ہوں اس طرح سے بیتاب بنا

سرمۂ چشمِ عزیزاں نہ بنا میں لے پیچ
کیا بنا خاک غبارِ دلِ احباب بنا

آیتِ سجدہ سے ہے نقش میں مرے ہر جوہرِ تیغ
ہے خمِ تیغ فقط کیا خمِ محراب بنا

خالِ عارض ہے جو ہندوئے خدا ترس تو کیا
ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے میرے حبیب
میں ہوں اک شمع پئے محفلِ احباب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

آہ کے ساتھ جو نکلا شررِ آتشِ دل
چرخ پر جا کے وہ خورشیدِ جہانتاب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق

خواہر عالمگیر کی قبر بھی تھی۔ اس میں ایک بالاخانہ مرمت کر کے درست کروا دیا۔ شاہ صاحب وہیں جا رہے۔ شام کو اُستاد اور والد مرحوم وہاں جاتے تھے۔ شیخ ناسخ کا پہلا دیوان اُنہی دنوں ہمارے ہاں آیا تھا۔ اُس کی غزلوں میں سے کوئی مصرع لیتے تھے اُسی پر اُستاد غزل کہتے تھے۔ والد مرحوم لکھتے تھے۔ شاہ صاحب سنتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ عجب گلزار صحبت تھی +

یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کوئیں کی تہ میں تارا[1] ہو گیا

میرے نالوں سے جو پانی سنگِ خارا ہو گیا
کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

ذکرِ دنیا النفس مُردہ کو ہوا آبِ حیات
مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارا ہو گیا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ کے
میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارا ہو گیا

ہر حبابِ بحر کی کھُل جائیگی تارا سی آنکھ
عکس افگن گر رُخِ روشن تمہارا ہو گیا

رشک سے اُس زلف کے کیا مشک ہی کے سر ہے خوں
بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہو گیا

شیخ نے افطاریوں کے تر نوالے کھائے خوب
ہے مگر روزوں کی گرمی سے چھوارا ہو گیا

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امیدِ وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ
ہو گیا جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا

دل پہ زخموں کی ترقی سے عجب آئی بہار
آ گئے تھا صد برگ یہ گل اب ہزارا ہو گیا

ظلمتِ عصیاں سے میرے بن گیا شب روزِ حشر
آفتاب اک نیزہ پر دمدار تارا ہو گیا

چشمِ مستِ یار میں آخر ہوئی سُرخی عیاں
لو ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہو گیا

ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

[1] کوئیں کی تہ کا تارا۔ یا کوئیں کا تارا۔ زبانِ اُردو کا محاورہ ہے۔ کبھی نہایت گہرے اور پُرانے کوئیں میں دیکھتے ہیں۔ اندھیرے کے سبب کچھ نظر نہیں آتا غور کے بعد پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والا کہتا ہے۔ وہ پانی تارا چمکتا ہے کبھی کہتے ہیں بڑا عمیق کنواں ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ پانی دور کہیں تہ میں تارا چمکتا ہے +

فلک نے بھی تمہارا صلا نہ پایا	مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے

نظیر اُس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

۱۲۴۵ھ میں ایک بزرگ کہن سال حافظ علی شاہ نام اورنگ آباد ملک دکن سے وارد دہلی ہوئے۔ اور قلعہ میں آبدار خانہ شاہی کے داروغہ کے پاس اُترے۔ وہاں اُستاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ صاحب دل صاحب معرفت شخص تھے۔ طرز معاشرت سے معلوم ہوا کہ خاندانی رئیس تھے۔ امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ زبان سے نہ کہتے تھے مگر ٹیپو سلطان اور خوانین مدراس کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ شامل تھے۔ باوجود اس کے علوم رسمی سے آگاہ تھے۔ شعر وسخن کا مذاق بہت خوب تھا۔ اُستاد سے تھوڑے عرصہ میں بہت رابطہ بڑھ گیا اُستاد نے والد مرحوم کو بھی ملایا۔ شاہ موصوف اُستاد کی غزلیں اپنی بیاض میں لکھواتے تھے۔ اور فرمائشیں کر کے کہواتے تھے طبیعت کی آزادی اور بے نیازی اُن کی خداداد سلطنت معلوم ہوتی تھی۔ کئی مہینے کے بعد دفعۃً غائب ہوگئے۔ بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا رہ گیا اُس وقت اکبر شاہ بادشاہ تھے ٭

۱۲۶۰ھ میں دفعۃً پھر آئے۔ کہا ہمیں نثار علی شاہ خطاب ہوا ہے۔ یہ زمانہ تھا کہ دلی کے ٹوٹے پھوٹے تخت پر بہادر شاہ بیٹھے تھے اُستاد کی شاعری اوج پر اور اختیارات موج پر تھے خلیفہ اسمعیل کو سرکار شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں۔ انہی میں تیول شاہی (املاک وباغات) بھی سپرد تھے۔ شاہ صاحب ہمارے ہاں اُترے۔ مگر فرمایا کہ فقیر کو شہر میں رہنا مناسب نہیں کوئی جگہ باہر ہونی چاہیے کہ اوقات میں خلل نہ ہو ٭

شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی اُستاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس[۱] ہزاری باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں۔ زیب النسا بیگم

۱؎ اب تیس ہزاری باغ صاف ہوگیا۔ وہاں ریل چلتی ہے۔ زیب النسا کی قبر کا نام ونشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہے قادخلی جنتی۔ عالمگیر کی کہی ہوئی تاریخ تعویذ پر کندہ تھی ٭

چند شعر اِس غزل کے عالمِ شباب میں کہے تھے۔ وہی زبان زدِ خلایق تھے۔ پھر سنہ ۱۲۶۰ھ میں تیس ہزاری باغ میں غزل پوری کی تھی۔

اِس تپش کا ہے مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بقدم دل ہوتا

آسماں دردِ محبت کے جو قابل ہوتا
تو کسی سوختہ کا آبلۂ دل ہوتا

چھوڑتا ہاتھ سے ہرگز نہ کبھی بسمل شوق
دامنِ برق اگر دامنِ قاتل ہوتا

چینِ پیشانی اگر تیری نہ ہوتی زنجیر
نالہ دیوانہ تھا جو پابہ سلاسل ہوتا

کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج
اتنا دق ہوتا کہ جینا اسے مشکل ہوتا

ذبح ہونے کا مزہ جانتا گر صیدِ حرم
آپ گردن پہ چھری پھیر کے بسمل ہوتا

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تِل ہوتا

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف
جذبۂ شوق زلیخا جو نہ کامل ہوتا

موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انساں
ہے وہ خودبیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

سینۂ چرخ میں ہر اخترِ اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہوئی گر عقدہ کشائی نہ یداللہ کے ساتھ
ذوقِ حل کیونکہ مرا عقدۂ مشکل ہوتا

جو رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا

کسی رنج کش کو دیتا تو کچھ اس کو سود ہوتا
دلِ سخت کاش کافر حجر الیہود ہوتا

تری بزم میں تو جلتا کہ تجھے بھی بو پہنچتی
جو یونہیں تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

جو نہ ہوا امیدِ واشد نہ ہو دل گرفتہ غنچہ
کہ بتول تنگ رہنا نہیں بے کشود ہوتا

لبِ نازک اُس کا کیونکر کبھو بارِ حرف اٹھائے
کہ جو صدمۂ تبسم سے بھی ہو کبود ہوتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِّ راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

میں ہجر سے مرنے کے قریب ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آ پہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اب جان پہ آفت ہے جو آئے ہو دوبارہ
اک بار تو غارت دل و دیں ہو ہی چکا تھا

سینہ جو کیا چاک تو واں کچھ بھی نہ پایا
کیا جل کے جگر خاک کہیں ہو ہی چکا تھا

برہم اُسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف
اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

ہوتا جو نہ پیوند زمیں تیری گلی میں
آسودہ یہ دل زیر زمیں ہو ہی چکا تھا

آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ
جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

جو خط میں لکھا اُس نے وہ لکھنے سے بھی پہلے
مکتوب سر لوحِ جبیں ہو ہی چکا تھا

بے بدرقۂ مرگ توقف رہا ورنہ
تجھ بن سفرِ جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

کیا ہوتا جو سمجھاتے اسے جا کے مرے دوست
دشمن کا سخن ذہن نشیں ہو ہی چکا تھا

کیا دیکھتے ہم یوسف کنعاں کو کہ اپنا
منظور نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا

کیا گرم تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے
میں سرد تہِ خنجر کہیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکمِ ازلی ذوق یونہیں ہو ہی چکا تھا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی سنہ ۱۲۶۰ ہجری:-

محفل میں شور قلقلِ مینا سے غل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے
تیغ خمیدہ یار کی لوہے کا پُل ہوا

پروانہ بھی تھا گرم تپش پہ کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

آئی تھی اندروں کی نہ ہرگز سمجھ میں بات
آوازہ گو بلند مثالِ دہل ہوا

جن کی نظر چڑھا ترا رخسارِ آتشیں
اُن کا چراغِ گور نہ تا حشر گُل ہوا

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کُل ہوا

اُس بن رہا چمن میں بھی میں ذوق دلخراش
ناخن سے تیز تر مجھے ہر برگِ گُل ہوا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینہ میں غم سے
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یاں تک
کافر تجھے کچھ خوف خدا کا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمرِ جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

ساتھ اُن کے ہوں میں سایہ کی مانند ولیکن
اس پر بھی جدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اسکے
آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

دل مانگتا مفت اور یہ پھر اُس پہ تقاضا
کچھ قرض تو بندہ پہ تمہارا نہیں آتا

بیجا ہے ولا اُس کے نہ آنے کی شکایت
کیا کیجئے گا فرمایئے اچھا نہیں آتا

جاتی رہی زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

جو کوچۂ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا
کیا جانے مزہ کیا ہے کہ جیتا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ تابی سے کوئی جا سکے
جب تک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا
تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

شب ہم نے بہتیرا جو کیا توبہ کا ساقی
مغرب سے سحر مہرِ درخشاں نکل آیا

تنگ آکے جو دم تن سے نکل جائے تو جانو
زنداں سے کوئی قیدیِ زنداں نکل آیا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

نہ خاک ہوتا ظاہر جو سلگتا اپنے دل کا
تو شرار سنگ تربت میں بھی اپنے دُود ہوتا

جو ہے سرگذشتہ اس کو نہیں دینا سر کا مشکل
کہ وہ سر بکف نہ ہوتا جو نہ دست جود ہوتا

جو رقیب سر بکف ہیں کبھی ہوتے سر بکف بھی
ترے جان نثار کا گر انہیں دستِ جود ہوتا

ترے در کی جبہ سائی اگر اشک اپنے کرتے
سر قطرہ قطرہ پر اک اثرِ سجود ہوتا

کوئی زہر نوش مجھ سا نہیں پہنچا ذوق ورنہ
شجر زقوم دوزخ میں بھی خشک دود ہوتا

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا منہ اُسے میدان اجل میں مارا

اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

اجل آئی نہ شب ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

عشق کے ہاتھ سے نہ قیس بچا نے فرہاد
اس کو گر دشت میں تو اس کو جبل میں مارا

دل کو اس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

کھینچ کر عشق جفا پیشہ نے شمشیر جفا
پہلے اک ہاتھ مجھی پر تھا ازل میں مارا

چرخ بد بیں کی کبھی آنکھ نہ پھوٹی سو بار
تیر نالے نے مرے چشم زحل میں مارا

ہم نے جانا تھا کبھی عشق نے مارا اس کو
تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا

اس لب و چشم پہ ہے زندگی و موت اپنی
کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا

کون سنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد
کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں مارا

عُرس کی شب بھی مری گور پہ دو پھول لائے
پتھر اک گنبدِ تربت کے کنول میں مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں — کانٹا سمجھئے سیہ کا یا گل کنیر کا

مجنوں کی روح دشت میں مانند گردباد — کرتی طواف تھی ترے مجنوں کے ڈھیر کا

ہیں اس صنم کے ملنے کے رستے تو سینکڑوں — پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا

دم آچکا لبوں پہ سب آنکھوں میں انتظار — بے دید جلد آ کہ نہیں وقت دیر کا

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک — گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب بھنگیر کا

کوٹھے پہ ان کے خوب بنے آج رات کو — تھا ہاتھ آگیا جو سہارا منڈیر کا

ہوتے زبان حال سے مضموں ہیں واہ وا — جس میں نہ اختلاف زبر کا نہ زیر کا

زیبا ہے ذوق خرقۂ درویش مرد کو
برقع کبھی نہ پائے گا نامرد شیر کا

یہ غزل بھی وہیں لکھی تھی:-

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا — سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہو کے دل کے ساتھ — سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں — کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

ہے موج بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ — بیچارہ مشتِ خاک تھا انسان بہ گیا

دریائے اشک سے دمِ تحریر حالِ دل — کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے — نالہ سا ایک سوئے بیابان بہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اس لب کے سامنے — سب مول تیرا لعلِ بدخشان بہ گیا

کشتی سوار عمر ہیں بحرِ فنا میں ہم — جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان[1] بہ گیا

[1] ہندوستان کا محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا۔ یا کسی کام کا وقت گزر جاتا تو کہتے تھے۔ اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب نہ ہوگا۔ جڑ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا اور پانی سندھ میں جا پڑتا ہے پھر اسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی امر فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا۔ تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گذر گیا۔ اب نہ ہو سکیگا۔

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہرِ مقصود
دریا سے تہی پنجۂ مرجاں نکل آیا

رات آہ میں یوں سینہ سے اک شعلہ سا چمکا
میں نے تو یہ جانا۔ دلِ سوزاں نکل آیا

ناقوس! یہ کس دل سے کیا نالۂ جانسوز
یاں دل کا دھواں آہ سے پیچاں نکل آیا

عصمت بھی ہے کیا شے کہ اگر یوسفِ کنعاں
در ہائے مقفل سے عزیزاں نکل آیا

ہے کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ
جب کھودا کنواں گنجِ شہیداں نکل آیا

دل رکھ کے کہیں ذوق کا ہم بھول گئے تھے
تھا گم وہ کئی دن سے مگر یاں نکل آیا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

نہ کیوں سا ترے دانتوں سے جھوٹا ہو موتی
کہ دعویٰ کیا تھا صفائی کا جھوٹا

ہوا بخت دامن سے جب اُن کے سچا
ہوا ہاتھ اپنی رسائی کا جھوٹا

بناتا ہے آئینِ اُلفت میں مجھ کو
یہ شیوہ تری بیوفائی کا جھوٹا

ترا قول ہاتھوں میں چمکا رہا ہے
نگیں خاتمِ دل ربائی کا جھوٹا

اُڑا کر کیا رنگ الفت کو رُخ نے
یہ ساغر ہے کہربائی کا جھوٹا

مزے پیلیے پیوے اگر موت پاوے
یہ پانی مریضِ جدائی کا جھوٹا

مجھے نعمتِ خلد ہووے جو پاؤں
ترے در پہ ٹکڑا گدائی کا جھوٹا

گئے طاقِ ابرو میں تھے حضرتِ دل
سو دعوے ہوا پارسائی کا جھوٹا

خدا جانے ہے ذوق جھوٹا کہ سچا
نہیں ہے و لے آشنائی کا جھوٹا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی:۔

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا
جھلسے ہیں منہ شکار کئے پر بھی شیر کا[1]

[1] شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ جب شیر کو شکار کرتے ہیں تو دہیں سے گھاس پھوس کا پولا بنا کر اُسے آگ دیتے ہیں اور شیر کا منہ جھلس دیتے ہیں کہ کوئی ہیبت اس کی مونچھ کا بال نہ لے جائے اور اپنے دشمن کا خون نہ کرے۔ ان بالوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کترتے ہیں اور پان کی رگوں میں چھو کر کھلا دیتے ہیں۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یاں تک کہ جب رویا
تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سر بخیر و نکلا

گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹی سرِ سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ ہرگز وہ کبھو نکلا

اُسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

جب نیم جاں ہوں کوچۂ قاتل میں لوٹتا
قاتل ہے لوٹنے پہ مرے دل میں لوٹتا

لیلیٰ کے شوقِ وصل میں مجنوں کو دیکھنا
کیا کیا ہے راہِ ناقۂ محمل میں لوٹتا

غنچہ وہاں سے دیکھ دیکھ تری گرم جوشیاں
میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

دیتی لبِ ترے غنچہ کو اکثر مسکرات
گل ہو کے ہے جو پائے عنادل میں لوٹتا

کعبہ کا رخ ہے اور ترے دردِ فراق سے
میں اے صنم ہوں پہلی ہی منزل میں لوٹتا

دل کا سا ہوتا گر دُرِ غلطاں کو اضطراب
پھرتا تمام دامنِ ساحل میں لوٹتا

سودائیوں کے دل پہ تری یادِ زلف میں
اک سانپ سا ہے قیدِ سلاسل میں لوٹتا

کس کس مزے سے لوٹتے ہیں میکدہ میں مست
ہے ایک کے جو ایک مقابل میں لوٹتا

بے آبیِ تیغ ماہیِ بے آب کی طرح
اے ذوق دل ہے سینۂ بسمل میں لوٹتا

یہ غزل ناتمام ہے۔ عین عالمِ شباب کے شعر ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ قافیے اور مضمون ہیں ہمارے خیال میں۔ کبھی کہینگے :۔

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا

جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تابِ آفتاب کا
ملتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا

اے گُلرخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا
دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا

اس گل بغیر لوٹتی بسمل سے کم نہیں
سبزہ مزارِ عاشق پُر اضطراب کا

صد پارہ دل ہے گنجفۂ عشق ہو گیا
اور ہر ورق پہ نقش ہے حکم آفتاب کا

یہ غزل شیخ ناسخ کی غزل پر کہی تھی۔ **مطلع**

سروِ عاشق ہو گیا اس غیرتِ شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے ہے مبارکباد کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

روزِ مرگِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن
ہے بجائے شورِ ماتم غل مبارکباد کا

آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جاں
کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا

کچھ گدازِ عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے
کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا

ہو سبق آموز شوخی گر پری کو چشمِ شوخ
کام لے موجِ نگہ سے سیلئ استاد کا

سوزشِ غم سے ہزاروں داغ جل جل کر چھٹے
ہو گیا میرا کفن جامہ مگر حسّاد کا

سرو موجِ آب جو سے پائے در زنجیر ہے
دیکھ لو آزاد کو یہ حال ہے آزاد کا

آبداری ہے تری تلوار میں یا ہو گیا
آب زہرہ سخت جانی سے مری فولاد کا

یاد کرتا ہے مجھی کو پہلے وقتِ قتلِ عام
کیوں نہ میں کشتہ ہوں اے قاتل تری اس یاد کا

میں ہوں چکر میں لگی جس دن سے دنیا کی ہوا
حال میرا ہے بعینہ آسیائے باد کا

سر ترے کشتہ کا دیکھے گا نہ ہرگز روئے خاک
لے اُڑے گا شوق پابوسی اسے جلاد کا

سلسلہ میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی
ابجد عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

یوں تو ہے استادِ شیطاں پر کہوں کیا تجھ کو دل
تو تو شاگردی میں بھی اُستاد ہے استاد کا

ذوق حیراں ہے بہت فکر کشادِ کار میں
یا علی مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا

مرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا
دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
اگر خورشید نکلا تیرا گرمِ جستجو نکلا

مئے عشرت کا کھا خمخانۂ افلاک پر دھوکا
کہ تھا لبریز غم اس غمکدہ سے جو سبو نکلا

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

دے دعا وادیٔ پُر خار جنوں کو ہر گام
داد یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارہ تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا

پنجۂ مہر کو بھی خون شفق میں ہر صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

روشِ اشک گرا دینگے نظر سے اِک دن
ہے ان آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

کون گھر آئینہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جاروبِ صفائی دیتا

ساغرِ مے بھی ترے کشتۂ انداز کو یار
بوسۂ لب نہیں ہے چشم نمائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر انہیں آکے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھتا ہے ذوق کر وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

یہ غزل بھی ہمیں ہزاری باغ کی بہار ہے ۔

نکہت اس بت سے کبھی لیوینگے ہم ایمان کا
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا

چھوٹ ہی جاتو کلام اس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

ہو دلِ پُر آرزو سے نکلا نالہ عشق میں!
ایک پتلا تھا سراپا حسرت و ارمان کا

بن گیا جوشِ محبت سے ہمارے سینہ میں
ماہیٔ دریائے خوں جوہر ترے پیکان کا

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتے ہیں انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

یہ تپ غم کی ہے شدت اس ترے بیمار کو
یوم راحت بھی ہے حق میں اسکے دن بحران کا

اے اجل تکلیف مت کر کیا کرے گی آنکر
ہو چکا پہلے ہی کشتہ میں کسی کی آن کا

ہو سکے آلودہ دامن پاکدامن کس طرح
اے زلیخا چھوڑ دامن یوسفِ کنعان کا

ہے دل جلوں کے واسطے یہ نامہ بر تو خوب
اڑنا مگر محال ہے مرغِ کباب کا

ٹپکے اگر عرق گلِ رخسار سے ترے
دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا

اے آفتاب تیرے رخِ تابناک سے
کیا کیا چمک رہا ہے ستارہ حباب کا

ہوتا ہے دل جلوں سے کہیں ذوق ضبطِ آہ
موجِ دخاں سے ضبط نہ ہو پیچ و تاب کا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں پھوڑا اٹکا
چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف
کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا

توسنِ عمرِ رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا
کبھی میدانِ فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا

بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح
سامنے میرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اٹکا

لے گئے مر کے بھی اے ذوق رکاوٹ دل میں
ہاتھ تلوار کا جو یار نے چھوڑا اٹکا

عالمِ شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہوا تھا۔ اور آخر عمر میں آ کر غزل پوری ہوئی۔ سنہ [illegible]ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خواروں کا
دیجئے اک جام تو بہ یارا بھی یاروں کا

اتنا تو شورِ فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسے
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

ہوں رگیں حلقِ بریدہ کی ہمارے خونبار
گر تماشا انہیں منظور ہو فواروں کا

اے ستمگر جو ترے تیر نہیں تشنۂ خوں
تو کھلا رہتا ہے منہ کس لئے سوفاروں کا

کیوں نہ ہر تار میں دل ہو ویں گرفتار کہ زلف
جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا

دینگے جاں بوسۂ لعلِ نمکیں پر ہم بھی
جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا

بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق
رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا

پہنچیگا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر
مکتوب شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا

تو بجز میں سے ملکے ہے مری آنکھ سے سو در
ٹپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

ہے دل کی داؤں گھات میں مژگاں سے چشم یار
کرتی ہے قصد نی کی اوجھل شکار کا

قاصد لکھوں لفافہ کو خطِ غبار سے
تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کا چمن ہے:۔

خطر ہے خون سے دل پائمال کے کیسا
بچا ہے دیکھنا دامن سنبھال کے کیسا

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح
جو مانگتا تو کہا آنکھیں نکال کے کیسا!

کسی کے رخ پہ ہے جوگی جو چشم بند و باز
تو اس کے گھیرے ہے یا مژگان بال کے کیسا

نمود خال کی دیکھو تو زیر ابروئے یار
ستارہ نکلا ہے نیچے ہلال کے کیسا

ہماری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے اے قاتل
اُٹھا ہے فتنہ یہ بعد انفصال کے کیسا

شب فراق میں اُس مہ جبیں کے انجم چرخ
مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے کیسا

ہزار دم ہیں اسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر مجھ کو ٹال کے کیسا

پرانی غزل تھی میرے سامنے دوبارہ بنائی تھی۔

میں کہاں سنگ در یار سے ٹل جاؤنگا
کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

نالہ کہتا ہے کہ تا چرخ زحل جاؤنگا
بلکہ میں توڑ کے اس کو بھی نکل جاؤنگا

آج اگر راہ نہ پاؤنگا تو کل جاؤنگا
کوچۂ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤنگا

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لے جا مجھ کو
جا کے میں واں ترے قابو سے نکل جاؤنگا

(۱) دیکھا اپنے دُرِ گوش کو عارض کے متصل۔
دیکھا نہ ہو ستارہ جو صبح بہار کا۔

نفسِ بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اُس فرعون بے سامان کا

دیکھنا اے ذوق ہونگے آج پھر لاکھوں کے خون
وہ نماتا ہے لبِ لعلیں پہ لاکھا پان کا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دیکر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل لوٹتا ہے تم نے کیا جانے
ادھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

میں وہ شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا
ہنستا ہے چراغ بھی میری مزار کا

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

آتا ہے گر تو آ کہ سینہ سے چل کے اب
آنکھوں میں آ کے ٹھیرا ہے دم انتظار کا

ہو پاکدامنوں کو خلشِ گر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابۂ سرشک
شربت ہے باغِ خلدِ بریں کے انار کا

نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہو گیا

پرانی غزل تھی۔ میرے سامنے نظر ثانی کی ہے۔

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا

چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

پھر دل میں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور
لو پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا مرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

جل کر اگر بجھا بھی دل سوختہ مرا
یوں جل اٹھیگا جیسے کہ کوئلا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینہ میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

استاد کے مسودہ سے جس دن یہ غزل میں نے لکھی۔ فرمایا کہ عجیب اتفاق ہوا۔ ایک دن میاں نثار علی شاہ تشریف لائے۔ حسب عادت غزل کی فرمائش فرمائی میں نے بھی یہ غزل کہی تھی۔ انہیں سنائی۔ خوش ہوئے۔ بہت عنایت کی اور چلے گئے۔ دوسرے دن سنا کہ چلے ہی گئے۔ کاش کوئی اور غزل سناتا۔

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستاں سے عندلیب جدا

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے موذن جدا خطیب جدا

تمہارا درد جدائی نہ ہو جدا مجھ سے
حروف درد میں ہو حکمت طبیب جدا

ہے اور علم و ادب مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا

ہجوم اشک کے ہمراہ کیوں نہ ہو نالہ
کہ فوج سے نہیں رہتا کبھی نقیب جدا

فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر
نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

مدرسہ میں بھی اگر جاؤنگا تو جائے کتاب
شیشۂ بادہ لئے زیر بغل جاؤنگا

دیکھ کر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاس ادب
ہوں جو خورشید تو یاں سر ہی کے بل جاؤنگا

دل یہ کہتا ہے مجھے روزن سینہ سے نکال
ورنہ خوں ہوکے میں آنکھوں سے نکل جاؤنگا

سرد مہروں سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ
نخل سرما زدہ کی طرح سے جل جاؤنگا

آنکھ سے اشک صفت مجھ کو گرا کر نہ اٹھا
دل نہیں میں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤنگا

کہتا وحشت سے یہ ہے جامۂ پیری میرا
دیکھ کپڑا ہوں پرانا ابھی چل جاؤنگا

عقل سے کہدو کہ لائے نہ یہاں اپنی کتاب
میں ہوں دیوانہ ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

اے صنم در پہ نہیں دیر میں جا بیٹھوں گا
کچھ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ مچل جاؤنگا

قیس و فرہاد کو بتلاؤں گا کچھ عشق کی راہ
اب کے میں از طرف دشت و جبل جاؤنگا

گر پڑا آگ میں پروانہ دم گرمئ شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤنگا

کہتا پیراہن گل ہے یہ نزاکت سے نسیم
ہاتھ مجھکو نہ لگانا کہ نکل جاؤنگا

سنتے ہو زاہدو ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے
کیا بدل دیوینگے یہ ۔ اور میں بدل جاؤنگا

میں وہ مشتاق شہادت ہوں کہ سر دینے کو
پائے کو یاں تہ شمشیر اجل جاؤنگا

جنبش برگ صفت باغ جہاں میں آئے ذوق
کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ ہی مل جاؤنگا

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

سو بار مر کے عاشق جاں باختہ ترا
لڑنے کو پھر کھڑا روش نرد ہو گیا

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانند گرد باد
جب خاک اڑائی ہم نے تو وہ گرد ہو گیا

اس صید تیر خوردہ کو تو نے کیا نہ ذبح
آخر تڑپ تڑپ کے یونہیں سرد ہو گیا

آ اے مرے چمن کے گل درد دیکھ لے
عاشق کا رنگ زرد زر ورد ہو گیا

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق

مصحفِ رخ پہ ترے رنگ سنہرا ہیرا
واہ کیا خوب ہے سونا سرِ قرآن چڑھا

آنکھ تو لڑ لی پر کوئی بھی اس دل کے سوا
فوجِ مژگاں کے نہ منہ پہ سرِ میدان چڑھا

بوالہوس جاتے ہیں گر دام میں آہو کی طرح
چلّہ ابرو کی کماں پر ترے قربان چڑھا

دیکھو قسمت کا لکھا اس نے پڑھا خط سو بار
دھیان پر میرا نہ مطلب کسی عنوان چڑھا

نگہِ یار کو دے سونپ متاعِ دل و جاں
چور قسمت سے نظر اپنی نگہبان چڑھا

سنگِ سرمہ میں یہ تاب تھی وہ تیغ نگاہ
گردشِ چشم نے پر دی ہے غضب سان چڑھا

کشتۂ دستِ حنا بستہ ہوں ان ہاتھوں سے
کبھی دو پھول تو لا کر تو مری جان چڑھا

اشک آنے نہیں مژگاں پہ کہ یارو ابھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

حضرتِ عشق کی درگاہ میں آکر اے ذوق
دل و دیں دیتے ہیں سب گبر و مسلمان چڑھا

کھینچ تب مول وہ بانکا جواں لینے لگا
موت کے جی میں مزے بر نیم جاں لینے لگا

تیر چٹکی میں لیا اس نے لئے جانِ عدو
رشک میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا

نام میرا سن کے مجنوں کو جمہائی آ گئی
بید مجنوں دیکھ کر انگڑائیاں لینے لگا

مجھ کو ہر شبِ ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر
مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسماں لینے لگا

ہے جو غنچوں کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
یہ بلائیں کس کی باغ اے باغباں لینے لگا

جس نے کی اس میکدہ میں بیعتِ دستِ سبو
وہ قدم تیرے بس اے پیرِ مغاں لینے لگا

لے کے آئینہ جو دیکھی حسن کی اپنی بہار
اپنے بوسے آپ وہ غنچہ دہاں لینے لگا

آ کے دل پر جب کبھی کرنے لگے تیغِ نگاہ
چشم کی گردش سے وہ کارِ فساں لینے لگا

ذوقِ حسن و عشق روشن ہو گیا سب بزم پر
شمع کی گلگیر جو منہ میں زباں لینے لگا

موت اس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

رات کو اے ذوق اس کے نوکِ مژگاں کا لیا
تن پہ ہر موسے مرے کارِ سناں لینے لگا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کی غزل ہے ۱۲۶۱ ہجری۔

شکر پردہ ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

تھا نہ پامال رہ عشق کی تربت کا نشاں
بارے تعویذ تو نقش کف پا نے رکھا

تلخ کامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر
استخواں کو مرے منہ پر نہ ہما نے رکھا

آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جا کر
ایک تنکا بھی نہ تھا باد صبا نے رکھا

دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اسکو
پا بہ زنجیر تری زلف دوتا نے رکھا

آنکھیں دیدار طلب گور سے آئی ہیں نکل
دستہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا

بے نواقف رہ پہلے ہے رہبر موجود
گور سے آگے قدم دیکھ عصا نے رکھا

ناتواں ہیں نہ تن زار مرا دیکھ سکا
خوب دھوکے میں اسے تار قبا نے رکھا

تہ رکھی خوبی وزشتی سے غرض آئینہ وار
گھر میں مہمان جیسے اہل صفا نے رکھا

کیا تماشہ ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا
نام مجنوں مرا اس ہوش ربا نے رکھا

شربت مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر
لیک ناکام اسے آب بقا نے رکھا

نہ گیا مرکے بھی اس مصحف رخسار کا شوق
کہ رہا گور پہ قرآن سرہانے رکھا

بے نشاں پہلے فنا سے ہو جو ہو تجھ کو بقا
ورنہ ہے کس کا نشاں ذوق فنا نے رکھا

نشہ دولت کا بداطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے یاں اور بھی شیطان چڑھا

عشق کے دھبے نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا

توسن وحشت اگر اپنا زمیں چڑھ جانے
ابھی افلاک کو دیں خاک بیابان چڑھا

دل نے کب دیکھا مہ نو کو جو ابرو کا فر
لے کے شمشیر ہے سینہ پہ مرے آن چڑھا

دیکھنا ملت ودیں دونوں ہیں بر باطہ آج
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا

وہ مستِ ناز لیکر مجھ سے میرے شیشۂ دل کو
ہوا خوش اسقدر گویا کہ ہاتھ اُسکے حلب آیا

نوشتہ سے ہوا اک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم
جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا

برنگِ غنچہ خونیں دل ہنسنے کیا اس گلستاں میں
بھر آیا منہ میں خوں گرا اک تبسم زیرِ لب آیا

وہ آئیں یا نہ آئیں میں نہیں رنجیدہ دل اُن سے
مگر یہ رنج ہے کیوں رنج اُنکو بے سبب آیا

لگائی زلف کو شانہ نے جو انگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا

ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

میں اپنے ذوق کے قربان کہ مستی میں محبت کی
بلایا کس نے اسکو جب یہ آیا بے طلب آیا

اُتارا تو نے سر تن سے کہ اُس شامت کے مارے کا
تو بھولوں گا نہ میں احساں ترے تنکا اتارے کا

مرے طالع میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جانا ہے کافی آتشِ دل کے شرارے کا

ستارے دیکھ کر موتی تمہارے گوشوارے کا
کھینگے ہے ہمارا نور صدقہ اس ستارے کا

نفس ہے جادۂ عمرِ رواں جسطرح سے گزرے
یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستہ گذارے کا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اُسکے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

ترا ہر موئے مژگاں دل کو انگشتِ اشارت ہے
سمجھنے والا مجھ سا چاہئے پر اس اشارے کا

ملے اکسیر گر اس کشتۂ خواب نہیں نہ لوں ہرگز
مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا

سفید جوں دل ہوں چاندنی کے پھول کیا مجھ کو
دکھا دو خندۂ دنداں نما اس ماہ پارے کا

نہ پکڑیں دامنِ اسیا اس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

مرے گھر میں تو ہو ماہ سراج السیر بجلے تے
کیا غیروں میں پیدا حکم کیونکر قطب تارے کا

سرِ راہِ فنا میں ہوں مہیا ہے سفر لیکن
برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

گنہ رحمت سے اُس کی بخشوائے دل نے رو رو کر
چھڑک کر ہم نے بیچا نفع پر سودا خسارے کا

ڈھلکتا ہے مثالِ دانۂ تسبیح کیوں منکا
کہ جب ٹھیرا سفر دنیا سے کیا کام استخارے کا

فقط تارِ نفس کا ذوق خطِ جادہ کافی ہے

پہنچا آبِ تیغِ قاتل تا بسر اچھا ہوا ‏— اے دلِ مجروح لے تو غسل کر اچھا ہوا

ایک دن بالکل نہ میں اے چارہ گر اچھا ہوا — داغ اِدھر تازہ ہوا گر زخم اُدھر اچھا ہوا

کم نہ ہو اُس آبِ خنجر کی الٰہی آبرو — آج مدت میں ہمارا حلق تر اچھا ہوا

آرہیگا دشت میں لیلیٰ ترے ناقہ کے کام — ہو گیا مجنوں جو کانٹا سوکھ کر اچھا ہوا

روز کہتا تھا مزا مجھ کو چکھا دے عشق کا — بھر دیا لَون اس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

سُن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا — واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

بندھ گیا اُس مو کمر کا جبکہ مضمونِ کمر — ہو گئی مضموں میں وقتِ شعر یہ اچھا ہوا

تجھ کو صدقہ کر اگر ہے بدمزہ تیرا مزاج — یہ اِدھر صدقہ دیا تو نے اُدھر اچھا ہوا

ہاتھ تو اوچھا پڑا تھا یار کی شمشیر کا — زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا

کھنچ گیا میری طرف سے اور بھی دلبر کا دل — واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا

قتل کرتا ہے ترا بسمل سے یہ کہتا کہ لو — اب تو دامن بھی ہوا لوہو سے تر اچھا ہوا

نامہ بر جاتا ہے جا جلدی چلی جانِ حزیں — دیر مت کر ساتھ تیرے ہم سفر اچھا ہوا

آئینہ خانے میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال — تا تجھے جانیں کہ یہ صاحبِ نظر اچھا ہوا

ہے بُرا تو ہی اگر آیا نظر تجھ کو بُرا — تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رک گئے

پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھا ہوا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا — اگر جہلم کو بھی آیا تو ہم جانینگے اب آیا

چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ عیش و طرب آیا — بہاریں خوب لوٹینگے اگر وہ غنچہ لب آیا

خلافِ وعدہ سے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا — نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا

عجب حیرت میں ہوں جب سے نظر وہ خالِ لب آیا — دہن اس کا عدم ہے اور عدم میں نکتہ کب آیا

تو پیلے تشنہ کامی یا رے آبِ خنجرِ قاتل — گلو تک میرے اور زخمِ گلو کے تا بلب آیا

تامل کیجیو ذوقِ طپیدن۔ دیکھئے کیا ہو — کہ اب تک ذبح کرنے کا نہیں قاتل کو ڈھب آیا

نہ کرتا ضبط میں گریہ تو اے ذوقؔ اک گھڑی میں
کٹورے کی طرح گھڑیال کے غرق آسماں ہوتا

لڑکپن کی غزل تھی نظرِ ثانی سے اصلاح کی ۔

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
یہ حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام
سانپ اسکو اگر آ کے نگل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تنِ خشک کو غرقِ آب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت تو عجب حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

قوت سے تری تارِ نفس سینہ میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت
یہ سینہ پھپولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہیں ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یہاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوقؔ ادب شرط
یاں شمع نمط سر ہی کے بل جائے تو اچھا

سنہ ۱۲۶۰ھ

کٹے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا

نہ پہنچا گردِ جاناں تک اور لوٹ گئے ہائے
پڑا گلے میں مرے دستِ آرزو میرا

ہے عمرِ رواں کیا چاہیے رستہ گذارے کا

نالہ ہے اُن سے بیاں دردِ جدائی کرتا
کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

پنجۂ شانہ کو دیتا ہے فلک کب ناخن
جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرتا

دیکھتا اُس بتِ مغرور کا گر جاہ و جلال
کبھی فرعون نہ دعوائے خدائی کرتا

خاک آئینہ سے ہے نامِ سکندر روشن
روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا

نہیں گوش شنوا باغِ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے
ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

سوزِ دل کون بجھائے کہ نہیں چشم میں اشک
پر ہے کچھ خونِ جگر کار روائی کرتا

بیٹھ رہیے تو قفس ہے عجب آرام کی جائے
پر ہے بیچین ہمیں شوقِ رہائی کرتا

ذوق اس پائے نگاریں کا جو ہے وصف نگار
اشک خونی سے ہے کاغذ کو حنائی کرتا

پرانی غزل تھی۔ نظر ثانی میں نئی ہوئی ہے۔

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے اِک نیا اور آسماں ہوتا

ابھی ٹھنڈا بھلا کیونکر شہیدِ تفتہ جاں ہوتا
کوئی دم شمعِ مردہ میں بھی ہے باقی دھواں ہوتا

کہے ہے مرغِ دل اے کاش میں زاغِ کماں ہوتا
کہ تا شاخِ کماں پر اس کی میرا آشیاں ہوتا

عزاداری میں ہے کس کی یہ چرخِ ماتمی جامہ
کہ جیبِ چاک کی صورت ہے خطِ کہکشاں ہوتا

نہ ہوتی دل میں گر کاوش کسی کی نوکِ مژگاں کی
تو کیوں تن میں مرے ہر موئے تن مثلِ سناں ہوتا

نہ رکھتا گر نہ رکھتا منہ پہ دانہ یہ مریضِ غم
مگر تیرا میسر بوسۂ خالِ دہاں ہوتا

اگر جی کھول کر میں تنگنائے دہر میں روتا
تو جوئے کہکشاں میں بھی فلک پر خوں رواں ہوتا

بگولا گر نہ ہوتا وادیٔ وحشت میں اے مجنوں
تو گنبد ہم سے سرگشتوں کی تربت پر کہاں ہوتا

ترے خونیں جگر کی خاک پر ہوتا اگر سبزہ
تو مثلِ موئے مژگاں اس سے پیہم خوں رواں ہوتا

رکاوٹ دل کی قاتل کے بوقتِ ذبح ظاہر تھی
کہ خنجر تھا مری گردن پہ رُک رُک کر رواں ہوتا

جاہلِ منکر نہ آئے راہ پر معجزے سے بھی
جہل سے بوجہل اپنے نام مسلماں ہی رہا

حلقۂ زنجیر میں بھی دل رہا پا در رکاب
توسنِ وحشت ہمارا گرمِ جولاں ہی رہا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

حلقۂ گیسو میں دیکھی کس کے رخسارے کی تاب
شب مہِ بالا نشیں سر در گریباں ہی رہا

مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینہ میں رہے
آخرش دل بہ گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا

سب نے دیکھا اُس سے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

آگے زلفیں دل میں بستی تھیں اور اب آنکھیں تری
ملکِ دل اپنا ہمیشہ کافرستاں ہی رہا

مجھ میں اُس میں ربط ہے گویا برنگِ بوو گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

طلسمِ طرفہ ترا آنسوؤں نے میرے مرد ماں باندھا
کہ ہے اک اک گرہ میں حاصلِ صد بحر و کاں باندھا

ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل دلستاں باندھا
عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا

یہ بہتاں کس نے افشائے محبت کا یہاں باندھا
جو بعد از مرگ تو نے منہ کو میرے بدگماں باندھا

ہوئی تشہیر نعشِ احسن ناتواں کی جب تو پاؤں میں
کوئی تارِ نگاہِ مور جائے ریسماں باندھا

کیا مجنوں مجھے آشفتگیٔ زلف نے کس کی
کہ میرے سر پہ مرغِ شانہ سر نے آشیاں باندھا

ترا ہنسنا جو یاد آیا برنگِ قہقہہ مینا
تو میں نے تار اک رونے کا لے کے ہچکیاں باندھا

تڑپ کر دامنِ زیں کو نہ آلودہ کرے خوں سے
بھلا فتراک سے کیوں تو نے صیدِ نیم جاں باندھا

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدزباں باندھا

وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد اپنی
مرے مرقد پہ حلقہ دشمنوں نے دوستاں باندھا

اڑا دینگے دھوئیں اک آن میں اس چرخِ گرداں کے
اگر حلقہ دھوئیں نے دل کے زیرِ آسماں باندھا

نہیں بلا سے کوئی یار عشق میں اے دل
کہ غمگسار ہوں میں تیرا اور تو میرا

مقام وجد میں آئیں ابھی ملائک عرش
جو میکدے میں نہیں شور ہائے و ہو میرا

عجب نہیں ہے مری سوزشِ محبت سے
کہ تارِ شمع ہو ہر ایک تارِ مو میرا

برنگِ آئینہ چشمِ پُر آب سے میرے
گرا نہ اشک۔ کیا پاسِ آبرو میرا

نہ آئے اے نگہِ یار تجھ کو کچھ غیرت
کہ آگے تیغ اجل کے ہو سر فرو میرا

کروں میں کیا کہ گریبان صبح کی مانند
نہیں ہے چاک جگر قابلِ رفو میرا

نظر جو آتا ہے اب تک فلک کا رنگ سیاہ
پڑا تھا سایۂ بختِ سیہ کبھو میرا

ہمیشہ میں ہوں اسی داؤ گھات میں اے ذوق
کہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خو میرا

نہ ہوا آبِ شہادت سے گلو تر نہ ہوا
مستعد جب وہ ہوا ہائے تو خنجر نہ ہوا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا

بے چراغ اسکو نہ رکھ داغِ الم سے اے عشق
خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہ ہوا

کب صبا آئی ترے کوچہ سے اے یار کہ میں
جو حبابِ لبِ جو جامہ سے باہر نہ ہوا

ق

خون رگہائے گلو لاشۂ بے سر سے مرے
آکے کب جوش پہ فوارہ سے ہمسر نہ ہوا

عشق یہ معجزہ کیسا ہے کہ اِس کشتہ کے
موئے سر حلق سے پیدا ہوئے اور سر نہ ہوا

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جسکو وہ جاں بر نہ ہوا

جان کے دل میں سدا جینے کا ارماں ہی رہا
دل کو بھی دیکھا کئے یہ بھی پریشاں ہی رہا

بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا
خاک پر روئیدہ میری عشق پیچاں ہی رہا

پستۂ قندی ہے کام غیر میں وہ لعل لب
پر مرے حق میں تو سنگ زیرِ دنداں ہی رہا

بندھ سکا ہم سے نہ مضموں اِس دہانِ تنگ کا
ہاتھ اپنا فکر میں زیرِ زنخداں ہی رہا

لذت کو تیغِ عشق کی سن سن کے بو الہوس
آخر ملیح سا حلق بریدوں میں مل گیا

گر بعد فقر پھر سگِ دنیا ہوا فقیر
کمبخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

آخر کو فیضِ بیعتِ دستِ سبو سے آج
پیرِ مغاں کے میں بھی مریدوں میں مل گیا

دکھلائے کہکشاں سے فلک چاک سینہ ات
اس ماہ وش کے سینہ دریدوں میں مل گیا

اس شکل سے ہوا وہ طلبگارِ دیدِ یار
صاف آئینہ کا نقش ندیدوں میں مل گیا

حبِ حسینؑ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حرُ
تھا اگرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

سنہ ۱۲۶۰ھ کی چمن بندی ہے۔

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے ابھی آنے میں اسکے
اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا

تا صاف کرے دل نہ مے صاف تصوف
کچھ سود صفائے علم تصوف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خطِ غیر مرا واں کسی عنوان
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گزرے نہ دل میں ترے کافر
یاد اس لئے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

یہ غزل ہے جس پر شاہ نصیر مرحوم سے قطع تعلق ہو گیا تھا (دیکھو صفحہ ۹)

ہر گام پہ رکھے ہے وہ دیدہ بہوشِ نقشِ پا
ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

افتادگاں کو ہے سر و ساماں نہ جانیو
داماں خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا

اعجاز پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
بول اٹھے منہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا

اس بارہ بندگی میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام
بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا

جسمِ نزار خاک نشینانِ کوئے عشق
یوں ہے زمیں پہ جیسے تن و توشِ نقشِ پا

فلک وارستۂ زنجیر رہنے دے ہے کوئی پُرشوروں کو
گیا ہی آخرش زنجیر سے پیلِ دماں باندھا

بلا ہوں مضطرب ایسا کہ مجھ سے برق نے دیکھ
حصار اک گرد اپنے شعلۂ جوّالہ ساں باندھا

مراد دل آ گئے ہی سینہ میں اک نیزا سا پکتا ہے
خیال خطِ سبزِ یار نے کیوں برگِ پاں باندھا

دلِ مجروح پر میرے نہ سمجھو داغِ حسرت کا
پرِ طاؤس اس زخمی نے بہرِ دوستاں باندھا

کہاں دل بھاگ کر جاوے کہ تیرے نخلِ قامت نے
عجب اک گرد نامہ خط نے اے سروِ رواں باندھا

تپِ سوزِ محبت کے لئے چارہ نہیں تم سے
یہ گنبدِ نیلگوں گردوں پہ کیوں آشفتہ جاں باندھا

سمجھ کر موجِ دریائے فنا کو ... شیراں
کفن مثلِ حباب اے ذوق ہم نے سر پہ یاں باندھا

بھڑکنا کیا کہوں سینہ میں اپنے آتشِ غم کا
کہ جلائے نہ ہر سے ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصۂ عشرت ہے سو وہ چند ہے غم کا
کرے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

ترے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا

برنگِ طوقِ قمری کوئی نکلے ہے لگاوٹ سے
کمندِ گردنِ دل ہے جو حلقہ زلفِ پُرخم کا

ترے رخسار کا پرتو پڑے گر عارضِ گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پر ہر قطرہ شبنم کا

سئے جاتے ہیں کس سے زخم اس تیغِ تبسم کے
کہاں کھلتا ہے بخیہ سوزنِ عیسیٰ مریم کا

دلیرانِ محبت کو خلش سے اس کی مژگاں کے
پسِ مردن ... بھی ہے عالم حیا و رستم کا

خراش سینہ میں اک رہ گیا ہے ٹوٹ کر ناخن
غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ پھایا ہے مرہم کا

اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکساروں پر
تعجب کیا کہ ابلیسِ لعیں دشمن ہے آدم کا

خط اس کا وصل کی دولت کا ہے پیغام اے قاصد
لگا قیمت نہ نسخہ ہاتھ یہ اکسیرِ اعظم کا

شہیدا ذوق سینہ میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں
مری جو آہ ہے گویا وہ ہے اک نخل ماتم کا

یہ گلدستہ تیس ہزاری باغ میں بنایا تھا سنہ ۱۲۶۰ ہجری:-

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

آغازِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کا ایک قلمی دیوان کتب خانہ آزاد میں موجود ہے اُن کی بھی ایک غزل اسی طرح میں درج ہے:۔

رکھتے تھے جو کشور کسرٰے و قیصر زیر پا
ہے انہی کا آج سر با تاج و افسر زیر پا

اے جنوں! ہم پابرہنہ۔ گرم پتھر زیر پا
دوپہر ہے۔ سایہ بھی بیٹھا ہے چھپکر زیر پا

تم چلو رکھ کر جو میرا دیدۂ تر زیر پا
پل ہوں بحرِ اشک پر مژگاں سراسر زیر پا

خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیرِ عشق
اب تو پارس ہوگا جو آئیگا پتھر زیر پا

میری آنکھوں کو ملو تم لے کے تلووں کے تلے
کیوں نشے میں توڑتے ہو رکھ کے ساغر زیر پا

ہے نمازِ کشتۂ قامت۔ بجائے جا نماز
اے قیامت لا بچھا دامانِ محشر زیر پا

زیردستی بھی ہے موذی سے لازم احتراز
جب دبیگا سانپ کاٹیگا مقرر زیر پا

ہیں ترے مجنوں کے مژگاں وادیٔ وحشت کے خار
راہ آنکھوں کے نکل آئے ہیں چھبکر زیر پا

بونہ گل سیدھی کے گلبن رشکِ گل کھلوں ریتی
آ کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

فاتحہ عاشق کا دیتا ہے تو واجب ہے ادب
اپنے کفشِ پا کو رکھ لے پا سے باہر زیر پا

میں ہوں وہ کشتی شکستہ بحرِ الفت میں صبا
ایک تختہ رہ گیا ہے جس کے بچ کر زیر پا

نصرتِ تن کو ذوق سب غارت کرے گا ایکدن
چونٹیوں کا پھر رہا ہے یہ جو لشکر زیر پا

اسی عالم میں یہ غزل ایک مرشدزادہ[1] کی فرمائش سے کہی تھی۔ انہیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اسی کے لئے غزل کہوائی تھی۔ نظرِ ثانی اس پر بھی نہیں ہوئی۔

دشمنِ جاں یک بیک سارا زمانہ ہوگیا
ہائے تاثیرِ محبت یہ ستم کیا ہوگیا

تم میں تھا یا مجھ میں تھا دل پھر کہو کیا ہوگیا
دل کے جانے کا تو عالم کو اچنبھا ہوگیا

جس کو لے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہوگیا
سوکھ کر ایسا ہوا دُبلا کہ کانٹا ہوگیا

[1] مرشدزادہ۔ اہلِ قلعہ کے محاورہ میں عموماً شہزادہ کو کہتے تھے۔ اور جو شہزادہ قرابت قریبی کے لحاظ سے ایک وقت میں دعویدار سلطنت کے ہوسکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے۔ مثلاً شاہ موجود کا چچا۔ بھائی وغیرہ وغیرہ۔

ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا	فیضِ بے سر و پائی مجنوں سے دشت میں

پا بوس دُر کنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوقؔ اُس کے بآغوش نقشِ پا

اب ردیف الف کی وہ غزلیں لکھتا ہوں جن کا حال دیباچہ کے صفحہ ۲۶ میں لکھ چکا ہوں۔ ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے۔ یا خود یاد آجاتے تو سناتے۔ اور عجب محبت سے فرماتے۔ یہ ہمارا بچپن کا کلام ہے۔ نظرثانی کرینگے۔ پھر دیوان میں داخل کرینگے۔ اور کچھ کچھ اصلاح کرتے بھی جاتے تھے۔ مگر والد مرحوم کے تقاضوں سے۔ اور میری حاضر باشی سے جس مسودے کو درست کر دیتے تھے۔ نئی غزل مرصع ہو جاتی تھی۔ ہائے۔ وقت تھا کہ گزر گیا۔ یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں۔ اور نہیں پاتا۔ اب جو کچھ ہے یہی غنیمت ہے چھپے ہیں نقل کر دیتا ہوں۔ ضائع ہوئے تو یہ یادگار بھی نہ رہیگی۔ موئی مٹی کی نشانی اسے کہتے ہیں۔ انتہائے کلام تو سب سُن چکے۔ ابتدائے کلام آزاد سے سنو۔

آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا	جل اٹھا شمع نمط تارِ رگِ جاں میرا
آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا	ملتے دیکھے جو لبِ زخم تو بولا قاتل
دیکھ ترکیجو نہ خوں سے کہیں داماں میرا	کرکے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
مہرِ گردوں ہو جو داغِ دلِ سوزاں میرا	اے جنوں! دن سے سوا رات کو روشن کرنے
ہے خطِ جادہ ترا چاکِ گریباں میرا	خارِ وحشت سے کہو چھوڑ دے دامنِ دل کا
رہ گیا ہائے کھُلا دیدۂ حیراں میرا	دھیان میں آئینۂ رخ کے گئی جان نکل
خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا	اے جنوں تو بھی ہو دنیا میں یونہیں خانہ خراب
باندھیں گر اہلِ سخن حالِ پریشاں میرا	نظمِ معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف
دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لبِ خنداں میرا	خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھ دو

اپنا رونا مجھے ہنسنے سے مبارک ہو ذوقؔ
دیکھ خنداں ہو جو وہ دیدۂ گریاں میرا

زلف کہتی ہے دُرِ گوش سے دکھلادے کوئی — گر سرِ عقدہ سے ناگن کو ہو ٹلتے دیکھا

کج ادائی گئی کب ہم سے ترے ابرو کی — شاخِ آہو سے ہے خم کس نے نکلتے دیکھا

اشک کو لیتا نہ دامن میں تو کیا کرتا میں؟ — گاہوارہ میں یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آبِ حیات — تجھ کو دانتوں پہ مسی ہے کبھی ملتے دیکھا

کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے — اُن کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

خانۂ دل کے سوا آتشِ غم سے اے ذوق
سامنے آنکھوں کے گھر کس نے ہے جلتے دیکھا

برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا — کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے — تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے تارِ اشک سے مسطر — کریگا شرحِ دردِ عشق کچھ تحریر دل میرا

سنبھالے رکھ ذرا اے آسماں دیکھ اپنے دامن کو — زمیں پر کھینچتا ہے نالۂ شبگیر دل میرا

بتوں کی سرد مہری نے کھلادی زعفراں لیکن — کرے کیا گرمجوشی ہو گیا کشمیر دل میرا

تری چشمِ فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو — کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

تصور میں کسی تیغِ نگہ کے کشورِ الفت — ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا

بتو اگر حسن کی دولت سے تم ہو سنگِ پارس — ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل میرا

کبھی منت کی زنجیر ان کو پہنے اس نے دیکھا تھا — ہے اب تک پہنے تارِ اشک کی زنجیر دل میرا

نشاں تو رہنے دے قاتل ذرا سا خوں لگا دامن میں — قیامت میں ترا تا ہوئے دامنگیر دل میرا

بتوں کا عشق ہے گر ذوق تو ساری خدائی میں
کریگا شہر شہر اک دن مجھے تشہیر دل میرا

یہ پہلا ابتدائی مشق تھی۔ شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے ان دنوں کی غزلوں میں انہوں نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب جوشِ طبع عالمِ طفولیت میں ہوتا ہے تو ایسے ذوق شوق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اُسی عہد کے خیال ہیں

ہم نے اُن سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور وہاں کیا ہو گیا

بادہ گلگوں نے جو رنگِ رُخ کو روشن کر دیا
پہلے تھا گلرنگ مکھڑا پھر بھبھوکا ہو گیا

جب اُٹھا تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شورِ ماتم تھا کہ اک عالم میں برپا ہو گیا

تم نے کل عزمِ سفر کا ہم کو بھیجا تھا پیام
لو سفر یاں آج دنیا سے ہمارا ہو گیا

پھر جلوائے حضرتِ دل ہو چکا ملنا بس اب
آج گھر میں غیر کے پھر اُن کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا ایک جہاں کا ہے نگاہوں پر تری
جس نظر سے آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو اُس میں نام بھی پورا نہ تھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

وہ تو خود شعلہ تھا جب میں نے کہا ہو شعلہ خو
اس لطیفے سے بھڑک کر آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اُڑ کر اگر پہنچا تو کیا
تیرے جانے کا تو اک عالم میں چرچا ہو گیا

گرم ہو کر آتا ہے منہ پر مرے طفلِ سرشک
دیکھ کیا اے چشمِ تر اب تیرا یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغِ نگہ نے ایک عالم کا ہے خون
نام بدنام اے ستم ناحق قضا کا ہو گیا

یا ذرا زلفِ عنبریں [illegible] رات پہ آئیں [illegible]
گنبدِ گردوں سیہ سارے کا سارا ہو گیا

ذوق نے جو زلف کو چھیڑا تو لے بیٹھے تھے تم
تو نے خود چھیڑا اسے اور برہم اتنا ہو گیا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی ۔

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
اے صنم پر ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا

ضعف سے سینہ میں آتا ہے مرا دم جس طرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں سے چلتے دیکھا

تھا کہیں اس باغ میں نخلِ گلِ آتشبازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

اُس رُخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

اے صبا جنبشِ سبزہ کے سوا کس کو بھلا
مور بھی گورِ غریباں پہ ہے چلتے دیکھا

جو چڑھا اوجِ فنا پر وہ گرا سایہ نمط
پاؤں اس کوٹھے پہ ہے سب کا پھسلتے دیکھا

کوئے جاناں میں ہے دل جیسا گیا قابو سے
ہم نے بچے کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا

خط شرح ناتوانی ہو گیا اڑتے ہی آہ — جوں پر کمزور بازوئے کبوتر سے جدا

حضرت آدم کو شیطاں نے نکالا خلد سے — غیر نے ہم کو کیا ہے کوئے دلبر سے جدا

ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف القصہ آبرو
بکتے پھرتے ہیں گہر ہو کر سمندر سے جدا

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔

لختِ دل اور اشکِ تر۔ دونو ہم۔ دونو جدا — ہیں رواں دو ہمسفر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

میں نہ چھوٹا ہوں نہ وہ چھوٹی پھر آخر کس لئے — رہتے ہیں شب تا سحر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

وصل کی شب نکہت و گل کی طرح ہم اور وہ — رہتے ہیں باہم مگر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

شکل عکس و آئینہ۔ تیرا خیال اور میرا دل — آئینے میں سیمبر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

ذوق ہیں سینہ میں اوراقِ جلاجل کی طرح
دل جگر با شور و شر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

اسی عالم کا کلام ہے:-

لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب خیال کیا — تبسمِ نمکِ لب ہے گویا ہم نے زباں کو لال کیا

لیگا دلا اس عشق سے کیا تو جس نے ہے کوہ و صحرا میں — مجنوں کا وہ حال کیا۔ فرہاد کا ہے وہ حال کیا

پھرتا ہے تو لے چاند کے ٹکڑے سکہ شب و روز آنکھوں میں — دل اے روشن ہو کے شب فرقت کو ہے روز وصال کیا

آتش گل ہوئی روشن یاں۔ یہاں چمکا جانے کا جب ہے — موسم گل نے کیا ہنگامہ گرم ہے ایسے سال کیا

سادہ رخوں کی جو محبت تیری ہی تھی یہ سادہ دلی — منہ پہ چڑھ کر اس شوخ نے اپنا کالا منہ اے حال کیا

سو قلم ایسا لاؤں کہاں سے جو یہ کرے تحریر انہیں — حال تو دیکھو تم نے مجھے ہردے کے ہے وبال کیا

نامۂ یار کو رکھ دیجو تو ہمدم میرے زیر کفن — نامہ جواب نامہ ہے اپنا وہاں جو کسی نے سوال کیا

شمع نمط ہر خار جنوں کی انگلی لگی جاتی ہے — آبلوں پہ تیزاب تھا گر تو ناحق کیوں پامال کیا

آگ ہے دل میں۔ درد جگر میں۔ آنکھ میں آنسو۔ لب پہ فغاں ہے
عشق نے اسکے ذوق ہمارا دیکھ لو ہے یہ حال کیا

اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا
یار ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

پھول گل مہندی کے لالا کے نہ ہاتھوں میں ملو
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

طائرِ جاں کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجئے روانا اچھا

طاقِ ابرو کے تصور میں دلا کھینچ نہ آہ
سمتِ کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

بدگماں دیکھو کہیں اس میں بھی نہ ڈالیں رخنہ
روزنِ در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

آتشِ عشق ہے سینہ میں دبی دیکھا اے چشم
اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بیٹھ رہ کر کے قناعت کہ بشکلِ مہِ نو
چھوڑے آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

مرغِ دل نے نگہِ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانا اچھا

یاں تو دم میں نہیں دم اور وہ لئے تیغِ دو دم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

طرۂ شمشاد دکھاتا ہے تری زلفوں کو
لاؤ آرہ کہ یہی اس کو ہے شانا اچھا

ق

ساقیا ابر ہے آیا تو بڑھا تم پہ ہاتھ
کہ گھٹا میں نہیں ہمت کا گھٹانا اچھا

جل کے گر قطرۂ خوں دل کا ہوا اشک آلود
تو نہیں نیچے مژگاں سے گرانا اچھا

گردشِ عمر میں تسبیحِ سلیمانی کا
آج اک ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا

سامنے یار کے اے **ذوق** بہانا آنسو
ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

کیجیو مشاطہ نہ سبزہ گوشِ دلبر سے جدا
بدنما ہے گر رکھیں مینا کو ساغر سے جدا

دل مرا یارب نہ ہو زلفِ معنبر سے جدا
سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہ ہو سر سے جدا

لکھے شرحِ سوزشِ ہجراں جو تیرا بیقرار
ہو تڑپ کر جوں شرر ہر نکتہ دفتر سے جدا

فندقِ پائے نگاریں کا ہوں میں سودا زدہ
قطرۂ خوں بھی نہ ہوگا نوکِ نشتر سے جدا

شیشۂ دل میں ہے کیا چمکا شرارِ عشقِ یار
شیشہ گر رکھ تو بھی شیشہ کو نہ اخگر سے جدا

ہو جہاں کشتۂ مژگاں کا تمہارے مدفن — عوضِ سبزہ ہو واں خاک سے نشتر پیدا

عاجزی سے یہ آئے نہ ہوا میں لاغر — موت سے چیونٹی کی ہوویں اگر پر پیدا

قصدِ پرواز کرے کیوں نہ مرا طائرِ روح — تیرے خنجر سے جو پہلو میں ہو نشتر پیدا

خط ترے شعلۂ رخسار پہ ہے معجزِ حسن — ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیونکر پیدا

خاکِ دلِ سوختہ یک مشت ہو گر صرفِ چمن — ہوویں غنچوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا

رخِ روشن پہ عیاں ہیں جو عرق کے قطرے — کیا تماشا ہے کہ دن کو ہوئے اختر پیدا

درفشاں وقتِ سخن ہیں لبِ رنگیں تیرے — ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا

اشکِ گرم ایک بھی دریا میں جو ٹپکے میرا — جائے ماہی ہو تہِ آب سمندر پیدا

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے — دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

سر کٹانے میں مزہ وہ ہے کہ جی چاہتا ہے — سرِ ہر موئے بدن ہوئے جدا سر پیدا

بے طمع ہو لی نہیں زیبِ مکاں کی اے ذوقؔ
نافۂ دل سے ہے تو گھر اور رشکِ دلِ سر پیدا

غزل مذکورہ بالا بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ مجھے یاد ہے مقطع کا مصرع ثانی کئی طرح کہا اور پسند نہ آیا۔ پھر فرمایا۔ خیر جب صاف کریں گے تو سمجھ لیں گے۔ اب آگے چلو یہ کہہ کر اور غزل شروع کر دی۔

لکھنؤ میں ایک دن میں اور مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ کے دونو صاحبزادے میر انیس مرحوم کے پاس گئے۔ اور وہیں ہی ملاقات تھی۔ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میں نے مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں ٹھہریگا — ولیکن تو بھی گر چاہے کہیں ٹھہروں نہ ٹھہریگا

میر مرحوم نے پھر پڑھوایا اور کہا کیا خوب کہا ہے۔ یہ کس کا ہے۔ میں نے کہا شیخ ابراہیم ذوق کا۔ کچھ گفتگو کے بعد پھر کہا کہ وہ مطلع ذرا پھر پڑھئے گا۔ میر شریف حسن خاں صاحب نے کہا۔ ان کے شعر آپ کو بھی پسند ہیں؟ اور کچھ تعریف کے لفظ کہے۔ میر صاحب نے کہا کہ جی ہاں۔ دلی میں میاں خواجہ میر کے بعد یہی ہوئے اور شاعر کون ہوا؟ تھوڑی دیر کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ کھڑے ہو کر انہوں نے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھ دیجئے گا۔ میر شریف حسن صاحب نے کہا کہ آپ کو یہ شعر

ایضاً از عالم بالا

ہجر میں کب کیا مرض ہے تنگدل پیدا ہوا
خوں دل پیدا ہوا۔ آزار سل پیدا ہوا

تیرہ بختی تھی اسی دن اپنی روشن ہو گئی
روئے تاباں پر تمہارے جب کہ تل پیدا ہوا

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے ایسا کیا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

اس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوۂ رنگ مسی
یا کہ نافرمان و لالہ مشتمل پیدا ہوا

کر کے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
وہم کیا دل میں یہ اے پیماں گسل پیدا ہوا

خاکساری نے اسی دن روشنی پائی تھی **ذوق**
آدم خاکی کا جس دن آب و گل پیدا ہوا

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوز دروں وہی ہے پہ ہو گے نہ داغ پا

تو باغ میں رکھے اگر اے رشک باغ پا
پھر آئے واں خزاں تو وہیں ہو دیں داغ پا

وہ اور میرے گھر میں رقیبوں کو لے کے آئے
بلبل کے آشیاں میں رکھے جیسے زاغ پا

گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر
تو کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

رونے کی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشم آبلہ
جوش جنوں میں رکھ نہ سوئے کوہ و راغ پا

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اس ست تو ڈال دیکھ میان اجاغ پا

اس گل سے گر اجازت پابوس ہو نصیب
ہو جائے چوم چوم کے دل باغ باغ پا

اُچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
جس طرح بد لگام ہو گھوڑا چراغ پا

ساقی کا دور چشم ہو گر بر کنار آب
پائے حباب آب رواں سے ایاغ پا

ہے جی میں آب جو ملا اے سرو خوش خرام
دھو دھو پیا کریں ترے سب بے دماغ پا

اے **ذوق** کیوں چمن میں وہ گل جائے جس کے ہوں
رنگ حنا سے غیرت صدیا ئیں باغ پا

تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا
گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا ‏ دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا
دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا ‏ وہ مل گیا تو جائے کچھ بھی نہیں گیا
خورشید وار جب رخ پہ چمکا کوئی تو کیا ‏ آخر کو پھر جو دیکھا تو زیر زمیں گیا
دیکھا کہیں نہ اسکو جو دیکھا تو اپنے پاس ‏ میں دور دور جوں نگہِ دوربیں گیا

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا ‏ ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اٹھا لیا
یوں لادائے ہم دلِ سیپارہ کرکے جمع ‏ دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا
جو بار آسمان و زمیں سے نہ اٹھ سکا ‏ تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھا لیا
سر ہم نے جب سے پائے صنم پہ رکھدیا ‏ دونوں جہاں سے دستِ تمنا اٹھا لیا

مرض الوفات سے تین دن پہلے غزل کہی اور مجھے سنائی۔ پھر ملازم کو دی کہ اندر طاق میں احتیاط سے رکھدے۔ میں اکثر اسی وقت اپنی کتاب میں نقل کرلیتا تھا۔ بدترین اتفاق یہ کہ اس وقت خیال نہ آیا۔ دوسرے دن بیمار ہوگئے۔ پھر نقل کا کسے ہوش تھا انتقال کے بعد ہرچند ڈھونڈی۔ نہ ملی۔ یہ شعر یاد رہ گئے وہی لکھ دیتا ہوں:۔

کیا کہیں اس سے جو ہم سے زیادہ جانتا ‏ وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا
بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مستِ غرور ‏ گر برا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا
کرتا ہے جب نالہ اپنا عالمِ بالا کی سیر ‏ ہے فلک پر کہکشاں کو خطِ جادہ جانتا
آفتابِ حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد ‏ پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

کروں درد آشنا کیونکر دل احباب اپنا سا ‏ بلا سے جیسا میں ہوں ڈھونڈ لوں ہمتا اپنا سا
ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرہ نوازی ہے ‏ دیا بندہ کو اپنے اس نے خود آداب اپنا سا

آنا تو خفا آنا۔ جانا تو رلا جانا ‏ آنا ہے تو کیا آنا۔ جانا ہے تو کیا جانا
کیا طبع میں جودت ہے چٹ دل کی اڑا جانا ‏ ہونٹوں کا یہاں ہلنا۔ وہاں بات کا پا جانا

اتنا پسند کیوں آیا۔ انہوں نے کہا دوسرے مصرع میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے کہ وہ اُسی کا حق ہے۔ میر شریف حسن صاحب بولے کہ آپ کو کیا حاجت ہے۔ وہ نہ ہوا اور لگا لیا۔ فرمایا۔ نہیں۔ وہ استاد تھے۔ جو انہوں نے کہا وہی لفظ ہو تو ہو۔ اور ہو تو نہیں ہوتا۔

ترے ہاتھ سے دل کوئی آوارہ اے گردش ٹھیریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہیں ٹھیرے دل نہ ٹھیریگا

جو تحریک کرے ناقۂ لیلیٰ سراہوں نہ ٹھیرے گا
اگر سو کوس ہو گا نجد تو مجنوں نہ ٹھیریگا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھیریگا

گرا ہوں چشم ساقی سے مری تصویر میں بھی گر
بناویگا کوئی جام مے گلگوں نہ ٹھیریگا

سر بالیں اے ہمدم کوئی دم تو ٹھہرنے دے
ابھی سے کیا کہوں حال دل محزوں نہ ٹھیریگا

بتاتے ہو علاج اشک جو اُس خال کا بوسہ
طبیبو آب نزلہ ہے کہ بے افیوں نہ ٹھیریگا

یہی ہے دل کی بیتابی تو بعد از مرگ بھی قاتل
نہ ٹھیرا ہے زمیں پر عاشق محزوں نہ ٹھیریگا

(۱) مجنوں [illegible] لیلیٰ سے [illegible] ٹھہر جا

قتل کرتی ہے نگہ شہرہ نگاہ یار کا
سچ کہا ہے باڑ کا لے نام ہو تلوار کا

گر دکھاؤں عالم اپنے نالہائے زار کا
کام لوں ہر تار مو سے تار موسیقار کا

کوچۂ زلف بتاں میں دل پڑا ہوگا کہیں
پوچھتے ہو ٹھکانا اُس خدائی خوار کا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں
گر پڑے سایہ مرے بتخانہ کی دیوار کا

آنسوؤں میں شمع بالیں سے برستے ہیں پھول
میں شہید ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا

استخواں اس سوختہ جاں کی نہ کھانا زینہار
اے ہمایہ رزق ہے مرغان آتش خوار کا

نالۂ بلبل میں گر پیدا اثر ہو جائے گا
خندۂ گل۔ خندۂ زخم جگر ہو جائے گا

کشتی بحر شہادت ہے ترے بسمل کو تیغ
اب ادھر سے دیکھنا دم میں اُدھر ہو جائیگا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر
کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائیگا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار
آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

بعد قافِ عشق تھا جو درسِ مکتب خانہ تھا | کاف کُن کے ماسبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا

مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا | ٹکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا

بل بے گریہ گِل زمیں ہو کر قدم گڑنے لگا | اور قدم اُکھڑے تو کیا دیکھا بھنور پڑنے لگا

دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا | طائرِ جاں جو رفتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

ضبطِ گریہ نے تماشہ طرفہ تر دکھلا دیا | چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا

ہاتھ آکر دلِ وحشی تو کہیں کی چھوٹ گیا | ہوسِ صید سے صیاد کا جی چھوٹ گیا

لگا ہے تیر دل پر تو کس کافر کی مژگاں کا | نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا

دل کہاں جس پر گماں ہو نقشہ تصویر کا | ہے کوئی سینہ میں خوں آلودہ پیکاں تیر کا

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کریگا | مرگِ دقضا کو تیرا عاشق نہ ہے مریگا

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا۔ کودنا | ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا۔ اچھلنا۔ کودنا

مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا | کافر کی دیکھو شوخی۔ گھر میں خدا کے مارا

اے دل نہ راہِ عشق کشادہ سمجھ کے جا ۔۔۔ یاں اژدہا ہے ہر خطِ جادہ سمجھ کے جا

عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں تو لا ۔۔۔ اور اسکو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

اگر رقصاں نہ سر اپنا سنان یار پہ دیکھا ۔۔۔ تو سربازی کا اپنے کیا تماشہ اپنا سر دیکھا

جہاں باریک بینی تو ناتوان میں اسقدر دیکھا ۔۔۔ ہلال انتیسویں کا سب کو منظورِ نظر دیکھا

رہیگا تشنہ لب سیراب یہ بسمل نہ ہو دیگا ۔۔۔ میسر جب تک آب خنجرِ قاتل نہ ہو دیگا

کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہ ہو دیگا ۔۔۔ اگر مہر گواہی میرا داغِ دل نہ ہو دیگا

چاندنی نے شب تجھ بن روپ دکھایا تھا ۔۔۔ مجھ کو ماہتابی پر دھوپ میں بٹھایا تھا

بعد فراق کوئی دن ۔ ایسا نہ وصل کا ہوا ۔۔۔ وہ کہیں تم کو کیا ہوا ۔ ہم کہیں تم کو کیا ہوا

آدمی گر ہو مکدر ۔ کیا قصور ادراک کا ۔۔۔ خاک کا پتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا

کیوں کہہ کے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا ۔۔۔ کہ جو تجھے کہنا ہے ۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ دیکھیں کس طرح ہے روز فرقت دیکھ کر جیتا ۔۔۔ کہ جو عاشق ہو تیرا تیری صورت دیکھ کر جیتا

جب قیامت قد ترا اے رشکِ گلشن بن گیا ۔۔۔ اخترِ صبحِ قیامت خال گردن بن گیا

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا ۔۔۔ ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا

اگر داد رسے گنہگار کو بے قاتل نہ ہو دیگا

جوشِ مستی ہے عجب قافلہ جس میں کہ نہیں — بے شکست ایک صدائے جرسِ جامِ شراب
محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا! — ٹوٹا گر اک دلِ آتش نفسِ جامِ شراب
رات میخانے میں ساقی جو نشے میں بہکا — خسِ شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب
مرغِ دل نرگسِ میگوں کی ہے مژگاں میں اسیر — تازہ مضموں ہے جو باندھوں قفسِ جامِ شراب
دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہو سو ٹکڑے — نام لکھ دے جو کوئی میرا پسِ جامِ شراب
ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے — رات بھر گشت کرے ہے عسسِ جامِ شراب
نوشدارو سے بھی بہتر ہے دمِ رنجِ خمار — ساقیا شربتِ فریاد رسِ جامِ شراب
بے خبر قافلۂ عیش گزر جاتا ہے — بے زباں ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب
ابلقِ چشمِ سیہ مست کو تیرے دیکھا — ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرسِ جامِ شراب
سمجھے میخانہ کی خلوت تو نہ بیٹھے ہرگز — سرِ جمشید پہ آ کر مگسِ جامِ شراب
نخلِ مینا سے خدا جانے کہ ساقی کس کو — پہلے پہنچے ثمرِ پیش رسِ جامِ شراب
بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا — عکسِ مژگاں ترا میکش ہے خسِ جامِ شراب
مجھ کو اس بوسۂ دنداں نے پس از بوسۂ لب — دے نقلِ نمکیں چند پسِ جامِ شراب

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغرِ گل
لبِ نازک کو ہے اس کے ہوسِ جامِ شراب

ہو ہجر بدلوں جو ہو وصل ایک دم نصیب — کم ہوگا کوئی ہم سا بھی الفت میں کم نصیب
ہوں میری خاک کو جو تمہارے قدم نصیب — کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب
بہتر ہیں لاکھ لطف و کرم سے ترے ستم — اپنے زہے نصیب کہ ہوں یہ ستم نصیب
ماہی ہو یا کہ ماہ۔ وہ دے ایک یا ہزار — بے داغ ہو نہ دستِ فلک سے درم نصیب
ہے خوش نصیب عشق میں اے بوالہوس وہی — جس کو کہ غم پہ غم ہے الم پر الم نصیب
غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو — ہر دم ہے تجھ کو سیرِ وجود و عدم نصیب
سو بار جوں قلم ہو زباں شمع کی قلم — اک حرف ہو نہ مثلِ زبانِ قلم نصیب

ہوئے انسان ہم در محبت کے لئے پیدا | فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

یارب یہ اس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوا | جس کا برا ہو ان کو یہ کہنا بھلا ہوا

آج غصہ سے ادہر کو دستِ قاتل اٹھ گیا | بس بھروسہ زندگی کا ہم کو اے دل اٹھ گیا

آخر گلِ اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی | پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہو گیا نامۂ شوق ان کو سب از بر میرا | کھا گئے ذبح جو وہ کر کے کبوتر میرا

کچھ رازِ نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا | گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

سبزۂ خط سے خضرِ طریقت رکھتا رسم الخط ہے جدا | خطِ بتاں ہے خطِ الٰہی لکھے موسیٰ پڑھے خدا

ردیف بائے موحدہ

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پسِ جام شراب | لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جام شراب
لب تک اسکے جو ہوئی دست رسِ جام شراب | بن گیا خال لب اس کا مگسِ جام شراب
جیبِ کا مستی میں وہ صاحب ہوس جام شراب | عکس خال اپنا جو سمجھا مگسِ جام شراب
دل جو ہے جام شراب ہوسِ جام شراب | اس میں ہے خال سویدا مگسِ جام شراب
ساغر دل کو جو ہو دسترس جام شراب | دست ساقی میں ہو وقتِ ہوسِ جام شراب
بازگشت اپنی ہے یوں جانبِ قسام ازل | جیسے ساقی کی طرف بازپسِ جام شراب
دست بدستی کی لوٹ کے فریاد بہت | نہ ہوا کوئی بھی فریاد رسِ جام شراب

تائے مثناۃ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجام محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت

ہیں داغ محبت درم و دام محبت
مژدہ ہے تجھے اے خواہشِ انعام محبت

ہر روز اڑا دیتا ہے وہ کرکے تصدق
دو چار اسیر قفس و دام محبت

مانند کباب آگ پہ کرتے ہیں ہمیشہ
دلسوز ترے بستر آرام محبت

کاسہ میں فلک کے ہے اک بوند نہ زہراب
دم بھر کھنچے اگر تشنہ لب جام محبت

خاکستر پروانہ دکھا دوں میں اڑا کر
پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجام محبت

شوق حرم کوچہ قاتل میں کفن کو
ہم جانتے ہیں جامۂ احرام محبت

کی جس سے رہ و رسم و محبت اسے مارا
پیغام قضا ہے ترا پیغام محبت

نے زہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو
ہیں بادہ کش عشق و مے آشام محبت

ایماں کو گرو رکھ کے اگر کفر کرے مول
کافر ہو گرویدۂ اسلام محبت

کہتی گئی وفا نوحہ کناں نعش پہ میری
سونپا کیے تو نے مجھے ناکام محبت

معراج سمجھ ذوق تو قاتل کی سناں کو
چڑھ ہو سر کے بل اس زینہ سے تا بام محبت

جنوں نے دی دکھا جو سر خار زار پشت
پشت اب ہجوم خار سے ہے پشت خار پشت

تیر دل کے گر ہو تجھ مژگاں سے خار پشت
کھجلائے وہ پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی سے تا بماہ ہیں دست فلک سے داغ
واں داغدار سینہ ہے یاں داغدار پشت

پیدا فلک سے ایک نہ ہو تجھ سا ماہوش
نہ پشت تک تو کیا کہ نہ تا نہ ہزار پشت

بار زمانہ پشت پہ لے اشتر کی طرح
سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایک بار پشت

ہو جاتی ہے زیادہ گرانباری گناہ
پیری میں ہو خمیدہ نہ کیوں زیر بار پشت

سینہ سپر جو منہ پہ ہیں تیغ نگاہ کی
دکھلاتے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

مجنوں سے سیاہ خیمۂ لیلیٰ نے کہا بہر
اے خوش نصیب تجھ کو یہ خلوت جہاں نصیب

دے جس کو اپنے ہاتھ سے تو ایک جام آب
ساقی وہ ہے خدا نے اُسے شکل ہے نصیب

ایماں سے تیرا شوق لقا جب تک یہ نہ ہو
دیدار اُسے خدا کا نہ ہو اے صنم نصیب

جاتے ہیں کوئے یار کو جو اپنے ہو سو ہو
اے ذوق آزماتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب
کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

حشر تک دل میں رہے اس سروِ قامت کی طلب
یہ طلب ہے اپنی یارب کس قیامت کی طلب

دل سلگ جائے نہ جب تک اور بھڑک جائے نہ جان
کم نہ ہو قلیاں کش سوزِ محبت کی طلب

واسطے نظارۂ قاتل کے فرصت چاہیے
اور یہاں فرصت کہاں جو کیجیے فرصت کی طلب

ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا
ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب

دور رہ اور دیر مت رہ سامنے مثلِ ہلال
شہر میں تجھکو اگر ہے اپنی شہرت کی طلب

بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اس قدر اپنی کہ ہے
غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب

جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے
کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب

ہو کے دل غمزہ کا بسمل ناز پر دیتا ہے دم
کرتا ہے آفت طلب آفت پہ آفت کی طلب

یاد ہیں صاحب شکم کی پہلی دونو منزلیں
یاں کہاں وسعت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار
کر کشادِ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

کرے ہے شرع کا پاس نمک مدام شراب
حرام ہے نہیں لیکن نمک حرام شراب

یہ ایسا ماہ مبارک وہ ایسا کارِ سعید
شروع دیکھ کے کیجئے مہِ صیام شراب

عوض ہے نشۂ دنیا کا ذوق عقبیٰ پر
دوام بکتی ہے اس میکدہ میں دام شراب

اُس بُتِ نامہرباں کو ہے پسند اتنا رقیب
وردِ اسمائے الٰہی میں بھی ہے تو یا رقیب

وہ مثل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی؟ خضر نے
عاشق رسوا کے خط میں کیا تکلف چاہیے

لے گیا خطِ ذقن دل کو سوئے گرداب کھینچ
چار حرف اک پرچہ پہ دو لو نہیں القاب کھینچ

حائے حطی

فرقت کی رات جی چلے ہم تازمان صبح
ہوئی اذان گور ہماری اذانِ صبح

پُرنور ہے ترا رخِ سیمیں بسانِ صبح
آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی کشانِ صبح

تارِ شعاعِ مہر بھی رنگِ شفق میں روز
ماتم میں ہیں مرے مژہ خوں چکانِ صبح

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکئے
مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوانِ صبح

پیسے یہ دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے
انجم کے جتنے دانت تھے زیبِ دہانِ صبح

ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں رات دن
یہ میرے نالۂ شب و آہ و فغانِ صبح

یوں پہنچے اُس کی زلف میں عارض سے جان و دل
منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

اے ذوق کچھ نہ پایا شبِ وصل کا مزہ
یا آج صبح ہم نہیں یا طائرانِ صبح

ٹھیری ہے اُنکے آنے کی اب کل پہ جا صلاح
اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح

منظور چشمِ یار ہے سب عینِ مصلحت
پوچھے بلاکشوں کی کسی سے بلا صلاح

سیدھے ہی جائیں کعبہ کو بیت الصنم سے ہم
گر پھیر دے نہ وہ صنمِ کج ادا صلاح

اس چشمِ مست کے ہیں خراباتیوں میں ہم
تقویٰ کجا و زہد کجا و کجا صلاح

کیا جان میری جان کے درپے وہ ہو سکے
غمزہ سے تیرے پوچھے نہ جبتک قضا صلاح

اُس بد معاملہ سے بھلا کیا معاملہ
کس بد صلاح نے تجھے دی یہ دلا صلاح

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو
دیتا ہے ایسی کوئی بھی مردِ خدا صلاح

ڈر ہے یہی کہ ایسا نہ ہو بعد مرگ بھی　　لگنے نہ دے زمیں سے دلِ بیقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

جیم عربی

ہے وہ آزارِ محبت سے دلِ زار کو رنج　　جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

دیدۂ آبلۂ پا کا یہی ہے رونا　　کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو　　ہے جو ناکامیٔ فرہاد کا کہسار کو رنج

کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا　　اور ہوتا ہے سوا مرغِ گرفتار کو رنج

شربتِ خضر بھی دے ہے روشِ تلخیٔ مرگ　　تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج

راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونو لیکن　　ہاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

سخت جانی سے ہوں لاچار وگرنہ مجھسے　　نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج

سُن کے فریاد قفس میں مری خوش ہوں بیدرد　　یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغِ گرفتار کو رنج

ہوش کو بیچ کے لے دارو بیہوشی تو
ذوقؔ بیہوش کو آرام ہے ہشیار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج　　خط بھیج یا نہ بھیج۔ زبانی خبر تو بھیج

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج　　کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

جیم فارسی

اس پری کو تو نہ لے حیف اے دلِ بیتاب کھینچ　　اور لیوے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

یوں گلوئے تشنہ میں وہ آبِ خنجر ہو فرو　　جیسے تفیدہ زمیں نے ایک دم میں آب کھینچ

غزل کہہ کر یہ قصیدہ جلسہ خاص میں سنائی۔ اور خلوت میں اتنا ہی کہا کہ ان تو اتنی دور ان کے مضامین کو دیکھئے جوان سے بڑھ کر کہے گا تو میں پھر دیکھونگا۔

نواب نے کہا۔ ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اس میں پڑھیے یہ سن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہوگئے۔ نواب نے سن کر آدمی دوڑایا۔ وہ ہرگز نہ پھرے آدمی نے جاکر پیغام پہنچایا۔ اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اس [illegible] میرے ہاتھ آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے:

ہو زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ
قطروں سے پر عرق کے [illegible] سمن کی شاخ

اس قد کو کیونکہ کہیے نہال چمن کی شاخ
لائیگی وہ کہاں سے ادا یاسمین کی شاخ

ابرو پہ اس کی خال ہے کیا زاغ شوخ چشم
سمجھا ہے اپنی شاخ نشیمن ہرن کی شاخ

دکھلائی اس کے سرمہ دنبالہ دار نے
آنکھوں سے ہم کو نرگس [illegible] کی شاخ

ناوک اس تیغ کی ہے کوئی نسترن کا پھول
تانا نہ یکی سینہ پہ ہے نسترن کی شاخ

دل باغ وعشق نخل کہ جس میں ہزار ہا
حسرت کے برگ الم کے ثمر ہیں [illegible] کی شاخ

بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پُر جفا
ممکن نہیں کہ لائے ثمر [illegible] کی شاخ

کہتی تھی چوب تیشہ سری طرح ایک دن
سوکھے گی نخل آرزوئے کوہکن کی شاخ

جیسے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لئے
ممنون باغ میں ہے نہایت [illegible] کی شاخ

لچکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز
جنباں ہو جوں نسیم چمن سے سمن کی شاخ

حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروئے یار پر
گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکر ہرن کی شاخ

ہے جوش پارہ پارہ دل ہر مژہ پہ یوں
لائے اُٹھال کر لیں جس طرح گلشن کی شاخ

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار
ہے یہ بھی اس کے ایک شجر مکر و فن کی شاخ

دیتی ہے سر پہ بلبل آتش نفس کو جا
رکھتی ہے کیا چمن میں ہوس سوختن کی شاخ

ہے نعش تیرے کشتہ بیکس کی دشت میں
گویا کہ اک نشیمن زاغ و زغن کی شاخ

جز شمع استخوان صفا کیش زیر خاک
دیکھی نہ ہے کسی گل صبح کفن کی شاخ

کرتی شراب اُسی کو ہے تیری نگاہ مست
جس کو کہ دیکھتی ہے نکوکار با صلاح

یارب ہو دل کی خیر۔ کہ کچھ کرتے ہیں آج
چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا اصلاح

منظور اگر ہے قتل مرا غیر سے نہ پوچھ
ہے تو صلاحِ نیک میں کیا پوچھنا صلاح

قلابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو
اُس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح

یہ ہی مرا رفیق ہے۔ یہ ہی مرا شفیق
لوں کس سے واں کے جانے کی دل کے سوا صلاح

اے ذوق جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

خائے معجمہ

اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خوانین رامپور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے ۔ میر منزل میں صدر الصدور ہو گئے تھے۔ شعر و سخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ استاد مرحوم کا عالم جوانی۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعرا کی نشست نواب کے ہاں رہتی تھی۔ استاد کی اُن سے شناسائی تھی۔ مگر وہ اُنہیں استاد مانتے تھے۔ شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے۔ اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملایا۔ اپنے شعر سنائے۔ اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ مبصرانِ سخن کے نزدیک آج فنِ شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنو میں۔ شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں۔

نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی۔ اور ناسخ کی غزل سنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر استاد کو بلایا۔ حال بیان کیا۔ اور غزل کی فرمائش کی۔ استاد نے کہا کیا حاصل؟ عبث کاوش ہے۔ اور انجام کاوش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو استاد نے

لکھ ذوق اُس کی مدح کہ جس کی ثنا سے ہے
سرسبز تیرے گلشنِ باغِ سخن کی شاخ

وہ کون؟ شاہ اکبرِ ثانی کہ جس کو روز / نذرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ
اُس کی دعائے حرز پڑھے جوشِ غنچہ سے / تسبیح ایک لے کے عقیقِ یمن کی شاخ
کردے جو وہ نہال تو لائے ابھی نکال / پروین کا خوشۂ گاوِ سپہرِ کہن کی شاخ
پھر تصدق آئے زرِ گُل کو لے صبا / کرنے لگے نثار گُہر یاسمن کی شاخ
پہنچائے اُس کا مژدۂ صحت جو باغ میں / سجدہ میں پھر شکر جھکے نار دن کی شاخ
ہمسر ہے آج نخلِ ارم سے ترے شجر / ہم قد ہے آج یوسفِ گُل پیرہن کی شاخ
گرمیٔ عدل اُس کی اگر ہو ستم گداز / پگھلے برنگ شمع ابھی کرگدن کی شاخ
مطلع وہ پر بہار لکھوں اس کی مدح میں / مصرع کو جس کے سُن کے کٹے نسترن کی شاخ

تیرے بہارِ فیض سے نخلِ کہن کی شاخ
سرسبز یوں ہے جیسے کہ سروِ چمن کی شاخ

تیرے سحابِ لطف سے سیراب ہو اگر / ہمسر ہو شاخِ نخلِ ارم سے ہرن کی شاخ
شاہا یہ تیرا دستِ سخا باغِ دہر میں / گویا کہ نکلی ہے کرمِ ذوالمنن کی شاخ
گر تیرا حفظ ہو چمن بندِ روزگار / آبِ مژہ سے سبز ہو سرِ چمن کی شاخ
صرصر کا سارا خاک میں مل جائے زور شور / چھوڑے گر آشیانۂ مرغِ چمن کی شاخ
دیکھے جو تیرا قوتِ بازو تو لوٹ جائے / وقتِ کشش کمانِ سپہرِ کہن کی شاخ
تیرے عصا کو اس سے میں تشبیہ کیونکہ دوں / ہے شاخِ سدرہ ایک کنارِ کہن کی شاخ
تاثیر تیرا زور ضعیفوں کو دے اگر / ٹوٹے نہ پیلتن سے بھی نازک بدن کی شاخ
بلکہ کمند مار کے ہاتھی کو کھینچ لے / خرطوم سے لپٹ کے بصورت رسن کی شاخ
منظور گر خزانہ میں ہو تجھ کو شاخِ زر / طیار ہو وہیں زرِ خور سے کرن کی شاخ
ہاتھی کو تیرے چاہئے لکڑی تو دشت میں / خرطوم سے اکھاڑ لے وہ کرگدن کی شاخ

نہ برگ ہے نہ غنچہ ۔ نہ گل ہے نہ ہے ثمر — ہیں خشک طالعی سے ہوں گویا ہرن کی شاخ

ریشم کا لچھا ہاتھ میں اُس کے نہیں دلا! — یہ یاسمن کا سانپ ہے وہ یاسمن کی شاخ

چھوٹے جلانے والوں سے وحشی نہ مرکے بھی — اکن کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

تشبیہ کیونکہ دوں مژۂ خوں فشاں سے میں — مرجاں کی شاخ کب ہے بھلا اس پھبن کی شاخ

صیاد میں چمن سے ہوں مایوس ۔ چاہیے — چوبِ قفس بھی ہو تو نہالِ چمن کی شاخ

باریک ہیں بتاتے ہیں جسکو تری کمر — یا کوئی موئے تن ہے وہ یا موئے تن کی شاخ

گل خوردتن مرادم روئیدگی، مُو — ہے آشیانِ بلبلِ گلشن وطن کی شاخ

دیوے خراش دل کو نہ کیونکر وہ نازنیں — رکھتی ہے خار سینکڑوں نازکبدن[1] کی شاخ

دکھلائے باغ میں قدِ رعنا جو اپنا تو — قمری کے حق میں دار ہو سروِ چمن کی شاخ

موذی کو سرکشی سے میسّر ہوا اعتبار[2] — نکلے ہے طولِ عمر سے مارکہن کی شاخ

ہوتی ہے وحشیوں پہ پس از مرگ بھی شکست — زور آزمائیوں کے لئے ہے ہرن کی شاخ

شاخِ نبات کاٹنے قلیاں نہ منہ لگائے — ایسی مصاحبت سے لگی اُس دہن کی شاخ

ہے فیض سے وقار کے میری نگاہ میں — جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ

آخر یہ دستگیریِ تیشہ نے پھل دیا — کی قطع نخلِ آرزو سے کوہکن کی شاخ

بدخصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک — اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پُرجفا — آخر کو زیرِ ارّہ کٹی کرگدن کی شاخ

بیمارِ چشمِ دلبر آہو نگاہ کو — شاخیں بھی گر لگائیں تو لیکر ہرن کی شاخ

ہر صید کی کمر سی گئی ٹوٹ جس گھڑی — ٹوٹی کمانِ دلبرِ ناوک فگن کی شاخ

تاثیرِ بیکسی سے ہو سارا درخت خشک — ڈالے جو سایہ نعش پہ اس بے کفن کی شاخ

یہ سیبِ باغِ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی[3] — ہے بے مشابہت سے لگی اس ذقن کی شاخ

سوفار کا دہن جو ہوا خونِ دل سے سُرخ — تیر اس کا بن گیا ہے گُلِ خندہ زن کی شاخ

[1] نازک بدن ایک قسم کا بیر ہوتا ہے اس کے درخت کو بھی نازکبدن کہتے ہیں۔

[2] فزوں تر ہوا اعتبار۔

[3] نسخہ: یہ سیبِ باغِ خلد کو اتنی اوج قدر ۔ لیکن مشابہت سے لگی اُس دہن کی شاخ۔

کل اُس سے ہم نے ترکِ ملاقات کی تو کیا ۔ پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک ۔ غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے ۔ ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

پروانہ گردِ شمع کے شب دو گھڑی رہا ۔ پھر دیکھی اُس کی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر، دیکھ جلد آ ۔ آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اُس نے نہ دیکھا اِدھر تو کیا ۔ آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوقؔ کس طرح ۔ پھر تو نہ ٹھہرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

ایک قدیم الخدمت محمد بخش نام استاد مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ بڈھا بھی تھا۔ مسخرا بھی تھا۔ سامنے باورچی خانہ میں سب کا اتالیق بنا بیٹھا رہتا تھا۔ اور باتیں بنایا کرتا تھا۔ اور یہ حق ہے کہ استاد مرحوم کی اور ان کے والد کی خدمتیں کرتے کرتے وہ بھی ایک رتن ہو گیا تھا۔ سب کے کاموں کو اصلاح دیتا تھا۔ میں عنفوانِ شباب میں پہنچ گیا تھا۔ پھر بھی اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جس طرح بچپن میں مجھے کھلاتا تھا اور ہنساتا تھا۔ استاد کا وہ عالم اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ خاموش اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ کوئی بات اس کی بھی کان میں جا لگتی ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی خوش ہوتے تھے تو دو ایک گالیاں بھی دیدیا کرتے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ایک آدھ دھول بھی لگا دیتے تھے۔ اُسے پرانے استادوں کے بہت شعر یاد تھے استاد مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے۔ جوانی میں سورج مکھی پر شعر پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے شیخ سے چرچا سنا کہ رات کو فلاں بازار میں سورج مکھی پر استاد ذوق کے نوکر نے بھی شعر پڑھے۔ بڈھا تھا۔ پھر بھی خوب پڑھا۔ اور شعر بھی خوب تھے۔ ایک بولا آخر استاد کا نوکر تھا صاحب۔ خوب کیوں نہ پڑھتا۔

میں حسبِ معمول شام کو استاد کے پاس گیا۔ وہ حرم سرا میں گئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا محمد بخش! کل سورج مکھی پر شعر پڑھے تھے؟ پہلے تو مکر گیا۔ پھر بڑی مشکلوں سے قبولا

دانتوں کو اسکے دیکھ کے ہو لرزاں بہ شکل بید
صد دلو کوہ پیکر و البرز تن کی شاخ

گلوں سے تیرے بڑھ نہ سکے یکقدم صبا
سو تازیانے اتنے نہال چمن کی شاخ

ہو تیرا فیض اگر چمن آرائے باغ دہر
آب تبر سے سبز ہو نخل کہن کی شاخ

نالاں ہیں تیرے عدل سے خونریز اسقدر
مانند نے ہو گرم فغاں کرگدن کی شاخ

برسائے جبکہ لعل و گہر تیرا دست جود
محتاج ابر ہو نہ نہال چمن کی شاخ

شاداب آب لعل یمن سے ہو شش گل
سیراب ہووے آتش زر معدن کی شاخ

یاں خشک ہے پاس شرع ترے عہد میں کہ آپ
ساغر بکف نہ ہووے نخل خزاں رزان کی شاخ

پیدا ہو بادہ خوار کی تعذیر کے لئے
نخل کدو سے تاک میں سو تر رسن کی شاخ

یہ ذوق کی دعا ہے کہ تا باغ دہر میں
سرسبز شعر تیرے ہو نخل سخن کی شاخ

جب تک کہ ہووے گردن مینا کی طرح سے
نخل نشاط ساقی سیمیں بدن کی شاخ

نخل حیات تیرا تروتازہ ہو مدام
جیوں موسم بہار میں نخل یمن کی شاخ

دال مہملہ

پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ ان کی غزل لکھ کر بیٹھے تھے۔ دل لگ گیا۔ اور چند قافیے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھے نظر آئے۔ فرمایا ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سنائی:۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہو گی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا ہم نے گریہ کو اپنے کہ لگ گئی
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملایم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

اس لعل لب کے ہم نے لئے بوسے اس قدر
سب اڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینہ سے ہر آہ بے اثر
لب تک جو پہنچی بھی تو چڑھی دو گھڑی کے بعد

ذال معجمہ

سنہ ۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں یہی طرح ہوئی تھی۔ شاگرد آئے اصلاحیں لیگئے مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں۔ دیکھ کر فرمایا۔ دیکھو قافیہ کو پہلو نہیں بٹھا سکتے زمین ماپتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام بے اصول تو نہ ہو۔

مژدۂ قتل سے اس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادیٔ تن کا کاغذ

گو نہیں پیش ہو جب دفتر تن کا کاغذ
ہو سیاہ گو سفیدیٔ کفن کا کاغذ

بن گیا عکس سے اس شوخ گلستاں رخ کے
صفحۂ آئینہ تصویر چمن کا کاغذ

کیا کرے خانۂ گیتی کا کوئی دعویٔ ملک
نام پر کس کے ہے اس قصر کہن کا کاغذ

لکھیں اس چشم کے وحشی کے لئے گر تعویذ
اہل تسخیر کریں پوست ہرن کا کاغذ

رقعہ شادیٔ شہادت کا ہو خوں سے رنگیں
ایسی شادی کو ہو ایسا ہی پھبن کا کاغذ

سینۂ صافوں کو زمانہ کے ہے ہاتھوں سے شکست
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

ورق چرخ ہو گو نسخۂ آشوب۔ نہ ہو
سرمۂ چشم مہ سیم بدن کا کاغذ

یوں قفس میں کوئی ہم تک ہے پہنچتا گلبرگ
جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ

ظاہر آرا نہ کتابوں سے ہو۔ در دوزخ کے
گرنہ آتش میں لباس اپنے بدن کا کاغذ

جلسازی پہ زمانہ کی گواہی دے ہے
مہری و سادہ مہ چرخ کہن کا کاغذ

مہر وہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آئے ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب اسکے دہن کا کاغذ

ذوقؔ دل سوختہ دیواں لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیٔ سخن کا کاغذ

حولِ دل کا مجھے کیا دیتے ہو لا کر تعویذ
اس کا خط لاؤ کہ رکھوں میں بنا کر تعویذ

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج
لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بنا کر تعویذ

میں نے پوچھا۔ کیا کیا پڑھے تھے؟ بڑے غمزوں سے سودا کی ایک غزل سنائی۔ میں نے کہا استاد کے شعر بھی تو پڑھے تھے! کہا یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے۔ میں نے کہا۔ کون؟ کہا۔ یہی میاں ابراہیم۔ میں نے کہا۔ بھول کیونکر گئے۔ کہا پہلے اچھے کہتے تھے۔ اب تو کچھ اور ہی ڈھب کے کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ خیر۔ جو شعر تو نے وہاں پڑھے وہ سنا دے۔ کہنے لگا۔ لڑکوں کے سامنے شعر نہیں پڑھا کرتے میں نے کہا اچھا ایک ہی پڑھ دے۔ بڑی خوشامدوں سے یہ مطلع پڑھا۔

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

اتنے میں استاد آئے۔ میں نے یہ مطلع سنایا۔ فرمایا۔ تمہارے ہاتھ کہاں سے آیا۔ میں نے کہا۔ محمد بخش نے ابھی پڑھا ہے۔ حضرت! آج رات کو سورج مکھی پر اس نے شعر پڑھے تھے۔ مسکرا کر بولے۔ کیوں بے گنجے فلاں فلاں تو ہمارے شعر سورج مکھی پر پڑھا کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو کوئی شعر اس کا یاد ہے فرمایا مدتوں کی باتیں ہیں۔ اب کہاں یاد۔ پھر کہا۔ یادداشت کے جزو میں لکھ لو۔ کتاب میں نہ لکھنا۔ میں نے کہا۔ حضرت! کیوں؟ فرمایا لڑکپن کی باتیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی فرمایش سے کہہ دیتے تھے۔ فرصت میں بیٹھیں گے تو اپنے رنگ میں لے آئینگے میں نے وہی لکھ لیا۔

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک
دم گھٹتا ہے سینہ میں دم شدت گریہ

دیکھا نہ کبھی ہم نے دلِ اہلِ صفا بند
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہوا بند

ایک دن والد مرحوم کے پاس آئے۔ ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں۔ جن میں نہیں۔ ان کے لئے طرحیں تجویز ہوں۔ ردیف دال کے لئے۔ یہ مصرع بھی طرح ہوا۔ ع

سینہ داغِ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید

خوب روئے رات ہم سنسان ہاموں دیکھ کر
یاد آیا ہم کو مجنوں بید مجنوں دیکھ کر

اُڑ گئے اک آن میں جادو سے بابل کے دھوئیں
سرمہ آلودہ تری چشمِ پُرافسوں دیکھ کر

دیکھ کر غیروں میں مہتابی پر اُس مہوش کو رات
آہ کی اک دل سے ہم نے سوئے گردوں دیکھ کر

سچ کہا ہے آگے کالے کے نہیں جلتا چراغ
چھپ گیا مہ رُخ پہ تیرے زلفِ شبگوں دیکھ کر

بل بے میرے ساغرِ سرشار وحشت کا نشا
چھپ گیا خم میں مری سوئے فلاطوں دیکھ کر

آگئیں ہم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں
نوکِ مژگاں پر مرے اشکِ جگرگوں دیکھ کر

ہوئے نالہ اپنا وہ اک سروِ غیرت سر تہ ہے
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قدِ موزوں دیکھ کر

قتل کو کس کے چڑھائی تیغ تو نے سان پر
اُترا آنکھوں میں جو زخموں کی خوں دیکھ کر

لے گیا دل کون میرا ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

کہا پتنگ نے یہ دارِ شمع پر چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مرئے کسی کے سر چڑھ کر

مرے خیال پہ وہ چشمِ فتنہ گر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ نئی آئی لڑنے گھر چڑھ کر

دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اُتر چڑھ کر

ستمگروں کی کشاکش میں آبرو ہو ہوا
کہ ہوتی سان پہ ہے تیغ تیز تر چڑھ کر

الٰہی خیر ہو مانندِ شعلۂ سرکش
پھر آیا یاد کے گھوڑے پہ وہ اِدھر چڑھ کر

ہنر شناس کو دکھلا ہنر کہ خوبیِ زر
اگر کھلے ہے تو صرّاف کی نظر چڑھ کر

کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا
کہ دور آپ کو کھینچے ہے تیرے سر چڑھ کر

ترا مکاں تو نے کیا لامکاں میں گو دیریں
امیدِ وصل ہے ہم بامِ عرش سا پر چڑھ کر

بنائے نفس کو۔ اور کر لے اپنے غصہ کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ہماری خاک پہ برپا ہے ذوق فتنۂ حشر
سمند ناز پہ کون آیا فتنہ گر چڑھ کر

جاں ہوا یوں ہولی اُس خال کا بوسہ لیکر
جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی لٹکا لیکر

تم نے تعویذ نشانی جو دیا تھا اپنی
اب تلک جوش میں ہے خون شہیدِ غم عشق
جلتوائی نہ پڑی یار میں اور غیروں میں

لے گیا کوئی موکل وہ اُڑا کر تعویذ
دیکھ لو تم سرِ مرقد سے اٹھا کر تعویذ
سینکڑوں خاک کئے ہم نے جلا کر تعویذ

رائے مہملہ

نکہ نہیں حرف دلنشیں تھا۔ دہن کی تنگی سے تنگ ہوکر
نکل کے رستہ سے چشم فتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہوکر
پھر آیا لو وہ لگا رخوتی ادھر کو سرگرم جنگ ہوکر
کہ جس کے ہاتھوں سے اُڑ گئے سر ہزاروں سیدھی کا رنگ ہوکر
وہ چشمِ مخمور اک نظر سے چبھوئے لاکھوں خو میت سے
تو ہو رواں ہر رگ جگر سے لہو۔ مے لالہ رنگ ہوکر
جو رنگ اُلفت سے آشنا ہیں۔ وہ گر بُرے بھی ہیں خوشنما ہیں
جو رنگ ہی ست گراں بہا ہیں۔ عقیق و یاقوت سنگ ہوکر
جو سمجھیں عشقِ بتاں کو ایماں انہیں رہا کفر و دیں ہے یکساں
پہنچتے کعبہ میں وہ مسلماں ہمیشہ چین و فرنگ ہوکر
صفائی دل کی یہی ہے صورت۔ کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائینگے بالضرورۃ۔ اس آئینہ میں یہ زنگ ہوکر
غزال رم دیدہ بن گیا ہے۔ جو خواب آنکھوں میں تو کیا ہے
کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پلنگ تجھ بن پلنگ ہوکر
ہوئے جو یکرنگ۔ ان کو زیبا نہیں جہاں میں رعونت اصلا
کہ پایا گُل نے ہے نام رعنا تو اس چمن میں دو رنگ ہوکر
حلاوت شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری
مزے سے گزرتی اگر گزاری کسی نے بے نام و ننگ ہوکر

[illegible] آنکھوں کے رستہ [illegible] دل میں [illegible] خدنگ ہوکر

کام یہ تیرا ہی تھا رحمت کے اے ابرِ کرم
ورنہ جائے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر؟

جس نے ہو لذت اٹھائی زخمِ تیغِ یار کی
کب وہ مرہمداں کو ڈھونڈے نمکداں چھوڑ کر

صیدِ دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلائے ہے تو
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جاں چھوڑ کر

سرد مہری سے کسی کی آگئے ہی دل سرد ہے
یاں سے ہٹ جا دھوپ لے ابرِ بہاراں چھوڑ کر

دیکھئے کیا ہو کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

اے دل اسکے تیر کے ہمراہ سینے سے نکل
دیکھ پچھتائیگا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر

کیوں نہ رم کر جائیں آہو ایسے وحشی سے ترے
شیر بھاگیں جس کے نالوں سے نیستاں چھوڑ کر

سرخیِ پان دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیحِ مرجاں چھوڑ کر

پیش خیمہ اس کے نکلا گردِ بادِ دودِ آہ
ہے جو سرگرمِ سفر تن کو مری جاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو نہ آدھی نانِ انساں چھوڑ کر

ساغرِ دل ہی تپا آیا ہوں کھو مت ہاتھ سے
چوکتا ہے کیوں یہ جنس دستِ گرداں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالمِ مضموں میں طرزِ تفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

میں وہ مجنوں ہوں جو نکلوں کنجِ زنداں چھوڑ کر
سیبِ جنت تک نہ کھاؤں سنگِ طفلاں چھوڑ کر

پیوے میرا ہی لہو مانی جو لب اس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے خونِ شہیداں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیِ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

سایہ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

ہو گیا طفلی ہی سے دل میں ترازو تیرِ عشق
بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراقِ میزاں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

شوق ہے اسکو بھی طرزِ نالۂ عشاق سے
دمبدم دیکھے ہے منہ سے دودِ قلیاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے
باغِ ہستی سے چلا ہوں اے پریاں چھوڑ کر

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا[1] لے کر
چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لے کر

شرطِ ہمت نہیں مجرم ہو گرفتارِ عذاب
تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑیگا بدلا لے کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نامِ خدا کا لے کر

کھینچتی روزِ قیامت بھی ہے آپ کو دور
تیری زلفوں کی بلائیں شبِ یلدا لے کر

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
گرچہ ڈھونڈو گے چراغِ رُخِ زیبا لے کر

جبکہ دیکھا نہ ملا مجھ میں کہیں میرا پتا
پھر گیا نامہ برِ یار خطِ الست لے کر

رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ آئینہ رو
تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر

تیرے پرزے نہ کئے خط کی طرح اے قاصد
شکر کر چھوڑ دیا اس نے نوشتا لے کر

میرے قدموں ہی میں جائینگے جہاں جائینگے خار
دشت میں میرے قدم آبلہ پا لے کر

واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائینگے ہم لاکھ تمنا لے کر

دیوان چندو لعل مدار المہام دربار حیدر آباد نے کئی ہزار روپئے بھیج کر بلا بھیجا۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا۔ حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ لکھ کر بھیج دیا۔ اور روپیہ نہ لیا۔ میں نے ایک دن نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا۔ بھئی اپنی ہی جگہ بھاری ہے۔ میاں وہاں جاتے خدا جانے کیا ہوتا۔ اور کیا نہ ہوتا۔ اپنی دلی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے۔ خدا کا شکر کیا اور نہیں بیٹھے رہے۔

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طفلِ اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اٹھا کوچۂ چاکِ گریباں چھوڑ کر

کیونکہ نکلے تیر اس کا دل میں پیکاں چھوڑ کر
جائے بیضہ کو کہاں یہ مرغِ پرّاں چھوڑ کر

[1] سنبھالا لینا۔ بعض دفعہ بیمار قریب المرگ ہوتا ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے ایسا سنبھل جاتا ہے گویا اچھا ہو گیا۔ سب کو صحت کی امید ہو جاتی ہے۔ پھر دفعتہً حالت بگڑ کر پہر دو پہر میں کام تمام ہو جاتا ہے اس وقت کہتے ہیں کہ جو صحت معلوم ہوئی تھی وہ سنبھالا لیا تھا۔

سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد دی کہ وہ اس سے بھی زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔ پھر سب چپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

دل سینہ میں کہاں ہے؟ نہ تو دیکھ بھال کر
اے آہ کہدے تیر کا نامہ[1] نکال کر

ہوں سرد ہو چکا۔ نہ دوبارہ حلال کر
میں! اور دم چراؤں لگا یہ تو خیال کر

عاشق کے خوں سے اپنا پر تیر لال کر
دکھلا دے شاخ خشک میں کونپل نکال کر

تیرے مریض نے کئی نقل مکاں کئے
آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر

شہ رگ پر اپنی زندگی و موت ہے لاگ
آ تیغ یار! قصہ یہ تو انفصال کر

اترے گا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے
خاک دل شکستہ نہ صرف اے کلال کر

لے کر ستوں نے جان جب ایماں پہ ڈالا ہاتھ
دل کیا کنارہ ہو گیا سب کو سنبھال کر

سینہ ہمارا وادی وحشت سے اے جنوں
ہر داغ پر تصور چشم غزال کر

گر چاہتا ہے مثل مہ چاردہ فروغ
آ پھر کے شہر شہر میں کسب کمال کر

پوچھو چلے ہیں کونسے کعبہ کو اہل زہد
ملک فنا ہے۔ جائیں ذرا دل سنبھال کر

تصویر ان کی حضرت دل کھینچ لائے گر
رکھ دینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قاتل ہے کس مزے سے نمک پاش زخم دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

[1] نامہ نکالنا۔ وہی مشہور عمل ہے جسے عوام اب بھی نام نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کچھ چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام۔ کبھی صورت۔ کبھی اور آتا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کاغذ کے پرزوں پہ نام لکھ کر کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھ کر۔ کبھی تیر کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تیر میں بھی یہ اشارہ ہوتا تھا کہ یہی چور کے کلیجہ میں لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے۔ دیکھ بھال نہ کر۔ ہاں اے آہ دل تو تیر کا نام نکال کر بتا دے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (اے یار)

گھر سے بھی واقف نہیں اُس کے کہ جب کے واسطے
بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر

جس میں گر تجھکو ہووے رویت ماہ جبیں
روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

بندۂ آزاد بھی ان دنوں حاضر خدمت ہونے لگا تھا۔ ایک دن مومن خانصاحب استاد کے پاس آئے۔ اثنائے گفتگو میں کہا۔ آجکل کا کوئی شعر سنائیے۔ استاد نے فرمایا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں۔ جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقومۃ الذیل کا مطلع انہی دنوں کہا تھا وہی سنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کہیگا۔ رستہ بند ہے:-

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشت گمشدگی میں مجھے کوئی
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

اس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغان کوہ راغ سے دور اور شکستہ پر

ساقی بط شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

خود اُڑ کے پہنچے نامہ۔ جو ہو مرغ نامہ بر
اُس شوخ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کماں دار تیر اِتیرِ
پر ہے نشان داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوقؔ میرے طائر دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سنا کہ اس میں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے۔ استاد مرحوم سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا عالم شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ دفعتہً مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیر نظر رکھتا ہوں میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہہ دیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دیکھو

کہا یہ سو بار دل کو روکر۔ حریف مست ترک چشم کو کر
سو آخرش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔ بہا ہے مژگاں کی ہر سناں پر
وہ چشم ابرو تمہارے زیبا کہ۔ قاب توسین جن سے ادنےٰ
یہ خال پیشانی کیوں تمہارا۔ نہ فرق سے جائے فرقداں پر
کہے ہے داغ جنوں کہ چمکوں۔ جو تیرے سر پر بدشت و ہاموں
چراغ وحشت سرائے مجنوں۔ کروں ہیں روشن چراغداں پر
بنا بگولے کو برج آسا۔ قریب ناقہ کے قیس پہنچا
پر اُترے محمل سے کیونکہ لیلےٰ کہ پردہ کھلتا ہے ساربان پر

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی
ہو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی۔ ہمارے داغِ دل تپاں پر

جسے پوچھے کہ ہے تپش کون مرے پہلوں پر
جو تمہارے دوست پہ تجھ بن۔ ہے گزرتی ظالم
تیرے دندان سی زیب کی دیکھی جو بہار

میں کہوں ہیں۔ تو کہے۔ ہیں کے چھری گردن پر
وہ مصیبت نہ ہو دنیا میں کسی دشمن پر
پڑ گئی اوس ہی گلشن میں گلِ سوسن پر

اے دل وہ ستمِ غمزۂ پنہاں عیاں کر
آہو نہیں دو دِ دل ہو نکا ہوں تو وہ کہے

آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں کر
او تفتہ جاں! ہوا ہو۔ یہاں سے دھواں کر

ایک غزل کے دو مطلعے مجھے ایک مجہول آدمی نے سنائے اور کہا کہ استاد کے ہیں میں نے یاد کر لیے اور استاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا۔ اُہو۔ لڑکپن کے ہیں بھئی۔ بلکہ بچپن کے۔ اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کرینگے۔ وہ بھی عجیب تھے۔ ہم مشاعرہ میں گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم ثناءاللہ خاں فراق۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی خاں سید تشریف لائے یہ بزرگ اس زمانہ میں اراکین مشاعرہ بلکہ اراکین شہر شمار ہوتے تھے۔ لوگوں

استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے۔ طبیعت سے واقف تھے اہل دربار میں سے کوئی سُنا دیتا تو جو پسند آجاتا خوشی حضور کی تھی کہ یہ ہمارے نام سے مشہور ہو۔ چنانچہ اس پر خود غزل کہنے اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسودہ اُستاد کے پاس بھیج دیتے کہ اصلاح دے دیں۔ اس حالت میں استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچا کر اُن کے شعر درست کریں۔ چنانچہ جب غزل مرتب کر کے حضور میں لیجاتے تو بادشاہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اسی طرح میں پھر ایک مسودہ بھیج دیتے ابتدا میں دو تین دفعہ ایسا ہوا۔ استاد سمجھ گئے آخر یہ ہو گیا کہ جب ایسا موقع ہوتا تو اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپ کر آیا۔ تو مجھے یاد ہے والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھ کر مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دیدی۔ کیا رنگین کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی:۔

مزا چکھایا ہے کوہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحان پر
کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر
خدنگ دنبالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر
کہ بوسہ اُس چشم سرمہ سا کا ہے مہر گویا مری زباں پر
لگا کے باتوں میں اُن کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہدیں ٹھکانا جس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر
تپ محبت میں سخت جانی کا یہ اثر ہے دل طپاں پر
کہ شکل سوہان پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زباں پر
اٹھائے سوز غم ہر نمط ہیں۔ یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل قط گیر خط پہ خط ہیں۔ ہنوز باقی ہر استخواں پر
خلش یہی خار خار غم کا رہا تو مرقد پہ میرے سبزہ
یقیں ہے مانند برگ خرما اگے گا نشتر لئے زباں پر

خط کہاں آغاز ہے پشتِ لبِ دلدار پر / ہیں جنابِ خضر آئے عیسیٔ مریم کے پاس

مردمک کے پاس ہے یا اشکِ خونیں کا ہجوم؟ / یا دھرے یاقوت ہیں یا دانۂ نیلم کے پاس

روح اُس آتش بجاں کی بعد مرنے جوں پتنگ / آئیگی اُڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس

کس کی قسمت ہے کہ زخمِ تیغِ قاتل ہو نصیب / جان سے جائیں۔ نہ جائینگے اگر مرہم کے پاس

کیا مزے رے لے کے گل کھائیں اگر آجائے ہاتھ / یہ جو چھلا آپ کی انگلی میں ہے خاتم کے پاس

زلف سے بے وجہ خطِ سبز ہم پہلو نہیں / ہے لپکتا عشق پیچاں سنبلِ پُر خم کے پاس

واہ صیادِ ازل۔ اور واہ صیادی کا پیچ / کھچ کے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس

دیکھو فیاضِ ازل نے کیا دیا آنکھوں کو فیض / کاسۂ درکف ہوکے یم آتے ہیں انکے نم کے پاس

ہے جو قسمت میں تو دریا بھی کبھی ہو جائے گا / آ لگا ہے اپنا قطرہ بھی کنارِ یم کے پاس

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل / بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پرغم کے پاس

تیر و کماں ہے گر بتِ ناوک فگن کے پاس / آہ و قدِ خمیدہ ہے اُس خستہ تن کے پاس

شب جانِ زار رک گئی لب پہ دہن کے پاس / پھر اُٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس

یہ جوئے خوں رواں نہیں۔ دیکھو ہے رو رہا / تیشہ۔ سر اپنا رکھ کے سرِ کوہکن کے پاس

اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام / پہنچوں کبھی لبِ بتِ پیماں شکن کے پاس

انگشتِ شمع کیوں نہ اُٹھے بہرِ فاتحہ / یہ ڈھیر ہے پتنگ کا پائے لگن کے پاس

میں تو اُسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو / شب کیا ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس

چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ / چاک جگر میں دیکھنا چاکِ کفن کے پاس

ق

میں نے کہا کہ بوسہ تمہی دو بادب میں! / لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہِ ذقن کے پاس

ہنس کر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں پہ آپ / یا جاتا ہے کنواں کسی تشنہ دہن کے پاس

اے ذوق صدقے جائیے پیکِ خیال کے / کیا لے گیا اُڑا کے بتِ سیم تن کے پاس

نے اُن سے کہا۔ اُنہوں نے پھر ہمیں پاس بلایا۔ دل بڑھایا۔ اور فرمائش کر کے دوبارہ غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نامۂ شوق کو مرے باندھے ہے جو بال و پر | کیوں ارے مرغ نامہ بر جھکو ہوئے بال پر
مصحفِ روئے یار میں دیکھا ہے سو جو خال پر | لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

ہیں ہما کے سر پہ افسر اُن ہوا گیروں کے پر | لگ گئے جن طائروں کو ہیں ترے تیروں کے پر
اُن کو لے پر عرشِ اعظم پر اڑاتے ہیں مہ پر | کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پروں کے تیر

شرحِ بختِ برگشتہ گر کروں رقم پھر کر | تیر بازگشتی ہو ہاتھ میں قلم پھر کر

رکھ لیا اُس نے چمن میں گل جو سر پہ توڑ کر | میں بھی حاضر ہوں کہا غنچہ نے یوں منہ جوڑ کر

بعد مردن آ چکے رونے کو سن کر گور دور | جیتے جی کہتے ہو چل صورت تری در گور دور

دلِ شوریدہ سے نے خاک اُڑا کر | بیاباں رکھ لیا سر پہ اُٹھا کر

خفا تو ہو نہ وقتِ ذبح میرے تلملانے پر | کیوں کیا لوٹتا ہوں میں ترے بازو دبانے پر

سین مہملہ

یہ دو غزلہ انہیں مسودوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظر ثانی نہیں ہوئی تھی۔

کون سا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بیدم کے پاس | غم ہے اسکے پاس ہمدم اور وہ ہے دم کے پاس
ہم کو کیا ساقی جو تھا جامِ جہاں میں جم کے پاس | تیرا جام بادہ ہو اور تو ہو اس نیز غم کے پاس

ن ساقیا سے کیا جو تھا جام جہاں میں جم کے پاس

محضر خوں مرا سارا ہے کتر کر پھینکا
دیگی اس ظلم کی محشر میں گواہی مقراض

پاس کیا قطع تعلق میں، کہ یکساں سمجھے
قطع میں جامۂ درویشی و شاہی مقراض

رشتۂ عمر کیا قطع سوا اس کے اے ذوق
کھو سکی شمع کے دل کی نہ سیاہی مقراض

اس غزل میں ایک شعر اور بھی کہا تھا:-

اڑتے پرزے ہیں جگر کے کبھی پڑھتا ہوں جو آہ
ہوتا حق میں ہے مرے مطلع آہی مقراض

اسے میاں نے لکھ کر تاڑ لیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری ابتدا تھی۔ میں نہ بولا۔ فرمایا آہی سبزواری بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا۔ کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں! ہم تو سب ہی کے لئے کہتے ہیں۔

عین مہملہ

ذوق کیونکر ہو اپنا دیواں جمع
کہ نہیں خاطر پریشاں جمع

قاف

پھر کر ادھر ادھر بھی نہ اپنا گیا قلق
لفظ قلق کی طرح سے یوں ہی رہا قلق

کاف

جو کھل کر ان کی زلفیں بال آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آ کے ہیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

ہم ان کی چال سے پہچان لینگے ان کو برقع میں
ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک

یہ جتنے سرو ہیں سب ان کے قد پر زہر کھاتے ہیں
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک

مرا دل ایک دو ان خوش ادا کی کس ادا کو میں
کریں دل وار آئیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

سراپا شوق جائیں سر کے بل ہم جن کے جلسہ میں
مثال شمع وہ ہم کو جلائیں سر سے پاؤں تک

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس | بد گماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

چمن سے بُعد ہمیں جیسے عین قاف قفس | قفس میں بند ہیں ہم جیسے فائے ناف قفس

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔

لبِ شیریں کو ترے جان کے رنج شہد مگس | بیٹھی نظروں میں پتے ہائے ہے لبِ شہد مگس
بوالہوس جیفۂ دنیا سے بھرا دل نہ ترا | تو مگس اور تری چشم ہوس چشم مگس

صاد مہملہ

سب مذاہب میں یہی ہے نہیں اسلام میں خاص | کہ جہاں عام ہے یہ ہوتا ہے دہاں عام میں خاص
ساغرِ دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے | دیکھ عکس رخ ساقی ہے یہی جام میں خاص
خضر! باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیواں جاں بخش | ہے یہ خاصیت اسی کے لب دشنام میں خاص
شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصانِ خدا | خدمتی اُن کے ہیں جو زمرۂ خدام میں خاص
کام دن رات ہے عاشق کا ترے ناکامی | کر دیا تو نے لگا اس کو اسی کام میں خاص
عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن | یہ مرض کرتا ہے شدت انہیں ایام میں خاص

ذوقؔ اسمائے الٰہی میں سب اسمِ اعظم
اُس کے ہر نام میں عظمت ہے نہ اک نام میں خاص

ضاد معجمہ

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض | ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض
بحر و بر میں نہیں کس کو ہوسِ قطع و برید | ناخنِ شیر ہے خنجر دمِ ماہی مقراض
گل کترتی ہیں ہزاروں تری آنکھیں کافر | ہے عجب طرح کی اک تیز نگاہی مقراض
کب زباں چلتی ہے اُس بزم میں بدگویوں کی | ان کے منہ میں یہ زباں ہے کہ الٰہی مقراض

اگر نہ جبر کروں اختیار اے ناصح
تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل

اڑے گا مثل شرر ٹکڑے ہو کے سنگ مزار
رہا اگر یونہیں گرم تپش مزار میں دل

برنگ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
ہوا شگفتہ نہ اپنا کسی بہار میں دل

فلک کے رنگ سے ظاہر ہیں ماتمی آثار
خوش اپنا کیونکہ ہو اس نیلگوں حصار میں دل

برنگ بیضۂ نوروز توڑے دل اس نے
ہزاروں، ایک نہ آیا کسی قطار[1] میں دل

ہزار دشمن جاں سے ہے ایک دوست برا
جو پوچھو کون ہے وہ؟ میں کہوں ہزار میں دل

نہ ہوویں خلد میں حوریں تو رہتا خلد میں کون؟
لگے ہے صحبت خوبان گلعذار میں دل

یہ جسم زار ہے یا میرے پیرہن میں ہے تار
گرہ ہے تار میں؟ یا میرے جسم زار میں دل

اٹھا بھی لائے اگر ہمنشیں مجھے اے ذوق
رہیگا میرے تو کوئے یار میں دل

ازل سے یوں دل عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرش خدائے غفور کی قندیل

بجھے وہ در بناگوش نور کی قندیل
خجل ہے اختر صبح نشور کی قندیل

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے باب کمال ظہور کی قندیل

جہاں ہے خانۂ عشرت، ابھی ہو اسکا فروغ
کہ لٹکے اس میں سر پُرغرور کی قندیل

رہے ہے جوں قمر منخسف سدا بے نور
سیاہ بختوں کے بالین گور کی قندیل

پڑے ہے جو عکس ترا جام میں تو ہو روشن
حباب بادہ تجلی سے طور کی قندیل

عیاں ہے یوں مرے روز سیاہ میں خورشید
کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

سوائے دل کے ہو نارنج باغ خلد سے بھی
کبھی پسند نہ اس رشک حور کی قندیل

[1] قطار۔ بہار نوروز میں لوگ بار جیت پہ انڈے لڑاتے تھے۔ اس کے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی [illegible] انڈے لے کر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑائے جاتا تھا جس کا انڈا آخیر کو ٹوٹتا اس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف، ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ رسم ایران توران، افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آئی تھی۔

نہ ہوں بے پردہ۔ تو بھی وہ کھڑے دھوکے شوخی سے
پشیمان چلمن سے دہ پردہ دکھائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اس لئے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سراپا پاک ہیں دھوئے جنہوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

مزا اتنا ہی ذوق افزوں ہو جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخم تیغ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

کچھ تو آئے خیر سے ہم جا کے اس مغرور تک
پر اچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دور تک

صفحۂ دہر پہ یک ل نہ ہوا الگ سے ایک
دل کے دو حرف ہیں پر وہ بھی ہے جدا ایک سے ایک

گاف

یہ پرانی غزل ہے۔ ۲ شعر نکلے۔ دو یاد رہ گئے۔ وہی لکھ دیتا ہوں۔

بینی و عارض پہ بر موتے ہیں شاخ و گل و برگ
یوں خیال اس کے چمن ورے ہیں شاخ و گل و برگ

بینی اور وہ دہن خندہ زن اور تارک لب
لکھے گویا قلم موتے ہیں شاخ و گل و برگ

لام

چھٹے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو لو الہ دہان یار میں دل

بغل میں جیسا مرا دل بغل کا دشمن ہے
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

نکل نہ جائے دم اضطراب سینے سے
برنگ شعلہ کہیں آہ شعلہ بار میں دل

ہمیشہ روزن سینہ سے کیوں ہے چشم براہ
اگر نہیں کسی مہوش کے انتظار میں دل

ترا سنگار بھی ہے وہ بلا کہ جائے گھر
پروئے زلف مسلسل کی تار تار میں دل

نہ اہچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل

بغیر یار رہے نہ چھوڑے گی دل کو کافر زلف
کہو یہ دل سے کہ جائے نہ زار زار میں دل

شمع نازاں نہ ہوا کِ رات بہا آنسو گرم
برسوں یاں آنکھ سے پرکالۂ ہے گرے لوہو گرم

اے جنوں! ہے خبر موسمِ گل ہر سو گرم
دم تو لے لینے دے مجنوں کو۔ نہ کر اتنا گرم

آتشِ رشک سے اُس کاکُلِ مشکیں کے صبا
جل گیا نافہ میں اس درجہ ہوا لوہو گرم

آبلے سینۂ دریا میں ہوئے جل کے حباب
دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

اے صبا نکہتِ گل لے کے چمن کو پھر جا
کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے خوشبو گرم

آتشِ حسن کا پتلا ہے تو اے رشکِ پری
تابِ رخ تیرے بھبوکا ہے بلا ہے تو گرم

توسنِ ناز ترا ہر قدم اے رشکِ غزال
کیوں نہ ہو تیز کہ رکھتا ہے مزاج آہو گرم

فاختہ سوزِ محبت سے ہوئی جل کے ہے خاک
کھینچے ہے دل سے پر آتک نفس کو کو گرم

شعلِ افروزِ جنوں کون ہو مجنوں کے لئے
گر نہ ہو گرمیٔ وحشت سے دلِ آہو گرم

سرد مہری کا تری ہو جو خنک دل کشتہ | ق
ہووے گلگشت سے کیا اُسکا دل اے گلرو گرم

تابشِ نارِ جہنم سے سوا اُسکو لگے
ہمرہِ بادِ سحر بوئے گُلِ شبو گرم

سرد مہری سے رکھا اپنی خنک دل تونے | ق
گرمجوشی سے کیا تو نے بہت دلجو گرم

اپنے کشتے کی کرامت کو ذرا دیکھ آکر
ایک پہلو ہے اگر سرد تو اک پہلو گرم

ذوقؔ دل میں یہ تپِ عشق کلام ایسا خنک
عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

جل بے اے آتشِ غم۔ دل کو کرے یہ تو گرم
کہ زمیں پشت سمک تک ہو تہ پہلو گرم

لطف بوسہ نہ رہا ہم پہ ہوا جب تو گرم
شربت قند دیا کر کے پر آتش خو گرم

تن رہا یوں ہی تپِ غم سے اگر گرم مرا
سیخ آہن کی طرح ہونگے بدن پہ مو گرم

نیشتر جل کے وہیں کشتہ فولاد ہوا
نکلا یہ آتشِ سودا سے مرا لوہو گرم

کٹ سکا صیدِ محبت کا نہ قاتل سے گلا
اُس نے پتھر پہ یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

آتشِ دل سے پس از مرگ برنگِ شعلہ
خاکِ عاشق سے نکلتا ہے گل خودرو گرم

مہروش بل بے ترے حسنِ جہانتاب کی تاب
رُخ سے گرم آئینہ ہو۔ آئینہ سے زانو گرم

اڑے جو آہ کے ہمرہ نکل کے پارۂ دل
ہوئے ہوا میں وہ صورت طیور کی قندیل

وہ تیر ہیں یہ مرے نالۂ قیامت زا
کہ اُن کے رکھنے کو لازم ہے صور کی قندیل

نسیم کیا ہے کہ روضے میں تفتہ جانوں کے
نہ گل ہو باد سے آواز صور کی قندیل

سمجھتا قدر ہے ناقص کب اس غزل کی ذوق
یہ روشن آپ نے کیوں پیش کور کی قندیل

یہ غزل لڑکپن کی ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی۔

دیوانہ ہوں ترا نہ ہے یا کام کہ یوں گل
زیبائش سر کو ہیں مرے داغ جنوں گل

ہوں زیر قدم خار۔ ہے سر داغ جنوں گل
یا ہے یہ جنوں ہوں سا افنا جنوں گل

میں کشتہ ہوں اس لب پان خوردہ کا کس کے
نکلے ہیں مری خاک سے آغشتہ بخوں گل

سو ٹکڑے ہیں ایڑی کے یہ رنگ گل صد برگ
کیا دست نوردی میں کترتا ہے جنوں گل

اس گل میں نہ پایا اثر بوئے محبت
سو بار سنگھائے اسے پڑھ پڑھ کے فسوں گل

ہے روشنی خانۂ دل سوز محبت
زاہد تو بتا شمع حرم کیونکہ کروں گل

پیکاں تو سے دلدوز سے سینہ ہے سوفار
اس تیر سے ہے دل میں دروں غنچہ بروں گل

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے
گلدستے بھی ہیں مرے ہاتھوں پہ فزوں گل

آئینۂ فلک میں ہے عکس چراغ دل
خورشید ہو نمود ہوا ہے داغ دل

میم

عالم نوجوانی کی غزل ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقومہ الذیل طرح ہوئی آغاز شباب تھا۔ ہم نے کہا کہ زمین تو گرم ہے۔ مگر تاثیر ٹھنڈی ہے۔ میر مشاعرہ نے کہا کہ خیر اب تو ہو گئی۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم تو دو غزلیں کہدینگے۔ مگر دیکھنا سب کیا کہینگے۔ جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آیا نالاں آیا۔

اُس خالِ رُخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق
ہندو اسیر دیکھیں ڈرانیوں میں ہم

سینہ کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
مصروف زخمِ دل کی نمک دانیوں میں ہم

بیم کدورتِ دلِ صیاد گر نہ ہو
کیا کیا اُڑائیں خاک پرافشانیوں میں ہم

دکھلائیں روزِ حشر کو بین السطور سے
اپنے سیاہ نامہ کی طولانیوں میں ہم

جا سکتے ضعف سے نہیں کوچہ میں اُسکے ذوقؔ
بہہ جائیں کاش گریہ کی طغیانیوں میں ہم

نون

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہوٗ جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں

اُس زلفِ فتنہ زا کے لئے اے مسیح دم
کچھ دستِ شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں

زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں
اپنے خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

سرعت سے نبض کی رگِ سنگِ مزار میں
دل کی تپش کچھ اب بھی تپِ غم سے کم نہیں

وحشی کو تیری چشم کی مژگانِ ہر غزال
صحرا میں تیز ناخنِ ضیغم سے کم نہیں

ہوتی ہے جمع زر سے پریشانی آخرش
درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

ساقی ملے ہزار فلاطوں ہیں خاک میں
جو خم بنے ہے قالبِ آدم سے کم نہیں

اُس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

شورابۂ سرشک میں ڈوبا ہوا ہے دل
تیزاب میرے زخم پہ مرہم سے کم نہیں

ہاتھوں سے تیرے پارۂ الماس زخمِ دل
مجھ کو تو جلوۂ گُل و شبنم سے کم نہیں

[illegible]

اے ذوقؔ کس کو چشمِ حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں تا ملِ دمِ ناوکِ فلکی خوب نہیں
ابھی چھانی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

کیا کہوں نامۂ جانسوز کی اپنے تاثیر
جل گیا بس یہ۔ کبوتر کا ہوا بازو گرم

سرِ مجروح کو ٹھکرا کے گیا وہ۔ اور میں
چونکا اُس وقت کہ جب منہ پہ بہا لہو گرم

دستِ خورشید کی رعشہ سے سپر جائے چھوٹ
کھینچ کر تیغ کو جب ہو وہ ہلالِ ابرو گرم

دلِ عاشق کے جلانے کا ہے سارا ساماں
بنی شعلہ ہے تری رنگ بھبوکا۔ رو گرم

کونسا سوختہ جاں صبح سے ہے گرمِ فغاں
کہ ہوا آتی ہے کوچہ سے ترے گلرو گرم

ہم تو سنتے تھے سدا کُلُّ حُمُوضٍ بَارِدٍ
ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش ابرو گرم

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ہوتی نہ یاد زلف تو خطِ شکستہ میں
لکھتے الف خطوں کی نہ پیشانیوں میں ہم

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم

پائی نہ تیغِ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھل من مزید بھول
لائیں جو آہ کو شررافشانیوں میں ہم

پاکوبیوں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید
پھر ہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

نم بھی نہیں جگر پہ رہی۔ اِس قدر رہے
سرگرم سوزِ عشق کی مہمانیوں میں ہم

مطلب سے اپنے کون ہے آگاہ جز خدا
جو خطِ سرنوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

ہیں آئینہ میں صورتِ تصویرِ آئینہ
آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

ہو وہ عزیز سورۂ یوسف سے بھی سوا
رکھ دیں تری شبیہ جو کنعانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو۔ بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندہ یار سے
اب مر رہے ہیں اُس کی پشیمانیوں میں ہم

پردہ میں چشمِ مست کے سرخوش ہیں ہم مدام
شربُ الیہود[1] کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

[1] شرب الیہود۔ یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں مکزور رہتے ہیں۔ اور اسی واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں خوشحالی نہیں ظاہر کرتے۔ عیسائیوں سے زیادہ تر دبے رہتے ہیں۔ شراب بھی کم پیتے ہیں اور چھپ کر رہتے ہیں۔ اہل ایران نے شرب الیہود اصطلاح مقرر کر دی۔ یعنی کم پینی اور چھپ کر پینی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے۔ چشمِ مست کی یاد میں درپردہ سرخوش رہتے ہیں۔ گویا ہماری مے خواری یہودیوں کی شرابخوری ہے۔

استاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کے لئے کہتے تو اپنی غزل اس طرح میں نہ کہتے تھے اور کبھی کہنی بھی پڑتی۔ تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھ دیتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑ جائے اب بھی نہ لکھی تھی۔ شمع سامنے آئی تو کہا مجھے تو فرصت نہیں ہوئی۔ کیا کہوں۔ غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب اور اور اختصاص نے فرمائش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھئے سب نے بہت کہا تو میں ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ لے کر غزل مرقومتہ الذیل پڑھی تعریف کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سنائی نہ دیتا تھا۔ در و دیوار بول رہے تھے۔ ع

ہفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہیں

حضور کی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو
ہم بیکسوں کو گور غریباں پسند ہے

دلی میں تو ۷ پشت خاندان زیر زمین آباد ہے۔ سکندرہ میں اکبر۔ آگرہ میں شاہجہاں اورنگ میں عالمگیر۔ اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی۔ پسند کہاں؟ رنگون جل شانہٗ جل جلالہٗ

ہفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

مردار ہیں وہ طائر سدرہ ہی کیوں نہوں
تیر نگاہ یار کی جو دور زد سے ہیں

خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمنا
بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہیں

جاں دادگان عشق سے پوچھو فنا کی راہ
اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

[1] غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی۔ مذکورہ بالا شعر جب اس کا مجھے یاد آتا ہے تو دیدہ عبرت سے لہو ٹپک پڑتا ہے۔ دیکھو اخانہ برباد کا واقعہ بھی انسی پسند سے ہوا۔ کابل میں موا ہوتا۔ بابر دادا کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں موا ہوتا تو اورنگ آباد میں عالمگیر کا مقبرہ تھا۔ اکبر آباد بھی دار السلطنت تھا۔ وہاں مرتا شاہجہاں کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا دبا مرتا۔ اکبر کے دامن میں سوتا۔ لاہور میں آن مرتا جہانگیر کی خوابگاہ حاضر تھی۔ موا تو کہاں؟ رنگون میں خدا مغفرت کرے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا۔

لاشے کو دفن کیجئے میرے کہ پھینک دیجئے
مردہ بدست زندہ جو چاہے سو کیجئے

تشنۂ دشت محبت کے لئے اس لب سے — کوئی دنیا میں عقیق یمنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر — دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوباں یوں تو ہیں اس عالم تصویر میں سب — اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں

چشم کہتی ہے تری جنبش مژگاں سے کہ دیکھ — سر پہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے ہے کسی میخوار کا دل — محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر — کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی دہاں خوب مگر — تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خارش خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود — دیکھ گل دعوے نازک بدنی خوب نہیں

اٹھ ہی جائیگا اس دل سے دھواں آہ کے ساتھ — جب تلک جلنے کا یہ سوختنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گزرا
آج جو سرد نسیم یمنی خوب نہیں

۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش ایک معزز شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ حضور سے بھی غزل کا وعدہ لیا۔ استاد مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ ان سے بھی بہت کہا اور اقرار لیا۔ مطلب یہ تھا کہ آئینگے تو سینکڑوں آدمی سننے کو آئینگے۔ مشاعرہ کو رونق ہو جائے گی شاہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے۔ غرضکہ مشاعرہ میں گئے۔ غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے۔ حضور بالا بالا تشریف لائے۔ اور پس پردہ بیٹھے۔

حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بڑے شائق سخن تھے۔ اور سخن شناس تھے۔ انہوں نے استاد سے کہا۔ کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ استاد نے کہا۔ بسم اللہ۔ چنانچہ بموجب آئین مشاعرہ پہلے شمع مشاعرہ وسط مجلس میں رکھی گئی۔ ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس باادب بیٹھا اور حضور کی غزل سنائی۔ (اکثر مشاعروں میں یہ غزل خلیفہ اسمٰعیل پڑھا کرتے تھے۔)

نہ جنبش نبض میں جس کے۔ نہ گرمی جس کے لمس میں
دکھائے چیرہ دستی آہ بالا دست گر اپنی
تو مارے ہاتھ دامانِ قبائے چرخ اطلس میں
جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیال بیت ابرو میں
وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں
کرے لب آشنا حرفِ شکایت سے کہاں یہ دم؟
ترے محزونِ بے دم میں۔ ترے مفتونِ بیکس میں
ہوائے کوئے جاناں لے اُڑے اس کو تعجب کیا
تنِ لاغر میں ہے جاں اِس طرح جس طرح بو خس میں
مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے
ہزاروں دے چکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضموں ذوقؔ ایوانِ دو عالم میں ہوئے موزوں
جو اس خمسہ ہیں انساں کے وہ بند مخمس میں

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
ہم اُن کی زلف سے سودا جو دام لیتے ہیں
تو اصل و سود وہ سب دام دام لیتے ہیں
ترے خرام کے پیرو ہیں جتنے فتنے ہیں
قدم سب آن کے وقتِ خرام لیتے ہیں
شبِ وصال کے روزِ فراق میں کیا کیا
نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں
ترے اسیرِ جو صیاد کرتے ہیں فریاد
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیرِ دام لیتے ہیں
ہم اُن کے زور کے قائل ہیں زورِ بازو ہیں
جو عشق میں دلِ مضطر کو تھام لیتے ہیں
جھکائے ہے سرِ تسلیم ماہِ نو۔ پر وہ
غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
ترے قتیل بتاتے نہیں تجھے قاتل
جب اُن سے پوچھو اجل ہی کا نام لیتے ہیں
قمر کا داغ بھلا آئے کس حساب میں واں
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

چشمِ تر سے مروت اُنکو جو چاہو تو مت
رکھتے امید دوستی اُس سرو قد سے ہیں

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی ہے سب آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

بر ہیں ہنسناک دلوں کے ہو گر خرقۂ فقیر
سمجھو کہ کرتے بدن کی پوشش نمد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یار
بہتر سمجھتے ہم اُسے عمرِ ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یاں روشِ نشۂ شراب
بڑھ جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ہر چند ناتواں ہیں مگر رکھتے دل قوی
ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

عاجز لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہرِ داغِ عشق
ہم کرتے **ذوق** عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

ہے چشم تیری مست تو دل گیرِ باغِ حسن
عارض پہ خط ہے طوطیِ تصویرِ باغِ حسن

ہو جاتا دل ہے شیشے کے خود گل خوں سب گل
تاثیرِ باغِ خلد ہے تاثیرِ باغِ حسن

تحریر سرمہ ہے تری آنکھوں میں وقتِ خواب
اے حیرت آئین دو روز تحسیرِ باغِ حسن

پانوں کی وسمہ و رنگ ہو گئے لالہ زار
مشاطہ باغباں ہے یہ تدبیرِ باغِ حسن

تنہا لب پہ گرمیِ بوسہ سے ہے کہاں
ہے گلر خوابیہ غنچۂ دلگیرِ باغِ حسن

اے رشکِ باغِ لالۂ و ابرو کا ہے نشاں
دریائے آئینہ میں ہے تعمیرِ باغِ حسن

سیرِ خزاں جو چاہیے تو اے **ذوق** دیکھئے
اُس نازنیں کا جلوۂ تغییرِ باغِ حسن

گئیں یار دل سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل ہیں میں ترے اور دل کے ہم ہیں ہیں
کبھی ملنا کبھی رہنا الگ مانندِ مژگاں کے
تماشہ کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص آپس میں
توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمارِ ہجراں کی

کھائے زخمِ تیغِ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں

خاک ہو کر ہی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت شکلِ ریگِ شیشۂ ساعت نہیں

خانۂ ہستی کا اپنے صحن ہے دشتِ عدم
روز کرتے ٹہل قدمی مگر فرصت نہیں

میری وحشت پاؤں پھیلائے تو کچھ دونوں جہاں
ہوں اگر یک دشت میداں تو کچھ وسعت نہیں

ایک دل اور اس پہ لاکھوں بارِ غم اللہ رے دل
اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

ذوق اس حیرت کدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کہہ شراب و کباب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری
ہیں یہ چشمِ پُر آب کی باتیں

مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

مجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں

جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

جامِ مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھا اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ایک موقع پر دو فرقوں میں اختلاف کا رنگ بگڑا۔ استاد نے ایک فرقہ کے لوگوں کو حق بجانب دیکھ کر طرفِ ثانی کے سرگروہوں کو سمجھایا۔ مگر وہ اپنی جمعیت اور کارسازیوں کے گھمنڈ میں تھے۔ نہ سمجھے (قلعہ میں ان نابکاروں کی کارروائیاں دیکھ کر زمانہ کے

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقتِ مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

دودِ دل سے ہے یہ تاریکی مرے بتخانہ میں
شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانہ میں

میں ہوں وہ خشت کہن مدت سے اس ویرانہ میں
برسوں مسجد میں رہا۔ برسوں رہا بتخانہ میں

مستی و نا آشنائی وحشت و بیگانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانہ میں

میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب
جوشِ کیفیت سے میری خاک کے پیمانہ میں

ہوش کا دعویٰ ہے بیہوشوں کو زیر آسماں
خم نشیں ہیں مثل افلاطوں سب اس خمخانہ میں

پتھروں میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق سیل آب
پوچھو کیا لے جائے گی آ کر مرے ویرانہ میں

عشق کو اے حسن اگر نشو و نما منظور ہو
سبز نخلِ شمع ہو خاکستر پروانہ میں

برق خرمن سوز ہے عالم میں ناخوشی تری
ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانہ میں

کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحادِ حسن و عشق
زلف ناں شانے نے کھینچی درد ہے یاں شانہ میں

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے
ذوق ہر بت قابلِ بوسہ ہے اس بتخانہ میں

اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

علم جس کا عشق۔ اور جس کا عمل وحشت نہیں
وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں

خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک
پر کہیں زیر فلک سر منزلِ راحت نہیں

بسمل تیغ محبت کا لب ہر زخم دل
ہوتا وا۔ بے شور واویلا و واحسرت نہیں

منہ میں گر پانی چوا دے یار اپنے ہاتھ سے
مرگ کی تلخی سے شیریں تر کوئی شربت نہیں

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال
چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں

کہتے ہیں مر جائیں گر چھوٹ جائیں غم کے ہاتھ سے
پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں

ایک حسرت تو برستی ہے کبھی برسی کے دن
ورنہ روتا ابر بھی اپنے سرِ تربت نہیں

ہے نوشتہ میں ترے بیمار کی صحت کہاں؟
اس کے نسخہ میں دوا کے لفظ کو صحت نہیں

بنا کے چشم کے دنبالہ پر وہ خال سیاہ
سنانِ ترک نظر پر سہا کو دیکھتے ہیں

عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اس رخ پہ
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں

الٰہی آگ یہ سینہ میں ہے کہ آفت ہے
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنر وہ اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

زیادہ سر ہو جو دشمن تو ہم سمجھتے ہیں
تڑپتا خاک پہ مار دو سر کو دیکھتے ہیں

نگیں کو دیکھ لیں جا ہیں جو نام عالم میں
کہ سینہ کاوی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں

خراشِ ناخنِ وحشت سے چارہ گر میرے
شکستہ بخیۂ زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اٹھائی آنسوؤں نے کس پہ آج ہے تسبیح
سفر ہے جاں کا جو فالِ سفر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوشِ مژگاں سے ہر سرِ مژگاں
ٹپکتا قطرۂ خونِ جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جدا
اِس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

دکھا دو تم لبِ میگوں پہ خندۂ نمکیں
کہ یاں تو ساغرِ مے میں شکر کو دیکھتے ہیں

عیارِ نقدِ محبت کا دیکھ سختی پر !
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے۔ آپ بھی غزل کہیے۔ آغازِ شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جا بجا چرچہ ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرام گاہ ان دنوں بادشاہ تھے۔ انہوں نے فرمائش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو۔ ہمیں خود آکر وہ غزل سنائیں۔ یہ ولیعہد یعنی مرزا ابو ظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ایک قصیدہ اُن کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا۔

سے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

زلفِ افعی وش کو دھووے گرد پرفن آب میں
ہوں بجائے موج پیدا مار رہزن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا پائے نگاہ
اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں

دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا اہلِ تالیف بیچاروں کو کیا خبر سب کو خدا مغفرت کرے

سلام کرتے ہیں اُن کو جدھر کو دیکھتے ہیں — اور اُن کو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں — محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں — انہیں تو دیکھیں ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی برش تیغ نظر کو دیکھتے ہیں — ہم اُن کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

سخن و شعر کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں — جدھر کو آپ نہ ہوں ہم اُدھر کو دیکھتے ہیں

میں چپکا دیکھ رہا ہوں لگا کے داغوں کو — کہ چارہ گر انہیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اُن آنکھوں سے کہو دیکھیں مری آنکھوں کو — جو آب جو میں گلِ نیلوفر کو دیکھتے ہیں

ہے اُن کی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم — جدھر ہو اُن کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

ہماری وصل کی شب ہے ویا شبِ محشر — کہ اُٹھ کے صبحِ قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

ہوا کے گھوڑے پہ کس برق وش کو دیکھا تھا — کہ طمطراق پہ ہم کرّ و فر کو دیکھتے ہیں

پڑے گا سایۂ زلف اُس پہ بھی ضرور کبھی — کہ پیچ و تاب سے تمہاری کمر کو دیکھتے ہیں

ہم اُن کے کوٹھے پہ چڑھ کر ہیں ڈھونڈتے عید — کدھر کو چاند ہے اور ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

خدا کا بندہ ہو زاہد خدا کو دیکھ ذرا — کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں

اُدھر شفق میں ہے شام اور اِدھر ہمیں دیکھو — ابھی سے دم بدم اُٹھ کر سحر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھو شغل اسیری میں ہم غریبوں کا — کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

وہ دن تو عید کا ہوتا ہے دن ہمارے لئے — تمہارا اُٹھ کے جو منہ ہم سحر کو دیکھتے ہیں

یہ کس کو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھا کر — پڑا زمیں پہ جو نورِ قمر کو دیکھتے ہیں

سوال جوہرِ آئینہ ہے یہ چشم پُر آب — کہ منہ پہ خاک ملے کیوں ہنر کو دیکھتے ہیں

بہار کو ہیں دکھاتے ستارہ سحری — تمہارے کان میں جب ہم گہر کو دیکھتے ہیں

فنا کی راہ میں بستر جو بن کے بیٹھے ہیں — اُنہی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں

وہ خاک اُڑائینگے بازارِ عشق میں آ کر — کہ پہلے آن کے سود و ضرر کو دیکھتے ہیں

* جب اپنے دامن کو [illegible] دیکھتے ہیں ۔ دھواں [illegible] ہوا فلک [illegible] دیکھتے ہیں

پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسہا دلا
جوں شناور پھر ہوا ہیں دست و پا زن آب میں

مطلعِ روشن لکھا جس سے کہ بحرِ نظم میں
صورتِ اختر دُرِ معنی ہیں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو حیکہ آوس آب میں
نورِ حق ہو اہل برہاں پر مبرہن آب میں

اے شہِ الیاس رتبت اے شہِ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

نامِ حق لیکر جو مارے تیغ راہِ حق میں تو
غرق جوں فرعونیاں ہو فوجِ دشمن آب میں

تو شہِ دریا نوال، اور دل ترا موجِ کرم
ہے سخاوت سے ترے دستِ قلمزن آب میں

تیرا نیسانِ عطا جس دم گہرباری کرے
گوہرِ تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں

علم تیرا جستجو تیا ہے تو گم ہو نہ پائے
مثل ابراہیم ادہم ایک سوزن آب میں

تیرے حکمِ شرع سے جب کفر دریا برد ہو
غرق ہووے تا بہ انشائے برہمن آب میں

ہو ترے سینہ میں جب بحرِ معانی موجزن
قطرہ سے روشن ہو صد معنی روشن آب میں

ہو ترا فیضِ سخن گر معنیِ نطقِ فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوازن آب میں

تیرے آگے گر کریں اعدا سپرِ عصیاں بلند
مثل قومِ نوح ہووے سب کا مدفن آب میں

تو ہمت آرا ہو تو دریا میں تو ایک اک کرم آب
ہو عدو کے قتل کو سو سو تہمتن آب میں

روئے دریا پر بناتے ہیں بہم موج و حباب
بہر سربازانِ لشکر خود و جوشن آب میں

نور ظلمت ہمدگر دشمن ہیں پہ حیراں ہوئیں
تیرے خنجر تک ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں

ق
بادپا تیرا لبے یوں آتش قدم بر روئے خاک
ہووے جوں برقِ درخشاں سایہ افگن آب میں

عکس اجی دریا میں اور تن سے اڑ جاتا ہے یوں
روح گویا اُڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں

تیرا فیلِ کوہ پیکر بسکہ دریا سیر ہے
ڈالے وہ کوہِ رواں جب اپنا دامن آب میں

مثل ابر آئے ولیکن سرعتِ رفتار سے
اوپر اوپر جائے مثل ابرِ بہمن آب میں

نسر طائر نسرِ واقع چرخ پہ تا ہوں شہا
اور زمیں پہ ہوئے تا ماہی کا مسکن آب میں

ہو ہوائے شوق میں سر پر ہما اقبال کا
ماہیِ دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

بچتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردِ خدا
شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اب بھی گریہ نے مجھے فرصت نہیں تو آرہ وار
گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

طاس فانیاں میں رکھا ہے اس نے ابرِ مردہ کو
ڈوب مر رو رو کے تو اے برہمن آب میں

دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پہ اس کے وقتِ خواب
برجِ آبی میں ہے مہ یا مہرِ روشن آب میں

میں ہوں وہ تفتیدہ دل گر جائے اک دریا کو جذب
گر پڑے گر ذرہ میری خاکِ مدفن آب میں

یوں رہا میں زندگی بھر تشنۂ دیدارِ یار
جیسے مستسقی کا دم ہوتا ہے مردن آب میں

سایۂ سروِ چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے تنتا ہے شکِ گلشن آب میں

وعدہ ہے آنے کا اس کے ابر کھل جائے تو آئے
ڈالتا ہوں دمبدم اٹھ اٹھ کے روغن آب میں

شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے امڈے اشک
بہہ گیا خط لکھتے لکھتے مشفقِ من آب میں

ذوق تو اس بحر میں ایسے گلِ مضموں بہا
جا بجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

ہووے تو اے مہروش جب پرتو افگن آب میں
ہو سراپا فلسِ ماہی ماہِ روشن آب میں

عکسِ زلفِ یار اور آئینۂ رخسارِ یار
کھینچے ہیں شام و سحر تصویرِ سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہو گیا اے شوخِ پرفن آب میں

مردمِ دیدہ ہیں اپنے زندہ آبِ اشک سے
مردمِ آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں

بھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بہے اے طفلِ کودن آب میں

تو لبِ دریا پہ آکر جو اے رشکِ بہار
ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

لے تو اپنے روئے سیمیں پہ ذرا آبی نقاب
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا کیا سبزہ ہے۔ کیا گل ہے۔ کیا ابرِ بہار
لطف ہے گر ہوئیے فیضِ ربِ ذوالمن آب میں

مدح کر اس شاہِ دریا دل کی اے دل جس کا فیض
لعل و گوہر ہے بہاتا وقتِ گفتن آب میں

شاہ اکبر خسروِ غازی کہ آبِ تیغ سے
رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بہ گردن آب میں

ہے میکشوں کے واسطے میخانہ تخت جم
یاں جام مے ہے سامنے گر جام جم نہیں

چمکا یہ آتش دل پروانہ کا ہے رنگ
اے شمع رو عیاں شفق صبحدم نہیں

ہے لوث حب زر سے یہ دامن ہمارا پاک
گر چھینٹ بھی پڑے تو بجز درم نہیں

گر آب دیدہ شربت کوثر بھی ہے تو کیا
جب تک کہ اس میں چاشنی درد و غم نہیں

حالت ہوا اب یہ زار ترے دلفگار کی
ہے چشم زخم منہ پہ کہ جو چشم نم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دل گمشدہ کا کھوج
ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

ہاتھوں سے چرخ تفرقہ پرداز کے کبھی
کر سکتے آہ وصلت تا ساعت بہم نہیں

سرباز عشق کے لیے دار الاماں کہاں
انفوس قطع سے سر شمع سے ہم نہیں

جاتا ہے آنکھیں بند کئے ذوق تو کہاں
یہ راہ کوے یار ہے راہ عدم نہیں

عالم شباب کی غزل ہے یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی (دیکھو صفحہ ۱۱۲) اس کشش کی مقناطیس بہت لگائی مگر استاد نے کبھی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں وہی دیوانِ ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کرکے چھپواتے تھے۔ مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے اُنہیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے ان ہی کی زبان سے نکل گئی تھی حکیم کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے مگر خلیفہ صاحب کے سبب کھٹکتے تھے خیال تھا کہ حضور پھر انہیں نہ ہتیں سپرد نہ کردیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہوجاتے تھے۔ آخر میرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا حالانکہ استاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے [illegible]

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارتگر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ہیں

طرحِ مشاعرہ کی غزل ہے۔ جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی:-

غمزہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شور الغیاث صریرِ قلم نہیں

وہ دل ہے کونسا کہ ستم پر ستم نہیں
گر یہ ستم ہیں روز تو اک روز ہم نہیں

مضموں کے پیچ و تاب سے تابِ رقم نہیں
ہے زلفِ یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں

بعد از فنا بھی جوشِ جنوں میرا کم نہیں
کس وقت زادِ راہ سرِ دشتِ عدم نہیں

گو اضطرابِ دل کو عیاں کرتے ہم نہیں
پر جو نگاہ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں

جوشِ شگفتگی ہے محبت کا خستہ نہیں
یہ خوں خراشِ دل میں تبسم سے کم نہیں

آتش میں آپڑا تو ہے میری طرح سپند
لیکن کہاں کہ جائے کا ثابت قدم نہیں

یہ دل مجھے ڈبو کے رہیگا کہ سینہ میں
وہ کونسا ہے داغ جو گردابِ غم نہیں

منظور دل کو کاوشِ غم کی ہے مشق اگر
بہتر مژہ سے یار کی کوئی قلم نہیں

ہیں آمدِ بہار سے بھر لائے منہ میں خوں
یہ زخمِ دل تبسمِ غنچہ سے کم نہیں

ہم کافرانِ عشق کو ہے یہ بڑا عذاب
دوزخ میں آتشِ آتشِ سنگِ صنم نہیں

مجھ روسیہ کو کب نہ ہوا سجدہ سرفرو
کب گردنِ تجلیاتِ محراب خم نہیں

مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اہلِ صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر
گوہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

وحشی کو تیرے دشت ہی ہے عرصۂ بہشت
آہو کی شاخ شاخ سے طوبیٰ کم نہیں

اللہ رے ضبطِ دل کہ مری [illegible] بر سرِ عزار
گیسوئے دودِ شمع میں بھی پیچ و خم نہیں

اے عہدِ یار ہے تو زمیں پہ کہ اٹھ گیا
ڈھونڈوں کدھر سراغ کہ نقشِ قدم نہیں

منصوبہ مارنے کا مرے کرتے ہیں حریف
اور مجھ میں مثلِ بازیٔ شطرنج دم نہیں

تو نے جو ہاتھ قتل سے کھینچا تو کیا ہوا
رکتی کسی طرح تری تیغِ ستم نہیں

صاحب پرنسپل سے مدرسہ دلی مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ رات کے ۹ بجے شہر کے دروازے بند ہوجاتے تھے۔ گڈھ کپتان صاحب سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن دروازہ ۲ بجے رات تک کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے اُٹھا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر اور علماء موجود ہوتے تھے مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کیطرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل پڑھی۔

ہم پھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیاں	پر نہیں اے ہمت غیر اپنے بس کی تیلیاں

دوسرے مشاعرہ کے لیئے یہی طرح ہوگئی۔ استاد مرحوم نے دو غزلہ لکھا اس میں کچھ تکرار ہوئی اس پر جوش میں آکر استاد نے فرمایا کہ برس دن تک علاوہ غزل طرحی کے ایک غزل اسی زمین میں اور ہوا کرے۔ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ تیسرے جلسہ میں انہوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ استاد مرحوم کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھا۔

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا	ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر گفتگو زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند ہوگیا۔ استاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہ ملیں پہلے مشاعرہ کی غزل بہت خوب تھی۔ دو مسودے ساتھ آگئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدہ کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے۔ غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ ۶۰ برس گذرے اب تک اس مشاعرہ کی باتیں زباں بزباں یادگار چلی آتی ہیں۔

آفتِ جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں	ورنہ ہیں یاں بال و پر تارِ نفس کی تیلیاں
استخواں ہیں جس تنِ لاغر میں جس کی تیلیاں	تیلیاں بھی وہ کہ جو ستر برس کی تیلیاں
رخصتِ پرواز گر دیویں قفس کی تیلیاں	جا کے دیکھ آئیں جو کچھ رکھتی تھیں خس کی تیلیاں
دل کے شعلوں سے قفس کے پیش و پس کی تیلیاں	یوں جلیں اُڑ جائیں جیسے خار و خس کی تیلیاں

جیسے ہی جی کیا ملکِ فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے ادھر سے جب کے چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں
کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی ۔ کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں
ایک ایک جور و ستم پر اُسکے سَو سَو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں ۔
غم کہتا ہے دل میں رہوں میں اسلوبِ جاناں کہتا ہے میں!
کس کو نکالوں کس کو رکھوں ! یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں
بحر میں موتی پانی پانی ۔ لعل کا دل خوں پتھر میں ۔
دیکھو لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں
دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر
دل کا ذکر رہا کیا باقی ۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں
حضرتِ دل کا دیکھنا عالم ۔ ہاتھ اُٹھائے دنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں شکوہ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جن دنوں شاہ نصیر مرحوم سے معرکے ہو رہے تھے ۔ منشی فیض[۱] پارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا ۔ لکھنؤ سے آ کر مشاعرہ قایم کیا ۔ وہ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے ۔ اُنہی دنوں دلی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا ۔ اُنہوں نے اُسکے مدرسے کے سلسلہ میں لے لیا اور انشائے اردو کی ترقی کا جزو اعظم قرار دے کر

[۱] منشی صاحب مغفور میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے ۔ پھر دلی کالج سابق میں مدرس سیاق ہو گئے تھے میں نے بھی ابتدائی حساب اُن سے سیکھا تھا ۔ ۱۸۵۱ء میں مرے ۔

سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالمِ معنی سے ذوق
ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں

اس غزل کے ۵ شعر لڑکپن سے یاد تھے۔ ایک دن میں نے پوری غزل مانگی۔ فرمایا عالمِ شباب تھا۔ ایک مکان ہمسایہ میں بکنے لگا۔ ہم نے لے لیا۔ بعض اشخاص مارج تھے اُنھوں نے نالش کردی۔ مولوی فضل حق عدالت میں سررشتہ دار تھے۔ بڑے با اختیار تھے۔ ہمارے مشاعرے کی شناسائی تھی۔ ضرورت لگی کہ مقدمہ کا حال سناویں خیال ہوا کہ وہ شعر کی فرمائش کرینگے کچھ انھیں کے رنگ میں کہنا چاہیئے۔ اللہ اللہ وہ زمانہ اُن کی فضیلت فلسفی کا شہرہ۔ اور ہم بھی اُن دنوں ہی کتابیں دیکھ رہے تھے عجب ولولہ طبیعت میں پیدا ہوا۔ وہ خود بھی شاعر تھے عربی شعر کہا کرتے تھے۔ اُن کا گھرانا شاعر تھا۔ بلکہ خیرآباد کے بہت لوگ شاعر تھے اردو فارسی سب کہتے تھے۔ ان دنوں بہت لوگ دلی آگئے تھے۔ مولوی فضل حق کا بھی شباب تھا مرزا نوشہ اُن کے بڑے یار تھے۔ غرض جب ہی یہ غزل لکھی تھی۔ خدا جانے اب کہاں پڑی ہوگی۔ شکر ہے آزاد کے لیئے اللہ نے دو دو تین تین شعر کرکے ۱۹ شعر دیئے۔

آج اُن سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

وصفِ چشم و وصفِ لب اُس یار کا کہنے کو ہیں
آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُسکو دیکھ کر صلِ علیٰ کہنے کو ہیں

بہرے شبنم سے نہ بھر سیماب گل کے کان میں
بلبلیں احوالِ دل کچھ اے صبا کہنے کو ہیں

دیکھئے آئینہ مبت بن خاک میں ناصاف سب
ہیں کہاں اہلِ صفا اہلِ صفا کہنے کو ہیں

ومبدم رک رک کے جو منہ سے نکل پڑتی زباں
وصفِ اُسکا نہ کچھ فوارے یا کہنے کو ہیں

اب تو رات آخر ہوئی میری طرف دیکھو ذرا
مسجدوں میں لوگ اذاں اے مہ لقا کہنے کو ہیں

میں ترے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا مارے ہیں تیر
سب دہانِ زخم منہ سے مرحبا کہنے کو ہیں

میرے دل کے آبلے دیکھے تو منہ فق ہوگئے
زردیوں ہی دانہٴ کہربا کہنے کو ہیں

گر ہر سیلا بھی رکھتے ہو خس کی تیلیاں
لیجئے مژگاں کی مجھ بے دسترس کی تیلیاں

گر رگ گل سے ہوں بلبل کے قفس کی تیلیاں
کاٹتے آنکھوں میں چبھو ہیں اسکے خس کی تیلیاں

طائرانِ رنگ گل کا فکر کیا اے باغباں
ہیں یہی رکھلے گل اُسکے قفس کی تیلیاں

اے مہندس مرغ ساعت کو اگر کرتا ہے بند
لے ہوا میں اُڑکے آوازِ جرس کی تیلیاں

میں ہوں دیوانہ کسی کے سبزۂ رخسار کا
مار و پھولوں کی جگہ تم مجھ کو خس کی تیلیاں

سوزِ غم سے ہیں سلگتے جسم و جانِ ناتواں
لب کا یہ کوڑا تھا یارب کے برس کی تیلیاں

کشتۂ مژگاں کے گنبد کا ہے مرقد اے صبا
بیالگا اس پر عوض زریں کلس کی تیلیاں

طائر رنگ حنا کا شوق اُڑ جائے پری
تیرے ہاتھوں کی لکیریں ہوں قفس کی تیلیاں

پنجۂ مژگاں جو جاروب سمندِ ناز ہے
تاب اب لائیں لگدکوب فرس کی تیلیاں

لیجا دنیا سے دل یا کاسۂ روغن حریص
اس میں کیوں رکھتا ہے جاروب ہوس کی تیلیاں

چشم گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائینگی سب میرے قفس کی تیلیاں

شیخ کی داڑھی تو حاضر ہے لگا دے ساقیا
گر نہیں شیشہ کو ہیں درکار خس کی تیلیاں

ہے دوانی اس شجر کیواسطے تازہ خزاں
تیتے بیخ کر رہ گئیں خالی سرس کی تیلیاں

موے مژگاں ہیں کہ رکھتے ہیں ترے شہباز چشم
آشیاں کے واسطے چُن چُن کے خس کی تیلیاں

ہے یہ مرغ دل بلبل رگ گل کا قفس
اس سے نازک اور کیا ہونگی قفس کی تیلیاں

ق

[illegible] صیاد [illegible] کا شوق
[illegible] بلبل کو تاروں سے قفس کی تیلیاں

جب ہیں مرغ تر دماغ [illegible] کیا سبب
پا نہیں صندل کی چوبیں اور خس کی تیلیاں

اڑکے جا پہونچے [illegible] کیطرح
قفس جو [illegible] صد ان زودرس کی تیلیاں

طرزِ نالہ مجھ سے گر سیکھیں بتا دیویں ابھی
صورت ققنس بنکے آوازیں جرس کی تیلیاں

شیخ تل شکری جو لائے لعل لب کے سامنے
گُل کا دونا تھا مگر شاخ عدس کی تیلیاں

آگئے ان نالوں کے ہیں یوں خار خس جو رقیب
[illegible] آتش نفس کی تیلیاں

کارواں حیرت کا تھا شب تنکا تنکا دشت میں
رہ گئیں بن بن کے آوازیں جرس کی تیلیاں

کیا بگوے کیطرح خاک کا پتلا اے ذوق
اڑتا پھرتا ہے بھری جب سے ہوا ہے اس میں

کرے وحشت بیاں چشمِ سخنگو اسکو کہتے ہیں
سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے
جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا۔ ٹل گیا سارا
عدوے نیش زن سر دم ہے میرے درپے ایذا
گوارا تلخیٔ مے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو
گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زلفِ مشکیں کی
جو پوچھے عقل یہ دل سے۔ بتا کیا نام ہے تیرا
کبھی شیریں نہ دل سے کوہکن نے کوہ کو کاٹا

یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اسکو کہتے ہیں
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اسکو کہتے ہیں
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اسکو کہتے ہیں
یہ موذی زہر کی ہے گانٹھ بچھو اسکو کہتے ہیں
کہ دارو تلخ ہی بہتر ہے۔ دارو اس کو کہتے ہیں
معطر ہو گیا آفاق خوشبو اس کو کہتے ہیں
کہوں دیوانہ چشمِ پریرو اسکو کہتے ہیں
محبت یہ نہیں ہے زور بازو اسکو کہتے ہیں

اجل سو بار آئی ذوق پر جب تک نہ وہ آئے
نہ پایا دم نکلنے میرا قابو اسکو کہتے ہیں

عنقا کیطرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہیں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
اُس در پہ شوق سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
ہوں طائر خیال نہ پر ہیں نہ میرے بال
سرگشتگی بخت نہ دے مجکو اتنے پیچ۔
یارب کوئیں کا تارا ہوں یا آسمان کا ہوں

ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں
میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں
مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں
پرواز کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں
کچھ چینِ زلف کچھ شکنِ آستیں ہوں میں
نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
کرتے اظہار ہیں در پردہ عداوت اپنی
دل کا یہ حال ہے پھٹ جائے ہے سو جائے سے اور

چشم پر آپ سے آئینے وضو کرتے ہیں
کیوں مرے آگے جو تعریف عدو کرتے ہیں
اگر اک جائے سے ہم اسکو رفو کرتے ہیں

سلہ کوئیں کا تارا۔ دیکھو صفحہ ۵۵

دیکھ تو لے پہنچے کس عالم میں کس عالم میں ہیں
نالہائے دل ہمارے نارسا کہنے کو ہیں

گاہ دامنگیر باد و گہ بیاباں گرد خاک
اب تو تیرے عاشقوں کے دست و پا کہنے کو ہیں

وہ جنازے پر مرے کس وقت آئے دیکھنا
جب کہ اذنِ عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

ہے جہاں مانند مجمر اور ہم مثلِ سپند
اب چلے جائیں گے آئے اک صدا کہنے کو ہیں

پوچھو قاتل سے کریگا قتل آخر کب تلک
اپنی تاریخ آج ہم پیش از قضا کہنے کو ہیں

میرے سودا کا اطبا کر نہیں سکتے علاج
یونہی خبطی - خبط و مالیخولیا کہنے کو ہیں

مٹ گئے جوہر وفا کے اٹھ گئے سب اہلِ دل
اب وفا ہے نام کو اور با وفا کہنے کو ہیں

ہے صفا دل وہی جس میں عیاں ہو شکلِ یار
یوں تو آئینوں کو دل بھی با صفا کہنے کو ہیں

کیا تماشا ہے کہ ان کے کان میں اٹھا ہے درد
ہم جو آئے دردِ دل اپنا ذرا کہنے کو ہیں

بے سبب سوفار اُن کے منہ نہیں کھولے ہیں **ذوق**
آئے پیکِ مرگ پیغامِ قضا کہنے کو ہیں

گر ترا نور نہیں چشم میں کیا ہے اس میں
کہنا فیہ نظرٌ عین خطا ہے اس میں

دل کو کیا دیکھیگا تو چیر کے کیا ہے اسمیں
اب تو قطرہ بھی نہیں خوں کا رہا ہے اس میں

رسن اندازِ چاہِ ذقنِ یار میں زلف
نہیں معلوم کہ دل کس کا گرا ہے اس میں

عشق کی تلخیٔ حسرت کے جو دیتے ہے مزے
بے مزہ رہتے ہیں ہم کچھ تو مزا ہے اس میں

تو نگیں توڑ نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اسمیں ہے یا ہے اس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں - گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آبِ بقا ہے اس میں

دیکھیے عشق میں جاں وامق و قیس و فرہاد
اور ابھی دیکھئے کس کس کی قضا ہے اسمیں

اس جفاکیش کی نامہ کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اس میں

شیشۂ سبز فلک سے نہ طلب کر شئے عشق!
مے کہاں اس میں ہے زہراب بھرا ہے اس میں

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیٔ وفا ہے اس میں

عجب عالم ہے اب دل کا کہ انکے اک اشارہ پر
کھٹک جاتے ہیں جائے دل میں سو نشتر ہے اوپر ہیں
پسِ دیوارِ گلشن ہم پڑے ہیں ناتوانی سے
ابھی طاقت کرے یاری تو اڑ کر فرش اوپر ہیں

تم وہ غضب کہ ہوتے کبھی کم ایسے شخص ہیں
اور ہم تمہیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں
صاحب دلوں نے کعبۂ دل پر کیا مقام
کب کرتے قصد دیر و حرم ایسے شخص ہیں
دیوانے تیرے دشت میں رکھینگے جب قدم
مجنوں بھی لے گا آگے قدم ایسے شخص ہیں
دیں کیا ہے مالک دیجئے ایمان بھی نہیں
زاہد بہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

چاروں شعر مرقوم الذیل لڑکپن کا کلام ہیں۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ بتاں کا لفظ بے اضافت محاورہ میں عام تھا۔ میر و سودا کے دیکھنے والے موجود تھے۔ دلی کی زبان یہی تھی اُسی محاورہ میں انہوں نے شعر کہا۔ بگی کی سواری اور فرنگی زاد کا مضمون اس وقت نیا معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فرنگی دلی میں نظر آتا تو ایک عجیب صنعت الٰہی سمجھ کر ہم باہم دکھایا کرتے تھے۔ کہ دیکھو وہ فرنگی جاتا ہے۔ زمانہ کا مزاج اور اس کی طبیعت کا ایک عالم ہے کہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ جو لفظ آج سماعت کو ناگوار ہے۔ اسوقت خوشگوار تھا۔ ورنہ آسان ہے۔ کہہ دیتے۔ مصرع

ہیں صنم محوِ خود نمائی میں

ہیں بتاں محوِ خود نمائی میں
ہوکے اک بوسہ پر ترش ابرو
نہیں بگی میں وہ فرنگی زاد

ہیں پر خودی خدائی میں
بات کو ڈالنا کھٹائی میں؟
ماہ ہے منزل ہوائی میں

ذوق ہے ایک رند شاہد باز
اس کو کیا دخل پارسائی میں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

تو ڑیں اک نالہ سے اس کاسہ گردوں کو مگر	نوش ہم اس میں کبھی دل کا لہو کرتے ہیں
قدر دل جو کو تمہارے نہیں دیکھا شاید	سرکشی اتنی جو سر و لب جو کرتے ہیں

ایک دن حافظ ویران اور میں استاد کے ہاں بیٹھے تھے اور بعض شعرائے عصر کے بندشی مضمونوں کے باب میں گفتگو کر رہے تھے۔ ع

ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا

اور ع

مینڈھا حلال کرتے ہیں دریائے تیل کا

استاد نے فرمایا اپنے مضامین کو استعارہ و تشبیہ میں اتنا زیادہ زور دینے سے کلام بدمزہ ہو جاتا ہے۔ بعد اسکے غزل مرقوم الذیل کے اشعار سنائے۔

رکھتا ز بس کہ جیفۂ دنیا سے ننگ ہوں	پارس بھی ہو تو جانتا مردار سنگ ہوں
ہوں وہ شگفتہ دل کہ نہ دوزخ سے تنگ ہوں	آہن تو آگ میں ہوں مگر لالہ رنگ ہوں
ہیں سب سے پہلے میرے اٹھانے کی فکر میں	محفل میں ان کی میں کسی چوسر کا رنگ ہوں
دل بیٹھا محو ضبط ہے اور مجھ کو اضطراب	دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں دل سے تنگ ہوں
پروانہ گر نہیں تو نہیں پر ہوں شعلہ دوست	مکھی بھی ہوں تو حال دہانِ تفنگ ہوں

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں	نفس اک تار ہے سینہ میں سمجھو یا گریباں میں
کہاں ڈھونڈے کوئی دل کو ہجوم داغ سوزاں میں	ملے کھوج ایک پروانہ کا کیا گنج شہیداں میں
نہ ہو لیگی کبھی ہمدم شکایت تشنہ کامی کی	رہے آب اسکے جب تک تیغ میں خنجر میں پیکاں میں
تمہارے تیر ہیں شاداب کرتے دل کے زخموں کو	ہمیشہ آب پیکاں سے ہے شبنم اس گلستاں میں
جو لذت آشنائے مرگ ہو تو خضر تو [illegible]	[illegible]

مرے نالے کہیں اس گنبد بے در سے اوپر ہیں	ہوا کیوں باندھتے بادل یونہیں آ پڑا اوپر ہیں
گذر جاتے ہمارے نالے انکے سر سے [illegible]	ہوا کس سے نہیں دیتے اڑا اوپر سے اوپر ہیں

کہتی ہے ماہی بریاں کہ دبیرانِ قضا
داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہوں میں

سمجھو نہ سہل تم خفقاں کو حکیم جی
حضرت اسے بھی جانئے ہمزادۂ جنوں

واؤ

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قایم ہوا۔ اس میں یہی طرح تھی۔ استاد نے یہ دوغزلہ پڑھا تھا۔ جوانی کا عالم تھا۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ قافیہ پیمائی سے دق ہو کر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے۔ جس شعر پر سب اُن میں شاہ نصیر مرحوم کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ اور بعض اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے کہیں کہیں اُن کی طرف بھی اشارے ہیں ہر ایک کی طرح طولانی ہے۔ اور فائدہ کچھ نہیں۔ قلم انداز کرتا ہوں۔ بر سر معرکہ واقفانِ حال موجود تھے انہوں نے مزے لئے۔

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو
کہ فلک آیا نظر غال سے چھوٹا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو
اور جوں خیمۂ لیلےٰ ہے سویدا ہم کو

اُس نے خط جو قلمِ سرمہ سے لکھا ہم کو
لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو
ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو

شوق مستی ہے سبب گلگشتِ چمن کا ہم کو
چاہئے جائے عصا گردنِ مینا ہم کو

ہوویگا کشتیِ طوفان زدہ تابوت اتنا
آگیا ایسے اگر مرنے پہ رونا ہم کو

بستگی دل کو ہے کیوں اُس گرہِ زلف کے ساتھ
کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معما ہم کو

ہیں وہ دیوانے کہ جن کو بیڑیاں درکار ہیں ۔۔۔ ہم اسیرِ زلف ہیں۔ کافی ہمیں دو تار ہیں!

کمندیں اور بھی یوں تو کمند انداز رکھتے ہیں ۔۔۔ تری زلفوں کے خم۔ کچھ اور ہی انداز رکھتے ہیں

کیا صوفی کیا کیش۔ قائل مرے دونوں ہیں ۔۔۔ پر مذہب و مشرب سے۔ غافل مرے دونوں ہیں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آتے ہیں ۔۔۔ بے وفا پوچھے ہے۔ کیا دیر ہے لیجاتے ہیں

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اٹھے ہیں ۔۔۔ آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں ۔۔۔ ہوئے برسوں۔ نہ ہوئی پر وہ تمہاری پرسوں

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں ۔۔۔ کہ تھا بلبل کی گردن کا۔ پڑا قمری کی گردن میں

رخصت جو ہوکے ہم سے۔ جاتے وہ اپنے گھر ہیں ۔۔۔ گھبرا کے پہنچتے واں۔ ہم ان سے پیشتر ہیں

زاہد گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں ۔۔۔ وہ کہے اللہ ہو۔ اور میں کہوں اللہ ہوں

شعرِ مرقوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدا کے مرثیہ میں لکھا تھا کئی بند اس کے بندۂ آزاد کو یاد ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہونگے۔

کرتے اپنے سر کو جو نوکِ سناں پر تاج ہیں ۔۔۔ عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں

کٹا کر اپنا سر نوکِ سناں پر تاج کرتے ہیں ۔۔۔ حصول اس طرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں

دل میں تھے قطرۂ خوں چند سو مانندِ انار — ترے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو

مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے اُن کا خیال — کیوں نہ فانوسِ خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم وہ ہیں وحشیِ لاغر کہ چھپا لیتی ہے — زیرِ دامن نگہِ آہوے صحرا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوقؔ اُسکی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو تسلی یا ہم کو

آسماں اور وہ انسان بناتا ہم کو — خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملاتا ہم کو

ذبح کیوں کرتے ہی فتراک سے باندھا ہم کو — چھوڑ رہنے دے تڑپ کر ابھی ٹھنڈا ہم کو

دل شکستہ مگر اُس یار نے سمجھا ہم کو — خط بھی جو خطِ شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

باعثِ رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو — تجھ پہ بن دیکھے ہے غش جب سے کہ دیکھا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سُبک ایسا ہم کو — لے گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا — وہ نصیب اُس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہے وہی جنبشِ لب سے جراحت میں قتل — کس لبِ تیغ کے بوسہ کا ہے لپکا ہم کو

ہم وہ ہیں گرم رہِ راہِ وفا جوں خورشید — سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ٹپکا مژگاں سے لہو ہو کے جگر آخر کار — ایک مدت سے اسی ٹپکے کا ڈر تھا ہم کو

خالِ سرمہ کو تمہیں چاہئے زیبائش کو — اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

یہ تو یوں مضطرب اور سایہ نہیں لاکھوں روزن — دل کا رہنا نظر آتا نہیں اچھا ہم کو

خطِ توام سے لکھو گو یہ تاریخِ وفات — کرتی قتل کی تا عمر ہے تمنا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاکِ سرِ کوے تیری — خوابِ شب بسترِ مخمل پہ نہ آیا ہم کو

جس کی آواز سے ہوں رونگٹے مو بال کے کھڑے — وہ محبت نے دیا سلسلہ پا ہم کو

اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کے — کہ دیا زہر بھی گر اُس نے تو میٹھا ہم کو

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے — ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

ٹپکے ہے جائے عرق ہر بنِ مو سے پیکاں — یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ گردِ رمِ آہو کی طرح
بھاگے ہے دور ہی سے دیکھ کے صحرا ہم کو

کس سے تدبیرِ درستی ہو ہماری جوں زلف
کہ شکستوں سے بنایا ہے سراپا ہم کو

جابجا نام تو جوں نقشِ قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈھنے عنقا ہم کو

اور ہمدرد کہاں ۔ ہو نہ ہو اے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو

پھینک کر شیشۂ دل ہاتھ سے کہتا ہے وہ مست
کہ بنانا تھا ہتھیلی کا پھپھولا ہم کو

اثرِ کفر ہے طاعت سے بھی اپنی پیدا
نقشِ سجدہ کا ہے پیشانی پہ ٹیکا ہم کو

نخلِ خرما کی طرح باغِ محبت میں ملا
کثرتِ زخم سے اک خلعتِ زیبا ہم کو

ایک دم تنگ وہ آئے تھے بغل میں اُس پر
غمِ دوری سے کیا تنگ ہے کیا کیا ہم کو

دم میں دم اب نہ رہا اپنے جو ٹھہریں کوئی دم
ہاں مگر ہو ترے آنے کا بھروسا ہم کو

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیِ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھوکا ہم کو

ہو سکے لاغری و ضعف کہاں مانعِ شوق
تیری جانب پرِ پرواز ہیں اعضا ہم کو

ہو گئے جس کی طرف جوں گلِ بازی اُسنے
پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو

رشک تھا اپنے نوشتہ پہ کہ اس نوخط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو

ہر قدم پاؤں میں سر رکھتے ہیں خارِ سرِ دشت
اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو

کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو

اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہرِ دل
طوفِ گرداب صفت چاہئے اپنا ہم کو

لگ گئی آنکھ جو سودے میں تری زلفوں کی
شب سیاہی نے کئی بار دبایا ہم کو

حرفِ تلخ اُس لبِ شیریں سے ہر اک بات پہ آہ
ناصحا سنتے ہیں ہم کچھ تو ہے میٹھا ہم کو

خاک سے کیونکہ ہماری گلِ رعنا نہ اُگے
کہ کسی گل کی دورنگی نے ہے مارا ہم کو

ایک دم عمرِ طبیعی ہے یہاں مثلِ حباب
فکرِ امروز ہے نے ہے غمِ فردا ہم کو

جتنے عاشق ہیں ہم ۔ ایک کا ہے ایک عزیز
شمع سے چاہئے ہے خون کا دعوے ہم کو

کیا ستم ہے کہ پئے قطعِ رہِ عشق فلک
آرہ ساں دیتا ہے دنداں عوضِ پا ہم کو

اے زاہد دورنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانند صبح کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اے صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر
داماں و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

جو سوتی بھیڑ اپنے شر و شور سے جگائے
دروازہ گھر کا اس سگ دنیا سے بھیڑ تو

چھٹتا ہے کوئی مر کے گرفتار دام زلف
تربت پہ اس کی جال کا پائے گا پیڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزل فراق
غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت سے ہاتھ اٹھا
اے ذوق یہ اٹھانہ سکے گا کھکیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو
یاں کہاں راحت۔ جراحت پر جراحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
خشت غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شور قیامت جس کو وہ اے چشم یار
تیرے مستوں کی صفیر خواب غفلت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

انتظار یار میں جو چشم ہو جائے سفید
مردمک اس میں کہاں ہو داغ حسرت ہو تو ہو

دست ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گذری زندگانی عمر بھر
جان شیریں کے دینے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
لگے مکتوبوں میں کچھ اس سے کتابت ہو تو ہو

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن سے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

غزل مرقوم الذیل اور اس کے بعد کی غزل ابتدائی مشق کی تحریریں ہیں جب ان میں سے پہلی غزل لکھی اور دوستوں کو سنائی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی آواز گئی۔ سب خوش ہوئے۔ اور تعریفوں نے جوانی کا دل بڑھایا۔ فرماتے تھے کہ ابتدائے عمر طبیعت کی امنگ۔ دل باغ باغ تھا کہ آج ہم نے وہ غزل لکھی جواب تک

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

ہم وہ ہیں رند کہ اس عالمِ پیری میں بھی ہے
اُنس میخانہ سے جوں پنبۂ مینا ہم کو

سنگدل تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنے کا دھڑکا ہم کو

تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشکِ ہمارا ہم کو

پھرتے ہی آنکھ کے پھیرینگے گلے پر خنجر
ہو چکا آپ کا معلوم ہے ایما ہم کو

گرمیٔ تپ سے ہوا سوزِ دروں جو افشا
آ گیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

حسرت اے خوارئ وحشت کہ گریباں کا تار
ہو گیا ضعف سے تارِ رگ تارا ہم کو

کھا لے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ ہے زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو

نہ اٹھیں شورِ قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہے جب تک کہ نہ تم قُم لبِ مینا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھبتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

وصل کا اُس کے تصور جو بندھا رہتا ہے
تو مزے ہجر میں بھی آتے ہیں کیا کیا ہم کو

واہ قسامِ ازل صدقہ ہم اس قسمت کے
جامِ عشرت اُسے اور داغِ تمنا ہم کو

دل میں نشترِ نگہِ یار کا آ ہی کھٹکا
وہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

کشتہ ہی ہوتا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
کچھ کشندہ سے نہیں خون کا دعویٰ ہم کو

(ق) رہی ہر طرح سے عیدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اُس بتِ بیدرد کے ایذا ہم کو

صید ہی میں نہ فقط ذبح کا کچھ قصد رہا
صلح بھی ٹھیری تو پھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوق بازیگہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہو وے گا
سو بار جڑ سے پھینک دے اُس کو اکھیڑ تو

عمرِ رواں کا توسنِ چالاک اس لئے
تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو

بھی دے دیا۔ یعنے پہلے کہا تھا۔ ع زلف بنے وہ دستِ موسےٰ۔
اب پڑھا۔ ع۔

پھر زلف بنے وہ دستِ موسےٰ جس میں اخگر آتش ہو
شاہ مرحوم خوش ہوگئے اور یہ ترمیم ایسی بدائۂ ہوئی کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ نوجوان کی شوخی طبع تھی۔ عمداً پہلے پھر کا لفظ نہ سنایا تھا۔ یہاں آپ ہی چوٹ کھائی۔ آپ ہی اس کا توڑ کیا۔

غزل اول

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مز دتملق ہو۔
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پاؤں پر جان حق ہو
جو مے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو۔ تو سرخی نہ کیوں اُسکے رخسار پر ہو
غروب آفتابِ درخشاں اگر ہو۔ تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو
کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی۔ لئے دست افسوس کے دو ورق ہو
کروز دو نو آنکھوں کے طبقے یہ روشن کہ ہو جاؤ رشکِ مہ چاردہ تم
سنا ہے کہ تم نور سے اپنے کرتے۔ منور بہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
یہ کشتوں کا اُس مانگ کے اک پتا ہے کہ اُن تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی
اگر سنگِ موسیٰ کا تعویذ رکھدے۔ تو رکھتے ہی بس درمیاں سے وہ شق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرایا تو نے تو یہ تھا سمجھ کر۔ نکل جائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو
اگر رشکِ گلشن نہ ہو مجھ سے باہم۔ تو گلشن میں ہو دے یہ وحشت کا عالم
چٹکنا ہو غنچوں کا آوازِ ضیغم۔ چمن مجھ کو اک وادیٔ لق و دق ہو
اگر زخم سینے سے پھاہا اٹھاؤں۔ تو خورشید محشر کو میں تپ چڑھاؤں۔

کسی نے نہ لکھی تھی۔ اللہ تیرا شکر کہ تو نے یہ نعمت دی۔ ساتھ ہی دوسری غزل اور بحر میں لکھی۔ زمانہ کے ناموروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آتی تھی۔ دوسری غزل پہ ناخوشی کی نوٹ بھی۔ اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی۔ یہ جائز نہیں۔

آغاز عمر۔ ابتدائے مشق۔ کوئی تقویت دینے والا ساتھ نہیں۔ گھبرا گئے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب ان دنوں زندہ تھے۔ ان سے جا کر حال بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ معترض بے خبر ہیں۔ فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ اور خوش آئندہ بحر کا نکالنا حسن طبع ہے نہ کہ عیب۔ استاد نے کلیات بیدل دیکھا تو بہت غزلیں نئی نئی بحروں میں نکلیں۔ انہیں دیکھ کر دل قوی ہوا۔

وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اس وقت کی باتیں نئی روشنی والوں کو عجب معلوم ہوتی ہیں۔ شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح بند تھی۔ مگر آمد و رفت اسی آداب و تعظیم کے ساتھ جاری تھی جو کہ اہل سعادت کی عادت ہے۔ اور وہ بھی شفقت بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ بموجب معمول کے ایک دن ان کی خدمت میں گئے اور سب حالات سنا کر دونوں غزلیں سنائیں۔ انہوں نے بھی کہا کہ خوب غزلیں لکھیں بلکہ یہ بھی کہا کہ دوسری غزل بہت خوب ہے۔ اسے مشاعرہ میں پڑھنا۔

استاد مشاعرہ میں گئے تو تعمیل فرمائش کا خیال کر کے اس غزل کو بھی لے گئے اور غزل طرح کے بعد شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ اجازت ہو۔ فرمائش کی تعمیل کروں۔ انہوں نے فرمایا۔ ہاں بھئی سناؤ۔ جگہ تو یہی ہے۔ اب کچھ تو ابتدائی مشق۔ کچھ بحر نئی۔ غرض اتفاق یہ کہ غزل دودم کے مطلع میں مصرع دوم پر بحر کا لفظ نہ تھا۔ جب استاد نے مطلع پڑھا تو شاہ صاحب نے اس کی تعریف معمول سے کچھ زیادہ کی اور کہا کہ بھئی! اس مطلع کو پھر پڑھنا۔ استاد مرحوم رُکے کہ یہ بات کیا ہے؟ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا۔ اور لفظ

گر کلکِ آہ کو گردش دوں تو دودۂ شمع دل سے مرے
طاؤس فلک کا سینہ ابھی۔ جوں سینۂ باز منقش ہو

جب ضعف سے مجھ کو غش آیا تو طرز سے وہ کیا کہتا ہے
بس غش نہ کرو ہم جان گئے تم مرنے پر از حد غش ہو

کیا خون کے دریا جذب کئے ہیں خاکِ کوچۂ قاتل نے
مدفن کو بھی اُس کے ستم کش کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

بس چھوڑ دو دامن قاتل کا لو ہاتھ بہائے خون سے اٹھا
جب اپنا بہا خوں پاؤں پہ اُس کے دل کیوں اُسکا شوش ہو

کیا رجز کو کر مقطوع و مرفل تم نے یہ غزل لکھی ہے
ذوق اس کی بحر کو سن کر شاداں روح خلیل و اخفش ہو

دن کتنا چاہیئے اب رات کدھر کاٹنے کو
جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو

ہائے صیاد! تو آیا مرے پر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو

اپنے عاشق کو نہ کھلواؤ کنی ہیرے کی
اس کے آنسو ہی کفایت ہیں جگر کاٹنے کو

دانت انجم سے نکالے ہوئے تجھ بن مجھ پر
مُنہ فلک کھولے ہے اے رشکِ قمر کاٹنے کو

وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں
باغباں نے ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو

سر و گردن جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر
چاہیے دل یار کا جو رنگ اگر کاٹنے کو

شام ہی سے دل بیتاب کا ہے ذوق حال
ہے ابھی رات بڑی چار پہر کاٹنے کو

چرخ ضدی ہے کوئی ضد نہ دلاوے اسکو
کہ نہ نے خود کو غرتے تو جلاوے اُس کو

دیکھیں تم کیسے بھلکڑ ہو جسے کرتے ہو یاد
بھول تو جاؤ بھلا میرے بھلاوے اُس کو

قالب خاکیِ انساں کو بنا کر کچا
عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکاوے اُس کو

آبرو خاک ہیں دی اس نے ملا آئینہ کی
مجھ سا ہو آئینہ تو منہ دکھاوے اُس کو

اگر سینۂ داغ دل کو دکھاؤں۔ تو صبح قیامت کا منہ دم میں فق ہو

یہ بحر و قوافی غزل کی بدلکر۔ رقم اک غزل کر کرائے ذوق جس میں
نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق۔ جو فی الجملہ کچھ ہے تو مضمون نو ہو

غزل دوم

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے۔ گر اس میں تا زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دست موسےٰ۔ جس میں اخگر آتش ہو
اے تو کل عقل بر ید ست۔ اک شعلۂ دل گر سرکش ہو
تو روشن حلقہ جیب کا میری مثل تنور آتش ہو
ہو تیرا سیہ رو صبح ہجراں۔ رخصت مجھ سے وہ مہ وش ہو
کیوں! کھینچوں آہ کہ خور بھی پنہاں زیر دود آتش ہو
لبریز شراب ناز دکھا تو۔ ساغر چشم کافر کو
تا زاہد پاک ملوث ہو۔ یا صوفی دم کش مے کش ہو
تم وہ وہ زخم دل پر میرے کرتے ہو دکھلانے کو
پر ترکش تیغ ناز سے اپنے دل میں کرتے غش غش ہو
دل نخل میں قد کے جوں ذکر یا چھپ کر چشم کافر سے
اب ارۂ جنبش ابرو سے کیونکر نہ بزیر کشاکش ہو
لبیک واذاں۔ ناقوس و جرس۔ یا قلقل مے یا نالۂ نے
دل کھینچنے کو اے ہمنفسو! کوئی تو نوائے دلکش ہو
بن تیرے گھر کی آرائش۔ جب دشمن جاں ہو عاشق کی
محراب طاق کماں بن جائے۔ دستۂ نرگس ترکش ہو
مانند نمک واں چرخ پہ انجم حق نے بنائے اپنے لئے
تا ہر لب زخم حسرت میرا ہجر کی رات نمک چش ہو

سرد مہری سے تری گر خونِ دل یخ بستہ ہو
پھر نہ ٹپکے۔ کوزۂ دل گرچہ سب اشکستہ ہو

کیونکہ قابو میں فلک کے عاشقِ وارستہ ہو
یہ تو جب ہو گر کماں کے بس میں تیرِ جستہ ہو

ہر قدم پر ہے خراشِ پائے مجنوں گل فشاں
تا کہ اِک اِک خارِ صحرائے جنوں گلدستہ ہو

کیا ہوا داغِ محبت سے ہوا دل سر بمہر
یہ نہیں ممکن کہ میرا رازِ دل سربستہ ہو

کیا نکالے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس
جتنی یہ کاوش کرے اتنی ہی یہ پیوستہ ہو

منہ سے جو نکلے مزا جب ہو کہ ہووے دلنشیں
آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعِ برجستہ ہو

جانے کیا بیدرد اندازِ کلامِ دردمند
ذوقؔ میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو

ایک دن عرفی کے قصیدۂ نعتیہ کے اشعار پڑھ کر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا۔

اقبالِ کرم میگزد اربابِ ہمم را
ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے استادوں کے قصیدے اس زمین میں ہیں۔ اُس مرحوم نے بھی معرکہ میں لکھا تھا۔ اور عقیدت سے لکھا تھا۔ ہم اپنی زبان میں عرضِ حال کرینگے۔ چنانچہ اُسی دن شروع کیا۔ اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہ ہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واؤ کے ۱۲ شعر ہیں۔ باب قصائد میں لے جانا کیا ضرور ہے یہیں لکھ دیتا ہوں

پتھرا دیا جلوہ نے ترے چشمِ صنم کو
چکرا دیا غمزہ نے ترے طوفِ حرم کو

جب سے کہ لکھا ہے ترا وصفِ رخِ زیبا
چومے ہے قلم لوح کو اور لوح قلم کو

رونق ہے بہارِ گلِ رخسار سے تیری
گلزارِ حدوث و چمنستانِ قدم کو

جائے نہ کجی طبعِ جفا پیشہ سے ہرگز
کس طرح نکالے کوئی شمشیر کے خم کو

کیا ڈھونڈتا ہے توسّلِ بغض و محبت
جلتا ہوا تعویذ سمجھ نقشِ درم کو

ہیں اشکِ کباب اشک ترے سوختہ جاں کے
پر کرتے ہیں خوں شبنمِ گلزارِ ارم کو

دیوانہ ترا قید سے ہستی کے جو چھوٹا
چڑھ جائے گا اک زلزلہ صحرائے عدم کو

جس دن سے زمیں پر ہے فلک خاک ہے اڑتی
دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو

منہ ہے کیا شمع کا ہو بزم میں تجھ سے دلکش
چٹکیوں میں ابھی گلگیر اڑا دے اُس کو

آئے تصویر ہی اسکی وہ نہ آئے تو نہ آئے
پر مرے پاس کوئی کھینچ ہی لاوے اُس کو

پیار کی بات یہ مجھ سے نہیں اِک اور سے ہے
تیری یہ خو ہے کہے مجھ کو سناوے اُس کو

وہ عیادت کو مری آئے تو کیونکر آئے
مر بھی جاؤں تو ذرا رحم نہ آوے اُس کو

مشت خاک اپنی ہم اُس کوچہ میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوق آپ اٹھائے نہ اٹھائے اُس کو

سگِ دنیا پس از مردن بھی دامنگیر دنیا ہو
گر اُس کتے کی ہڈی سے بھی کتا گھانس پیدا ہو

ہجوم آور جو آنکھوں میں ترا شوقِ تماشا ہو
تو شاخِ ہر مژہ سے چشم نرگس وار پیدا ہو

ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پہ سُن کے ہنستے ہنستے شادیٔ مرگ عیسیٰ ہو

نہ ہووے دسترس دامان وصل یار تک ہرگز
اگرچہ سر سے عاشق پاؤں تک دستِ تمنا ہو

مجھے کیا چاہیے عقدہ کشا سوزِ محبت میں
گرہ میری سپند آسا مری فریاد سے وا ہو

درازی میں شبِ غم کی اگر بہلائے دل مجنوں
خیال زلفِ لیلیٰ اس کے حق میں الف لیلہ ہو

کرے پرواز مرغ جاں اگرچہ شاخِ طوبیٰ تک
بپا اس تارِ نظر سے مثل مرغ رشتہ بر پا ہو

حلاوت یاں کہاں جب ہووے آبِ شعر کا دریا
زلالِ خضر کا اِک چشمہ سو بھی سب سے اخفا ہو

تصور یوں کبھی غفلت میں آجاتا ہے مرنے کا
کہ جیسے عالمِ رویا میں چشم کور بینا ہو

مجھے جلوہ میں مارا ہے نگاہ ناز و مژگاں کے
بتاؤں کس کو قاتل کس سے میرے خوں کا دعویٰ ہو

یہ شہرت نام کی بھی وہ بلا ہے پیچ ہستی کا
کہ صحرائے عدم میں گردنِ عنقا کا پھندا ہو

مرے صحرا میں وہ وحشت برستی ہے کہ مجنوں کے
گرے گر سر پہ قطرہ آبلہ زیر کفِ پا ہو

کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم اللہ رے وسعت
اگر نہ آسماں ہوں جمع اِک خالِ سویدا ہو

اکیلا رہ گیا یاروں سے یوں ہوں ناتوانی میں
کہیں شاخ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتا ہو

جو ذکر اللہ کو ہو ذوق مانع مایۂ عشرت
تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشہ میں صہبا ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو میخانہ کو چلتے ہیں
مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو

نشہ ٹوٹے ترے ساغر کشِ وحشت کا کیا ممکن
اگر سو ٹکڑے سنگِ کودکاں سے کاسۂ سر ہو

بچائے حق تعالیٰ اس یزیدی شمر مشرب سے
کہ خونِ سید کا جس پیرِ مغ کو خونِ کبوتر ہو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ میں وابستۂ زنجیرِ جوہر ہو

مجھے صحنِ چمن بھی عرصہ گاہِ حشر ہو تجھ بن
گلِ خورشید میرے واسطے خورشیدِ محشر ہو

جو کھوئے آپ کو وہ منزلِ مقصود کو پہنچے
تری گم گشتگی اس راہ میں اے **ذوق** رہبر ہو

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

سمجھ تو کور سوادوں کو ہو جو علم نہ ہو
اگر سمجھ بھی نہ ہو کورِ بے عصا سمجھو

نہ سمجھو دشت۔ شفاخانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک ہی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

پڑے کتاب کے قصوں میں کیا۔ کرو دل صاف
صفا ہو دل تو بہ از روضۃ الصفا سمجھو

زہے نصیب کہ ہنگامِ مشقِ تیرِ ستم
ہمارے ڈھیر کو تم تودہ خاک کا سمجھو

ہنسے وہ رونے پہ میرے تو پھر صفِ مژگاں
نہ سمجھو چشم پہ دیوارِ قہقہا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

تمہاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں
اس آرزو میں کہ تم اپنا نقشِ پا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغِ قاتل کو
لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا مرا خوں اس نے اپنے کوچے میں
اسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سن کے کیا سمجھو

نہیں ہے نام سے کیا کام مثلِ آئینہ
جو روبرو ہو اسے صورت آشنا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے **ذوق** کیمیا سمجھو

خوبی سے نہیں رونقِ بازار کہ یوسف
اس شکل و شمائل پہ بکا چند درم کو

کیا دے گا دم آ کر کسی بے دم کو مسیحا
اللہ سلامت رکھے اس تیغ کے دم کو

دے جام مجھے چشم عنایت سے جو ساقی
دکھلاؤں تماشا ابھی کیخسرو جم کو

بد ہو کوئی یا نیک رقم کام ہے اس کا
احوالِ بد و نیک سے کیا کام قلم کو

منزلِ گم گشتگاں بالکل الگ دنیا سے ہو
آسماں بھی ہو اگر واں بیضۂ عنقا سے ہو

سایہ افگن جسپہ تو اپنے قدِ رعنا سے ہو
گردباد اس خاک پر ہمسر قدِ طوبیٰ سے ہو

گر کرے معجز نمائی جلوہ رخسار پر
وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو

ہیں وہ مجنونِ بیاباں مرگ ہوں جسکے لئے
جو ہو چادر یا کفن وہ دامنِ صحرا سے ہو

سبحۂ صد دانہ بھی پڑ جائے گر میرے گلے
دانۂ انگور تار پنبۂ مینا سے ہو

دشت کو سیراب کر دے آبلہ پائی مری
ہر قدم پر چشمہ جاری چشم نقشِ پا سے ہو

ثابت اک ٹانکا نہ چھوڑے دل کا میرا اضطراب
چاک سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گر مری دیوے چکھا شوراب اشک
ذوق شور العطش پیدا لبِ دریا سے ہو

صفا میں رخ سے ترے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو
نگاہِ چشم سرمہ آلودہ سے بھی جو مکدر ہو

مری تاثیر وحشت وہ ہے مضطر جس سے پتھر ہو
نگیں پر نام لکھدوں تو نکل کے گھر سے باہر ہو

ترا دیوانۂ دل سوختہ آتش قدم گر ہو
جلا دے زیرِ پا گر خار مژگانِ سمندر ہو

قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستمگر ہو
ابھی قصہ نہ ہو آخر کہ آخر روز محشر ہو

جو تر دریا میں دھووے ناخنِ پا گلبدن اپنے
تو ہر اک فلس ماہی شکل برگِ گل معطر ہو

ڈبو دیں آشنا کو گر سبک دوش اپنی صحبت میں
تو آہن ساتھ کیوں لکڑی کے دریا میں شناور ہو

کھٹکتے ہی رہیں دل میں ترے مژگانِ برگشتہ
ہجوم نیش کژدم سے اگر دل گنج نشتر ہو

کیا یہ سوختہ جاں تو نے مجھ کو سرد مہری سے
کہ آہ سرد میری شمع کافوری سے ہمسر ہو

نبضن سے رشک کے نبی بدیاں تلی جاتیں
کہ ہائے تم نئے قلیاں کو منہ لگاتے ہو

ق
ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ
تم آکے حضرت عیسیٰ عبث سناتے ہو
اٹھنگے یار کی ٹھوکر سے یے چلو تشریف
نہیں تو پھر کوئی صلوات سنکے جاتے ہو

جلاتے ہیں سویدا سے دل کو ہم اپنے
نظر گذر کو تم اسپند کیا جلاتے ہو

ہو کرتے سبزہ خط کی جو سیر آئینہ میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر
دکھاکے تم لبِ دنداں جو کھلکھلاتے ہو

ق
ہمیشہ صدقہ اُس ابرو کے ہو کے حضرتِ دل
یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو
دیا طواف حرم میں ہے سامنے محراب
اور اس میں نعرۂ لبیک تم سناتے ہو

وہ آئے بام پہ ہیں ہمسر مو نہ بیٹھو اب
اٹھاؤ میرا جنازہ اگر اٹھاتے ہو

یہ صید بستہ فتراک کھل پڑے نہ کہیں
سمندِ ناز کو تیز اتنا کیوں اڑاتے ہو

ق
مرے لئے تو ہر اک طرح سے قباحت ہے
یہ تم جو دشمنوں کو دردسر بتاتے ہو
لگاؤں گھس کے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے
لگاوٹ اتنی بھلا کس لئے دکھاتے ہو
جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو
کہ دیکے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا کونسا انداز گفتگو ہے **ذوق**
کہ جس پہ زورِ طبیعت تم آزماتے ہو

[illegible] غزل

جو کھوئے قدِ یار کی تصویر دکھا دو
تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھادو

دیکھو! سرِ مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھادو

حالت طپشِ دل کی مرے پوچھیں اگر وہ
تم اُن کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھادو

گر دیکھ لے زاہد تو پھر ایمان ہی لائے
تم مصحفِ رخ اسکو یہ تدبیر دکھادو

گر چاہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں
مجھکوں کو تہِ زلفِ گرہ گیر دکھادو

اُس چشم کو ہے ناز بڑا تیر نگہ پر
اے حضرتِ دل! آہ کی تاثیر دکھادو

وہ برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم
اِس نالۂ جانسوز کا اک تیر دکھادو

یہ چار غزلیں مرقوم الذیل ابتدائی مشق کی ہیں۔ اور انہیں غزلوں میں سے بعض جنہیں استاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض مریث زادوں کی فرمائش سے اُن کے شغلِ موسیقی کے لئے لکھدی تھیں۔ باوجود اس کے اہلِ نظر ان کے مضامین کو۔ اور قوافی کے پہلو کو دیکھینگے کہ کس رتبہ پر ہیں:

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادہر دیکھو لیگر دیکھتے ہو

ہے دمِ بازپسیں دیکھو لو گر دیکھتے ہو
آئینہ منہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو

ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

ہیں پروانہ پڑے ہیں شجرِ شمع کے گرد
برگ ریزیِ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

بید مجنوں کو ہو جب دیکھتے اے اہلِ نظر
کسی مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو

شوقِ دیدار مری نعش پہ آکر بولا
کس کی ہو دیکھتے راہ اور کدھر دیکھتے ہو

لذتِ ناوکِ غم ذوق سے ہو پوچھتے کیا
لب پڑے چاٹتے ہیں زخمِ جگر دیکھتے ہو

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

چھپا کے پان یہ کس کے لئے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اٹھاتے ہو

تم اپنے رخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو
کہ میرا اخترِ بختِ سیہ دکھاتے ہو

اگر دباؤ کسی کا تمہارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو

ملاپ جانیں تبھی ہم کہ دے کے تم بوسہ
کہو کہ آؤ زباں سے زباں ملاتے ہو

مریضِ عشق کو تم پوچھ کر طبیبوں سے
مدام شربتِ عناب کیا پلاتے ہو

ہوں خاک چاٹ کے کہتا ابھی شفا ہو جائے
جو شربتِ لبِ میگوں ذرا چٹاتے ہو

جگر کے آبلے جو پھوڑتے ہو حضرتِ عشق
ہماری چٹکیوں میں ہم کو تم اڑاتے ہو

گلو! یہ کہہ گئی کیا کان میں تمہارے صبا
کہ بولے جاتے ہو بھولے نہیں سماتے ہو

پڑھو آج اس پہ بھی فاتحہ چلو داخلِ حسنات ہو

ترا حسن وہ بتِ مہ جبیں کہ ہے سب قربِ پہ زباں یہ

جو دکھائے رُخ تو ہو دن وہیں جو چھپائے منہ اُٹھی رات ہو

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں

تو فنا ہو ذوق اُسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو | کہ نہیں جائے سر اُٹھانے کو

قصدِ کعبہ کا تھا پھرے اُلٹے | چوم کر اس کے آستانے کو

تو ملے رنہ ہو تو عشق میں ہم | ایک آندھی ہیں خاک اُڑانے کو

یہاں تک لاغری ہے اس ترے بیمار کے تن کو | عجب کیا ہے جو سمجھے طوقِ گردن چشمِ سوزن کو

زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفسِ امارہ | یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مارِ رہزن کو

کمندِ نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی | لپٹ کر شکلِ طوقِ فاختہ عنقا کی گردن کو

تصور کس طرح بھولے ترا اس چشمِ گریاں کو | نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو

نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیرِ جاناں کو | نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

رکھا پنہاں بہانہ سے تمہے اُس ماہِ تاباں کو | بڑے ہی وقت کام آیا مرے رحمت ہے باراں کو

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو | عید ہوئی ذوق ولے شام کو

تم سی مل کر نہ غرفہ سے لگا لا منہ کر دو | اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کر دو

اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو | کتنے پانی میں ہیں یہ تو ارے جھنا دیکھیں تو

گر وہ نہیں آ سکتے یہاں تک تو بلا سے
دیتے ہیں خبر غیب کی گر شیخ جی صاحب
اک جان ہے اک دل ہے سو ہیں پیشِ نظر

لا کر کوئی اُن کی مجھے تصویر دکھا دو
کہہ دو کہ ہمیں تم خطِ تقدیر دکھا دو
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
ذوق آج انہیں تم یار کی تحریر دکھا دو

مجھے ابتدا سے سن رسیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہیں تمہارے استاد کی ایک غزل یاد ہے۔ اُن کے لڑکپن کی ہے۔ وہ بیچارہ بے علم تھا۔ اور طولِ عمر نے بدحواس کر دیا تھا۔ غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ اُستاد کو لا کر سنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے۔ کہاں سے ہاتھ آ گئی۔ سرسری طور پر درست کر کے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کبھی فرصت میں بتائیں گے۔ (بندہ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کہ کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھے ہیں۔ اور مضمون بھی صاف بچپن کے معلوم ہوتے ہیں ؎

دمِ ذبح تیغِ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو
تو شہیدِ ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعدِ ممات ہو
جو مذاق شعر کو اے پری میں جو لکھاؤں تیری شکر لبی
قلم انگلیوں میں جو ہے مری ابھی رشکِ شاخِ نبات ہو
جو ہیں کرتے میرے لئے دُعا کہ ہو دامِ عشق سے دل رہا
تو ہے دل یہ کہتا کہ اے خدا انہیں اس جنوں سے نجات ہو
مجھے کہتے سب ہیں کہ صبر کر جو نہیں تو صبر سے در گذر
سرِ حسن و عشق پری میں پر۔ نہ وہ بات ہو نہ یہ بات ہو
سرِ راہ کشتۂ ناز کا وہ مزار ہے نظر آ رہا

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سن کر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا۔ مگر لڑکپن ہی تھا۔ بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وہ اور ہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا:۔

جتنا ہے نمک سب مرے زخموں میں کھپاؤ ——— پلکوں سے اٹھاؤگے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اللہ مغفرت کرے کیا با انصاف طبیعت۔ اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھو۔ ویسا ہی حسن قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دیدیا ہے۔

انہی میں بقا کا بھی مطلع پڑھا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ دیکھو اس کا بھی جواب نہیں ہوا:۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں ——— اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ایک دن نئے اور پرانے الفاظ کے استعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم ٹک اکثر بزرگوں سے سنتے تھے۔ خود بھی کہہ دیتے تھے۔

ٹک دیکھو اُس لذت پیکاں کے اثر کو ——— جنبش مرے ابتک ہے لب زخم جگر کو

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے نقطوں کو بچایا ہے کہ ایک کو جنبش نہیں ہوسکتی۔

مطلع مرقوم الذیل لڑکپن کا کہا ہوا ہے۔

دریا میں ترے حسن کے بالے ہیں بھنور دو ——— اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں مگر دو

ہائے ہوز

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ ——— تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

دیں کیونکہ نہ وہ داغ الم اور زیادہ ——— قیمت میں بڑھے دل کی درم اور زیادہ

ساتھ اپنے ہے اب فوج الم اور زیادہ ——— کر تو بھی بلند آہ علم اور زیادہ

تیز اس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ ——— مشتاق شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

ﮐ ایک مسئلہ لوگوں میں عام زبان زد ہے کہ نمک کو پھینکنا۔ یا بے پروائی سے گرانا منع ہے۔ استاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ۔ گراؤگے تو آنکھوں سے اٹھانا پڑے گا۔

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بتِ بیباک ہو | یا مجھی کو موت آ جائے کہ قصہ پاک ہو

غیر نے ایسا پڑھایا کچھ مرے محبوب کو | لاکھ ہجّوں سے پڑھا اُس نے مرے مکتوب کو

پوشاک آبی آپ کو گر دل پسند ہو | دریا پری حباب کے شیشہ میں بند ہو

خبر کر جنگ نوفل کی۔ تو مجنوں اہلِ ہاموں کو | کیا دہ تا صبا کہیو اسے شاخ بید مجنوں کو

جاتے ہیں اب تو کوئے بتِ لالہ فام کو | اپنا تو بس سلام ہے دار السلام کو

فرماتے تھے کہ یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

حق نے تجکو اِک زباں دی اور دئیے ہیں کان دو | اِس کے یہ معنی کہے اِک اور سُنے انسان دو

سے کہے ایک جب سُن لے انسان دو | کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو | یہ ہنستے ہنستے نکلے گل کے آنسو

ایک دن کئی استادوں کے مطلع سنائے اور فرمایا ان کے جواب نہیں۔ لاثانی ہے انہی میں جراءت کا مطلع پڑھا۔

رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا | ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

(۱) پوشاک آبی آپ کو اگر دل پسند ہو

لہ ہندوستان کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دو یار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لے کر چند قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ اُس پر پھینکتا ہے وہ اِس پر۔ ۱۰۔ ۱۵ دفعہ برابر ردوبدل رہتی تھی جس کے ہاتھ سے پھول گر پڑتا وہ ہار جاتا۔ ہارنے کی سزا یہ بھی کر لیتے تھے اٹھاؤ آنکھوں سے جراءت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے۔ کاش میرا دل یار کی گلبازی کے کام آتا۔ اگرچہ بہت سی چوٹیں کھانی پڑتیں اور گرتا لیکن اسکے ہاتھوں اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا۔

گر سرمہ کرے خاکِ خرابات کو صوفی
سوجھیں اُسے پھر لوحِ و قلم اور زیادہ

اے ابروئے خمدار نہ برش میں کمی کر
ہاں تجھ کو مرے سر کی قسم اور زیادہ

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رُکے ہے
اتنا ہی اُسے چاہتے ہیں ہم اور زیادہ

جاتا ہے شہیدانِ محبت کا جنازہ
دو کم بھی اٹھا چند قدم اور زیادہ

یارب یہ مری نبض ہے یا موجِ رمِ برق
کیا ہوگا جو ہوگی تپِ غم اور زیادہ

کہتا ہے مرا شوقِ جراحت کہ صد افسوس
اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ

کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور
مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ

کہتا ہے گلے لگ کے مرے وہ دمِ خنجر
تو عشق کا بھر لو کوئی دم اور زیادہ

(ق)
اس عاشقِ بیچارہ کا ہے آج یہ کیا حال
گریہ سے ہے آنکھوں پہ ورم اور زیادہ

ہے بسترِ پہ پڑا پاؤں کہاں تک
بس پاؤں نہ پھیلا شبِ غم اور زیادہ

(ق)
ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر اُنہیں کم اور زیادہ

اے ذوق وقتِ نالہ کے رکھ لے جگر پہ ہاتھ
ورنہ جگر کو روئے گا تو دھر کے سر پہ ہاتھ

میں ناتواں ہوں خاک کا پروانہ کی غبار
اُٹھتا ہوں رکھ کے دوشِ نسیمِ سحر پہ ہاتھ

خط دیکھے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے
رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ

کھاتا ہے اس مزہ سے غمِ عشق میرا دل
جیسے گرسنہ مارے ہے حلوائے تر پہ ہاتھ

جوں بیخ شاخہ تو نہ جلا انگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

اے شمع دیکھ بزمِ فنا میں سنبھل کے بیٹھ
مارے گی دم میں صبح ترے تاجِ زر پہ ہاتھ

چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے شکیب
تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

قاتل ہے کیا ستم کہ اٹھاتا نہیں کوئی
آ کر مزارِ کشتۂ تیغِ نظر پہ ہاتھ

سر کٹ کے سرافراز ہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

گر شرح جنوں کیجئے رقم اور زیادہ
ہو چاک ابھی جیبِ قلم اور زیادہ

دیتا ہے وہ دم بازجہ دم اور زیادہ
شیشہ کی طرح پھولے ہیں ہم اور زیادہ

گھبراتا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش
گھبرانے لگا سینہ میں دم اور زیادہ

کچھ کی رقمِ شوق نے تاثیر جو پیدا
اٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

لذت سے محبت کی ہے ہر زخم جگر کو
ذوقِ نمکِ درد و الم اور زیادہ

کرنے کو سیہ نہ ورقِ چرخ کو اے دل
نالہ سے نہیں کوئی قلم اور زیادہ

کیا ہووے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی
میں لوں گا ترے سر کی قسم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بارِ محبت
ہو پشتِ فلک میں ابھی خم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہو بس کو بس از مرگ بھی یادِ دہنِ تنگ
تنگ اس کو کرے کنجِ عدم اور زیادہ

اس زلف کے مارے کی اگر خاک کو چھانے
پیدا دمِ افعی میں ہو سم اور زیادہ

اس شوخ ستمگر کو مری مرگ ہے منظور
ہے زہر نہ کھانا مجھے سم اور زیادہ

ہستیٔ تنک مایہ جو پھونکے گی اسی طرح
ابھرے گا حبابِ لبِ یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا ان پہ بھرم اور زیادہ

کرتی ہے مری خاک جلا کر مجھے پامال
کیونکر نہ اٹھاوے وہ قدم اور زیادہ

دکھلائے جو وہ صید فگن چشم کی شوخی
ہو آہوئے رم دیدہ کو رم اور زیادہ

آخر مۓ عشق آنکھوں سے ٹپکائی کسی نے
بھڑکے ہے جو یوں آتشِ غم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب ان سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

مہمیز سرِ خار سے نکلا سرِ صحرا
کچھ توسنِ وحشت کا قدم اور زیادہ

صید دلِ عاشق میں ہے مصروف وہ کافر
بے خوف ہے اب صیدِ حرم اور زیادہ

جلد آکے مرنہ جائے کوئی خانماں خراب | ٹکرا کے اپنا سر در بیت الحزن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دام علایق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو علاقہ بدن کے ساتھ

جنوں کے جیب و دری پر ہیں خوب چلتے ہاتھ | سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کرلے چلتے ہاتھ
ملا جو غیر نے عطر اس کو واں تو یاں میری | لکیریں مٹ گئیں ہاتھوں کی ملتے ملتے ہاتھ
نہ آیا گور پہ میری وہ بے وفا ورنہ | گلے لگانے کو تربت سے بھی نکلتے ہاتھ
جو چھیڑے برق کو یہ نغمہ جاں تو کہتی ہے | کہ دیکھو مجھ کو لگانا نہ جلتے جلتے ہاتھ
اٹھائے وجد میں جب ہاتھ ہم نے عام سے | تو پہنچے عرش تلک کودتے اچھلتے ہاتھ
مریض سوز محبت کی دیکھتا گر نبض | تو پھر طبیب کے بھی آبلوں سے پھلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پاؤں سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ | یا الٰہی کہیں پڑ جاوے نہ دربان کے ہاتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ | ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

اے نگاہ مہر سے دل مت بچشم قہر دیکھ | گڑ دیئے سے جو مرے تو نہ اسکو زہر دیکھ

کر دعا میرے لئے شیخ مناجات میں یہ | کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ | اور اس کی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

زیادہ ہوگا توکل سے بھی کہیں روزہ | کہ اس میں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اس ناز سے کھڑے تھے وہ رکھے کمر پہ ہاتھ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ
اک زخم تازہ روز ہے زخمِ کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئی نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سرو چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں جو رہا تھا لپٹکیں ہرن کے ساتھ

دستِ جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کہ تو
ٹکڑے اڑا دے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

پایا درِ اثر نہ کہیں شب کو آہ نے
سر ماری پھری ہے سپہرِ کہن کے ساتھ

بزمِ صنم میں حضرتِ دل ذکرِ کعبہ کیا
تھی جس چمن کی بات گئی اس چمن کے ساتھ

ان ناتوانیوں میں بھی یہاں تک ہے شوقِ دل
گویا چمن میں اُڑ کے نسیمِ چمن کے ساتھ

دوزخ میں بھی پڑیں تو نہ سیدھے ہوں کج سرشت
آتش میں پیچ و خم ہیں بن کے رسن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاک فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوتی محبت وطن کے ساتھ

لب پر ترے پسینہ کی بوند اے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سہیلِ یمن کے ساتھ

وحشت تو دیکھو بعد فنا بھی مرا غبار
باتیں کرے ہے سقفِ سپہرِ کہن کے ساتھ

دل وہ بلا ہے اژدرِ دوزخ کو کھینچ لے
مارے اگر کمند دمِ شعلہ زن کے ساتھ

چشم و دہانِ حرص سیئے کون غیرِ مرگ
بخیہ کا تار ان کے ہے تارِ کفن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہتِ گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

ہوں زلفِ عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا
لحد و کفن سیاہی مشکِ ختن کے ساتھ

منظور تجھ کو کب ہے یہ اے میرے آفتاب
ہو کوئی تیرہ بخت ترا سایہ بن کے ساتھ

داغِ دلِ فسردہ پہ پھاہا نہ ہو نہ ہو
کام اس چراغِ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

اُٹھ چکا وہ ناتواں جب رہ گیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

توبہ توبہ کہتا استغفار ہے
وقت توبہ میری استغفار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق میرے وادیٔ پُرخار سے

چاہیے بحر محبت میں تمہیں
کشتی اُس کی تیغ لنگردار سے

اب وہ آئے جب نگہ کو ضعف سے
کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے

تیرے ہی پاؤں پہ اے قاتل گرا
سر مرا اُڑ کر تری تلوار سے

اُس دہن کا نکتۂ موزوں بھی اک
منتخب ہے مخزنِ اسرار سے

ابر ہے لیکن شفق آلود ہے
زلف اس کی سرخیٔ رخسار سے

خاک عاشق پر اُٹھے جائے غبار
فتنۂ محشر تری رفتار سے

۲ ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

زلف کی پیچی سے دل ڈرتا نہیں
بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے

دل کے آئینہ کو گر کر دے گداز
یار اپنی گرمیٔ رخسار سے

جوہر اُس سے یوں اٹھالیں جس طرح
حرف قرطاس غلط بردار سے

بے تمیزوں کی ہے الفت نقص تام
لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

ق

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہے خبر آتی نفس کے تار سے

دو برس ہوئے تھے کہ بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تھے۔ اُدھر سے فرمائش زور پر اور اِدھر سے طبیعت شور پر۔ کہ شرفائے دہلی میں سے ایک شخص نے مشاعرہ کیا۔ سخن فہم و سخن شناس تھے۔ اہل سخن سے ارتباط رکھتے تھے۔ بڑے اشتہار و اعلام سے شہرت دی۔ اُستاد کے پاس آئے۔ اور باصرار آنے کا اقرار لیا (میاں صاحب بخش کی سرا کے پاس ان کا مکان تھا۔ وہیں مشاعرہ ہوا تھا) استاد مع رفقا کے تشریف لے گئے۔ ہم بچہ تھے ایسے جلسوں میں جانے کے قابل نہ تھے۔

یائے تحتانی

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ۴ والے شعر کو دیکھو وارستگان جمع ہے۔ اور بے اضافت۔ بے صفت باندھ دیا ہے۔ جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ اور آخر میں ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
دل میں آئینہ کے جوہر غار سے

شرحِ فرطِ حسرتِ دیدار سے
جو نگہ ہے کم نہیں طومار سے

کھائے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

ہاتھ اٹھا دو عشق کے بیمار سے
کون بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل کو تیرِ یار سے
ہے مشابہ زخم بھی سوفار سے

میرے طرزِ نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجرِ یار سے
کم نہیں تارِ رگِ گل خار سے

آئینہ اُس شعلۂ رخسار سے
گرم ہے دکانِ آتش کار سے

بے نصیب اسکے ہیں گر دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

مارے گر سیلی وہ زلفِ پُرعرق
جھڑ پڑیں دنداں دہانِ مار سے

خنجرِ موجِ تبسم سے ترے
گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

وائے قسمت تلخ کامی ہو نصیب
ہم کو اس کے لعلِ شکر بار سے

کرتا ہے دستِ جنوں جب کشمکش
جی الجھتا ہے نفس کے تار سے

سن کے میری جانکنی کو کوہکن
جوں صدا اُلٹا پھرے کہسار سے

یہ بھی اس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے

نقطۂ خال اُس کا سودا خیز ہے
پھرتے ہیں اک پاؤں ہم پرکار سے

اور والد مرحوم سے بھی پڑھا ہوا تھا۔ انہیں جب وہاں میرا حال معلوم ہوا تو مل کر بہت خوش ہوئے۔ اکثر آتے تھے اور وقتوں کے حال کہانیوں کی طرح سناتے تھے میں کسی حال میں ہوں کام سے کام تھا۔ اس مشاعرہ کا بھی ذکر آیا۔ انہوں نے ماجرائے مذکور من وعن بیان کیا۔ اور کہا کہ بھئی تمہارے والد مرحوم کے سبب سے ہم بھی ہمراہیوں میں تھے۔ حضور کا طلب فرمانا۔ اور استاد کا جانا واقعی سبب تھا۔ اور اہل حسد نے اس وقت کہا بھی تھا۔ مگر نہیں! بدگمانی تھی۔ ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم تو اہل راز میں تھے۔ اس وقت مجھے پھر تحقیق ہوا۔ کہ لوگ ان کی سیدھی بات کو بھی الٹا سمجھتے تھے۔ اور سلٹا دکھاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ

غزل مذکور یہ ہے:-

ترے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا۔ اس کو یہ تیرِ قضا سمجھے

غلط فہمی ہماری تھی جو ان کو آشنا سمجھے
ہم ان کو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے
بہا خوں کو ترے قاتل میں اسی کو خوں بہا سمجھے

وہی کچھ تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہراب تیغ یار کو آب بقا سمجھے

ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

برائی میں ہماری گر وہ اپنا کچھ بھلا سمجھے
برا سمجھے برا سمجھے برا سمجھے برا سمجھے

تجھے اے سنگدل آرام جان مبتلا سمجھے
پڑے پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

وہ ہم سے خاکساروں کو گرا اپنا خاک پا سمجھے
ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے

جو کچھ دل پر گزرتی ہے سنائینگے ہم اس بت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کیا سمجھے

ترے کشتے جو یوں خوابِ عدم سے یک بیک چونکے
مگر شور قیامت کو تری آواز پا سمجھے

نسیم صبح گلشن میں اگر ہووے دم عیسےٰ
ترا بیمار غم مجھ بن سموم جاں گزا سمجھے

غالبؔ آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے۔ اُستاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کو کچھ سنائیے۔ استاد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے بادشاہ تھے۔ اور کم سخنی اُس سے بڑھی ہوئی۔ اُن سے ہم میں بھی بڑے تھے۔ اتنا کہا۔ خوب! بہت خوب!!

غرض مشاعرہ شروع ہوا اور شمع گردش میں آئی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ حکیم آغا جان عیشؔ طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ مگر خوش کلام اور شیریں سخن۔ شوخ طبع شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزل میں قطعہ پڑھا (روئے سخن غالبؔ مرحوم کی طرف تھا)

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے	مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے۔ اور کلامِ میرزا سمجھے	مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ابھی استاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص[1] پہنچا۔ کہا حضور نے دعا فرمائی ہے۔ یہ غزل دی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ اسے ہمارے پاس آکر بنا دو۔ کچھ ہم زبانی بھی کہینگے۔ استاد نے میر مشاعرہ کو پاس بلایا اور حال سنایا۔ اُنہوں نے کہا۔ آپ کی غزل ہوئی تو مشاعرہ ہو چکا۔ آپ پڑھ کر جائیے۔ غرض جو غزل پیش تھی ختم ہوئی۔ میر مشاعرہ نے استاد کی ایماسے خاص خاص اشخاص سے کہہ بھی دیا۔ اور شمع سامنے لاکر رکھ دی۔ کہ آپ غزل پڑھئے۔ اُستاد نے غزل پڑھی بڑی تعریفیں ہوئیں یہ اُدھر رخصت ہوکر حضور میں گئے۔ ادھر مشاعرہ برہم ہوگیا۔ ہر شخص یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ جو سنا تھا سُن لیا۔ اب چلو اور سو رہو۔ مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ میاں۔ یہ تو ایک فقرہ تھا۔ وزن شعر کے لئے! بلانا کہاں تھا۔ اور جانا کہاں تھا؟

اتفاق تقدیر دیکھو کہ مشاعرہ کو سالہاسال گذر گئے۔ دلّی تباہ ہوگئی۔ اب ۱۸۹۲ء میں مجھے کار سرکار کے لئے راولپنڈی میں جاکر کئی مہینے رہنا ہوا۔ وہاں میر وصیت علی ایک پیر کہن سال سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے دلی کے پرانے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی

[1] بادشاہی ملازم جو بطور خدمتگار کاروبار کرتے تھے۔ خواص کہلاتے تھے۔ دیکھو! جمع کا صیغہ ہے۔ مگر اراکین دربار کی زبانوں۔ اور دفتر کے کاغذوں میں بمعنے واحد مستعمل تھا۔

کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے نکہتِ گل کا
چمن بادِ صبا سمجھے کہ آوازِ درا سمجھے

نگاہِ لطف ان کی جب نہ باز آئی تغافل سے
ہم اُنکی نارسائی اپنا بختِ نارسا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

اگر دل کو لگا لا چیر کر پیکاں تو رہنے دو
کہ عاشق اپنے پہلو میں اسی کو دل کی جا سمجھے

کرے آہِ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا
تو سینہ کو فلک کے آبلہ سا زیرِ پا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے
تمہی سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

ہنسے ہے زخمِ دل تدبیر پر ٹانکے کے بخیہ
انہیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے

ہوا جب گرمیِ الفت سے موم اس دل شکن کا دل
تو اس کے دل شکستہ اپنے حق میں مومیا سمجھے

عدو آیا ہے بن کر نامہ بر لکھے نصیبوں کا
کرینگے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو دُرد کا کدر جانے نہ جو خُم کا صفا سمجھے

نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

خبر سنتے ہی قاصد سے ہوئے ہم بے خبر بالکل
ترے پیغام کو گویا کہ پیغامِ قضا سمجھے

نحوست بھی سعادت ہو گئی سودے میں زلفوں کے
گلیمِ تیرہ بختی سر پہ ہم ظلِ ہما سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا
خرد کے تیز ناخن ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

ملا اس زلف کے مصرع میں ہے مضمونِ پیچیدہ
اُسی سے یہ کھلے جو معنئ ناز و ادا سمجھے

ہوا نے زلف کو چھیڑا۔ اور اپنا دم الجھتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اُسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھاتا گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے
اور آگ میں یونہی دنیا ہے گر عذاب تو دے

۱؎ جب اس شعر پر پہنچے تو غالبؔ مرحوم سے کہا۔ مرزا صاحب! یہ آپ کے مذاق کا شعر ہے۔ وہ بھی خوش ہوئے اور تعریف کی۔

وادیٔ وحشت میں بھی جا کر نہ دل اپنا کھلا
پنجۂ مژگانِ آہوئے شیر کا چنگال ہے

دل میں شکلِ یار کب آئے نظر بے اضطراب
دیکھ لو سیماب بن آئینہ بے تمثال ہے

بسکہ ہے نوروز اپنا آفتابِ بادہ سے
دورِ ساغر ہم کو ساقی گردشِ یکسال ہے

پوچھتے کیا ہو شکستِ دل کو صورت دیکھ لو
نامہ ہے چیں بر جبیں۔ قاصد شکستہ حال ہے

بارِ عشق اس گل کا سر پر رکھ لیا جو ہو سو ہو
اب کسے پروا ہے سو من ہے کہ اک مثقال ہے

غم نہیں صیاد کو ورنہ مری فریاد سے
ہے قفس تو سینہ چاک اور دل مشبک جال ہے

کھل گیا مضمون شکستِ دل کا بے خط کے کھلے
نامہ بر کا اسقدر اپنے شکستہ حال ہے

ہے اسیرانِ محبت کی بلا سینہ میں آگ
شعلۂ جوالہ ساں طوقِ گلو تک لال ہے

ہوتے ہیں اعضائے بوسیدہ تصور سے جدا
کھینچی تصویرِ مجنوں کی ترے اشکال ہے

روزِ محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہئیں!
گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہے

فرماتے تھے کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسۂ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامہ کے لئے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر پنڈارے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسے میں گئے۔ تمہارے والد وہیں تھے۔ کوٹھے پر جا بیٹھے۔ دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسبِ حال یہ غزل کہی۔ کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسہ میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ انہیں بھی مشاعرہ کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے۔ دوستوں کی فرمائش سے ہم نے یہ غزل بھی پڑھی۔ بیچارے برسوں صحرا نوردی میں تھے۔ اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خطِ صلح میں آکر اسے چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھے۔ اکثر اشعار غزل کے ان کی صورتِ حال دکھاتے تھے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ اور ہر شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے بات نہ سنائی دیتی تھی۔

چُنزلف سو جیتا نہیں لے مرغِ دل تجھے
خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے

دولت کی رکھ نہ مارِ سرِ گنج سے اُمید
موذی وہ دے گا کیا کہ جو دولت پرست ہے

عنقا نشاں چھپا کے تو بیٹھا برائے نام
گم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے

یہ ذوق مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے۔ لیک محبت پرست ہے

زخمِ دل پر میرے کیوں مرہم کا استعمال ہے
شکل اگر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
لوحِ بالیں پر بھی لکھا سورۂ زلزال ہے

عشق کو گر امتحاں پر میرے قصدِ فال ہے
جوشِ داغِ دل ہجومِ نقطۂ رمال ہے

اب تو یہ جانِ ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
لب تلک بھی اسکو آجانا رہِ صد سال ہے

ہم نے جانا تھا کفِ پا میں تمہارے خال ہے
لیکن اب دیکھا سویدائے دل پامال ہے

ابر برسوں رو چکا پر سوزِ غم سے اب تلک
خاک میرے ڈھیر کی اُڑنے میں جیسے رال ہے

میرے دودِ آہ سے یاں تک زمانہ ہے سیاہ
آفتابِ آسماں زنگی کے منہ کا خال ہے

میں وہ مجنوں ہوں کہ میرا کاغذِ تصویر بھی
مثلِ عیدی باعثِ خوشنودیٔ اطفال ہے

جب سے ہے دل میں کسی کی نوکِ مژگاں کا خیال
نشترِ زنبور ہے تن پر مرے جو بال ہے

جوشِ گریہ کا مرے تم کچھ نہ پوچھو ماجرا
چادرِ آبِ رواں منہ پر مرے رومال ہے

دل پہ ہوں گر داغِ سوزانِ عشق میں آگو لگن
پھر تو خسرو کا بھی گنجِ سوختہ کیا مال ہے

کھاؤں میں بیڑا جو اُس بن کیونکہ دل ٹکڑے نہ ہو
جو رگِ پاں ہے وہ مجھ کو شیر کا سا بال ہے

ہیں جہاں مدفن تمہارے کشتگانِ زلف کے
نخل کی جا بیدِ مجنوں ہے وہاں یا جال ہے

شوخیٔ قاتل کرے آلودہ کیوں منہ پان سے
خونِ اعجازِ مسیحا سے لب اس کا لال ہے

فندقوں سے کس کی دل خوں تھا کہ میری خاک پر
نوکِ برگِ سبزہ جوں منقارِ طوطی لال ہے

اس کی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جس کے پاؤں تک
گردشِ رنگِ پری سے حلقۂ خلخال ہے

آئے وہ شاید عیادت کو کہ باصد ضعف حال
آئی مژگاں پر نظر بھی بہرِ استقبال ہے

غنچۂ تصویر بھی کھل کر جو عقدہ بے دانہ ہوں
ہائے قسمت وہ ہمارے عقدۂ مطلب ہے

سب سیہ کاری سے نامہ یاں تلک اپنا سیاہ
روز محشر پڑے گر سایہ اس کا شب ہے

سرمۂ چشم کواکب کیوں بنا اے دودِ آہ
یہ کاجل بن کر جس سے اسکا خال لب ہے

صحبتِ عیسیٰ بنائیں کیا گدھے کو آدمی
جن کے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب ہے

موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ تا لاویں بلا
عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب ہے

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جسکے ہاتھ سے
شیخ صنعاں سا مسلماں رند بد مشرب ہے

لیتے ہی دل جو عاشقِ دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

تم چشم سرمگیں کو جو اپنے دکھا چلے
بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے

دیوانہ آگے اور بھی دل کو بنا چلے
اک دم تو بیٹھیے وادہ کہ کیا آئے کیا چلے

ہم لطف سیر باغ جہاں۔ خاک اڑا چلے
شوق وصال دل میں لئے یار کا چلے

غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقشِ پا چلے
کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے

دکھلا کے مجھ کو نرگس بیمار کیا چلے
آوارہ مثل آہوئے صحرا بنا چلے

اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے

بل بے غرور حسن زمیں پہ نہ رکھے پاؤں
مانند آفتاب وہ بے نقشِ پا چلے

کیا بے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

افسوس ہے کہ سایہ مرغ ہوا کی طرح
ہم جس کے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے

قاتل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہ ہو تو کیوں
رک رک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے

ہے گل کا دل تو سنبل پیچاں کے دام میں
کیا اڑ کے تجھ سے طائر نگہت بھلا چلے

ہو کر سوار توسنِ عمر رواں پہ آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

لبریز ہو گیا مرا شاید کہ جامِ عمر
تم وقت نزع مجھ سے جو ہو کر جفا چلے

سلجھائیں زلفیں کیا لب دریا پہ آپ نے
ہر موج مثل مار سیہ تم بنا چلے

ہوئے سر بد ان سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
اٹھ نہ جا اک بار سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے

آبلہ ہائے سینہ جو تیر سے دکھائی دیتے ہیں
مزرعِ دل پر میرے پڑا کیا غم کا آ کر لشکر ہے

ہوئے دلِ مظلوم ہمارا کیوں نہ شہیدِ دشتِ بلا
در پے اس کے شاہوں کا وہ زلفِ معنبر لشکر ہے

دیویں موذی زحمت کس کو کیونکہ نہ ایذا جمعِ ضعیف
دشمن یار زنبور رسیدہ مور کا اکثر لشکر ہے

کعبہ تو یہ خدا ہی رکھے آنچ کہ جوشش ابرہہ ہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوش ہوا پر لشکر ہے

ہیں وہ شاہ کشورِ غم ہوں یار وہیں کے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں اور بہتا سمندر لشکر ہے

گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل۔ گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مردِ سپاہی پیشہ۔ پھرتا لشکر لشکر ہے

خالِ چشمِ جاناں کا مژگاں سے تجمل دیکھو تو !!
اترا پشت پہ ماہی کی کیا لے کے سکندر لشکر ہے

ہووے امامِ برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی
ہوتا گردا اسلامیوں کا جوں سبحہ گوہر لشکر ہے

میری خاکستر اڑی تھی اس سے سب گردوں
اس میں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے

دل کو رکھ دوں اس دمِ شمشیر پہ گر دم بنے
تا یہ قربانی صراطِ عشق پر مرکب بنے

خال لے خورشید و رخ پر تمہارے کب بنے
تیرہ روز آکر افق پر سوختہ کوکب بنے

کیونکہ تعلیم نیاز و ناز ہو یک جا بہم
گر نہ مجنوں آ کر لیلےٰ کا ہم مکتب بنے

الگ تا ہو نہ کھنچ کھنچ کر مرا ہر تار دامن سے
خبر لوں جیب کی یا میں رہوں ہشیار دامن سے
لگی ہے اس تمنا میں مرے ہر خار دامن سے
لگے اس شعلہ خو کے کون تجھ سا زار دامن سے
کرے گر دھوتے دھوتے تو جدا ہر تار دامن سے
کیا تو نے کنارہ ہم سے اور ہاتھوں سے وحشت کے
تمہارے جلوۂ رخ کے جو بسمل خاک پر لوٹیں
ہوا بے پردہ وہ پردہ نشیں۔ تو یوں کیا پردہ
وہی تازیانہ ہے اس کے واسطے جو قطع بے سپر
ب انگوشش بہت ہیں سخت دریا لوگ کہتے ہیں
مکدر ہو وہ گل کیا کیا جو نادانستہ لگ جائے
خدا اگر سر ہو تن سے اور جدا ہوں ہاتھ شانوں سے
ترا مجنون زار اتنا گراں جاں ہے نہ اٹھنے دے
پھروں کھینچے ہوئے کوسوں میں اپنے زور وحشت میں
جلینگے آتش رنگ حنائے پا سے گھر کتنے
دکھائے صدمۂ زنجیر نے یہ پاؤں مجنوں کے
عزیزا صلا نہیں سرمایہ ہمت کو کہ دریا نے
مرتی بھی خلشگر کو نہیں دیتے ہیں آرائش
سرایت کو ہکن کا خوں اگر کر جائے پتھر میں
فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جا نماز اپنی
مرے پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں کیا کیا شگفتہ دل
مرا آنسو ہے وہ زہراب۔ نیلا ہو بدن سارا

نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے
جنوں الجھے ہیں ناخن جیب اور خار دامن سے
کروں دستار میں گرہو عطا اک تار دامن سے
کہیں الجھا ہے ابتک برق کے بھی خار دامن سے
نہ چھوٹے خون میرا تیرے اے خونخوار دامن سے
گریباں ہم کنار آکر ہوا ہے یار دامن سے
تو پریاں آکے پونچھیں اے پری رخسار دامن سے
بنایا درمیاں اک پردۂ دیوار دامن سے
نکل سکتا ہے کوئی آستیں کا کار دامن سے
گرے تھے اشک کے قطرے مرے دو چار دامن سے
ذرا آکر نسیم دامن گلزار دامن سے
جدا ہو پر نہ ہاتھ اپنا ترے اے یار دامن سے
لپٹ جائے اگر صرصر کے مثل خار دامن سے
ذرا تم باندھ دیکھو دامن کہسار دامن سے
دکھائینگے ادا جب گرمیٔ رفتار دامن سے
کہ صدمہ دل پہ ہوتا ہے دم رفتار دامن سے
گرہ دیکر نہ باندھا گوہر شہوار دامن سے
گلستاں پونچھتا ہے کب سنان خار دامن سے
نکالے لعل ہی پتھر کی جا کہسار دامن سے
اگر دھو ڈالے تو داغ مئے پندار دامن سے
جو کوئی ٹوٹ جاتا ہے الجھ کر خار دامن سے
خدا ناکردہ لگ جائے گر اے غمخوار دامن سے

دنیا میں جب سے آئے رہا تشنگی خیال — ہم اس جہاں میں مثلِ صبا خاک اڑا چلے

قاتل سے دل کیا ہے نہ جانبر ہوا اپنا ہوش — گزرے کے مثلِ طائرِ رنگِ حنا چلے

فکرِ قناعت اُن کو میسر ہوئی کہاں — دنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے

آلودہ سرمہ سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ — دیکھا جہاں سے صاف ہی اہلِ صفا چلے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب — یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

لے جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر — پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

اس روئے آتشیں کے تصور میں یا ذراغ — ہے کیا غضب کہ آگ لگے اور ہوا چلے

اے ذوق ہے غضب نگہِ یار الحفیظ!
وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیرِ غضب چلے

استاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کلّیاں کرتے تھے۔ بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کیا اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُس دن تو مطلع ہی طلوع ہوا۔ پھر غزل ہو گئی:-

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے — خاک کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر — جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے

تیرے صیدِ نیم جاں کی جان نکلے کس طرح — یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے

بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کرو — واں کی آتش ہو جو ان کے روئے آتشناک سے

آفتابِ حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم — اشک خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب — کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا — مے پرستوں کے کفن پر کلکِ چوبِ تاک سے

عیبِ ذاتی کو چھپائے گا نہ حسنِ عارضی — زیب بد اندام کو ذوق کیا پوشاک سے

سر بوقتِ ذبح اپنا۔ اُسکے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب۔ اللہ اکبر۔ لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے

واہ وا شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کرم سوزِ دروں بھن جائینگے دل اور جگر
رحم جوشِ گریہ۔ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی۔ کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

زخمی ہوں ترے ناوکِ دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخمِ جگر سے

ہم خوب ہیں واقف ترے اندازِ کمر سے
یہ تار نکلتا ہے کوئی دل کے گہر سے

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

لبریزے صاف سے ہو جام بلوریں
زمزم سے ہے مطلب نہ صفا سے نہ حجر سے

سرمایۂ اُمید ہے کیا پاس ہمارے
ایک آہ ہے سینہ میں سو نومید اثر سے

وہ خُلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہیں شاخِ ثمردار میں گُل پہلے ثمر سے

حاضر ہیں مرے توسنِ وحشت کے جلو میں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

فریادِ ستم کش ہے وہ شمشیرِ کشیدہ
جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں جو ہیں بہ کے چلے ہم بہ سوئے دوست
مقصودِ رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اللہ رے وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں
پتھر ہیں پہاڑوں کے اُڑے جاتے شرر سے

کچھ رحمتِ باری سے نہیں دُور کہ ساقی
رو دیں جو ذرا مست تو مے ابر سے برسے

کشتہ ہوں میں کس چشمِ سیہ مست کا یارب
مستی ہے ٹپکتی مری تربت کے شجر سے

کھلتا نہیں دل۔ بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

نالوں کے اثر سے مرے پھوڑا سا ہے پکتا
کیوں ریم سدا نکلے نہ آہن کے جگر سے

ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریاں تنی زیبا
کہ جس کو آستیں سے ننگ ہے اور عار دامن سے

یہ تجھ بن اشکباری ہے کہ آنسو پونچھتا ہوں میں
کبھی تو آستیں سے اور کبھی اے یار دامن سے

کہاں وہ شوخیِ طفلی کہ جب دامن سوار ان کیا
تجھے ہم تیار کرتے توسنِ رہوار دامن سے

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہو
اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے

میں وہ آلودہ دامن ہوں بنائیں تار سبحہ کا
فرشتے پاک دامن لے کے میرے تار دامن سے

یہ صید ناتواں مثلِ پرِ افتادہ اڑ جائے
لگا دے گر نسیمِ دامنِ کہسار دامن سے

ہوا پنکھے کی خوب آور ہے پر وہ ایک جنبش میں
کرے سو فتنۂ خوابیدہ کو بیدار دامن سے

نگاہِ بوالہوس آندھی ہے تیرے خاک اڑانے کو
چھپا لے اے پری رو شعلۂ رخسار دامن سے

نہ ہوگی دل جلوں کی ذوق ہمسایوں سے رسوائی
کہ کب فانوس یوں ڈھکتے شمع کا رخسار دامن سے

ہوں یہ لاغر جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے
ہے کبادہ جو لچک جائے مگس کے بوجھ سے

تھا قدِ رعنا کبھی پر اب ہوس کے بوجھ سے
جھلملاتا سا ہے شعلہ اک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اس بام پر ٹوٹی کمند
ورنہ میں کیا۔ وہ نہ ٹوٹے مجھ سے دس کے بوجھ سے

شاخِ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جانی پہ آئیں
توڑ دے لوہے کے حلقے کو قفس کے بوجھ سے

مت لگا اے عشق دل کے آبلہ پر نقشِ غم
ٹوٹ جائیگا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

سر جھکاتے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانند سرو
ہے سبکباری جنہیں بارِ ہوس کے بوجھ سے

یہ اسیری میں گراں خاطر ہوں میں جاتا ہے ٹوٹ
آہنی قلاب بھی میرے قفس کے بوجھ سے

زندہ تو ڈوبے ہے اور تیرے ہے مردہ آب میں
بوجھ شاید جسم کا کم ہے نفس کے بوجھ سے

باندھ دے ناقہ کی گردن میں دلِ نالانِ قیس
لیلی اس کا بوجھ ہلکا ہے جرس کے بوجھ سے

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بارِ حرص
یہ گدھا تو رہ گیا دلدل میں خس کے بوجھ سے

اپنے دامن میں لے میری گل لختِ جگر
جی دھڑکتا ہے کہیں چولی مسکے بوجھ سے

کیا ہوا دل نے لیا گر ایک کوہِ غم اٹھا
یہ نہیں اے ذوق دبتا ایسے دس کے بوجھ سے

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

کہہ دو اشکوں سے کیوں ہو کرتے کمی
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

کمیٔ گریہ نے جلا دیا دل
ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اس سرے سب نہایتوں سے مجھے

الہٰی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شورِ بایِّ ذنبٍ قتلتنی ہے

غمِ جدائی میں تیری ظالم۔ کہوں میں کیا۔ مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے۔ سینہ کاوی ہے۔ دلخراشی ہے۔ جانکنی ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا۔ یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اِس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے۔ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

لگا نہ اس بتکدہ میں تو دل۔ یہ ہے طلسمِ شکستِ غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمایل صنم ہے آخر شکستنی ہے

احاشیہ صفحہ (۱۸۶) لہ مثنوی مہر و وفا۔ فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے۔ پہلے زلیخا۔ بوستان سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی۔ اب اسکا رواج نہیں رہا۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کون سمجھتا ہے اب ان اشاروں کو خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے ؎
ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم ۔۔۔ از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

اے ذوق رہِ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہمدم جو نکل آئے کوئی گرد سفر سے

آیا نہ وہ مہ طلعت۔ کیا دیر لگائی ہے
کھینچ لے کششِ الفت۔ کیا دیر لگائی ہے

قاصد تو کب آتا ہے۔ پر پیک اجل نے بھی
یاں آنے میں یا قسمت کیا دیر لگائی ہے

آنکھوں میں ہے دم تیرے۔ بیمار محبت کا
دکھلادے کہیں صورت کیا دیر لگائی ہے

آنا بھی کہیں تیرا۔ آنا ہے قیامت کا
اے دلبر خوش قامت کیا دیر لگائی ہے

پروانہ سے کہتی ہے یہ شمع کہیں جل چک
بے تجھ میں اگر جرأت کیا دیر لگائی ہے

کس فکر میں ہے ساقی۔ دے بادہ جو ہے باقی
تھوڑی ہے یہاں فرصت کیا دیر لگائی ہے

بے تیغ بکف قاتل۔ تم مرنے پہ جانبازو!
باندھو کمرِ ہمت کیا دیر لگائی ہے

گر قتل ہی کرنا ہے قاتل کہیں کر جلدی
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ کیا دیر لگائی ہے

یاں وعدہ بھی آپہنچا۔ تو اب تلک آتا ہے
اللہ رے تری غفلت کیا دیر لگائی ہے

بے بادہ گلستاں میں پیتے ہیں لہو مے کش
ساقی نے دمِ عشرت کیا دیر لگائی ہے

دے پھونک کہیں دل کو مدت سے سلگتا ہے
اے سوزِ غم فرقت کیا دیر لگائی ہے

باتیں یہ کہا میری۔ ہنگامۂ محشر نے
لو اٹھو کہیں حضرت کیا دیر لگائی ہے

اُس کے لب خنجر کا لینا ہے اگر بوسہ
تو اے دلِ پُر حسرت کیا دیر لگائی ہے

اے ذوق شہید اسکو کہتے ہیں کئی عاشق
کرتے ہو اگر سبقت کیا دیر لگائی ہے

خوبرو کا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کیا کہوں کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
غیر تیری حمایتوں سے مجھے

بات دشمن کی ہے کہ لکھتے ہیں
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

حال مہر[1] و وفا کہوں تو کہیں
نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۸۷ پر

اس بتکدہ میں کون ہے کافر ترے سوا — تو بت پرست بت کی ہے اور بت تراش ہے

ہوتی وبالِ دوش نہیں عاشقوں کی خاک — اُڑ جاتی ٹھوکروں میں تری اُن کی لاش ہے

ابروئے صد نشاط ہے مثلِ ہلالِ عید — سینہ میں وہ جو ناخنِ غم کی خراش ہے

کرتے یہ اشک و آہ ہیں تکلیف کیوں عبث — ہو جاتا رازِ دل تو نگاہوں میں فاش ہے

دنبالہ پر جو سرمہ کے دانہ ہے خال کا — دیکھو! وہ دستِ چشمِ فسوں گر پہ ماش ہے

کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق — شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

دنیا سے بھی اُٹھے تو نہ بستر سے اُٹھ سکے — تیرا مریضِ عشق جو صاحبِ فراش ہے

ہے کس مزہ سے عشق میں اپنی ہوئی بسر — افسوس نیست ہے۔ نہ کبھی دل میں کاش ہے

برش میں اب تو خنجرِ خم دار سے بھی تیز — اس شوخ کج ادا نے نکالی تراش ہے

ممکن نہ دیر آج سے دل میں نہیں ہے غم — روزِ ازل سے اس کی یہیں بود و باش ہے

اے ذوق جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد
دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

ہے تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی — رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی — اک پھانس ہے کلیجے کے اندر لگی ہوئی

جائے بغیر خون کوئی رہتی ہے تیری تیغ — بے حد ہے اسکو چاٹ ستمگر لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح ہم — پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی

میت کو غسل دیجو نہ اس خاکسار کی — ہے تن کو خاکِ کوچۂ دلبر لگی ہوئی

میسے ابھی پاس ہے نہیں ممکن گرشما — خورشید کو وہ تپ ہے فلک پر لگی ہوئی

میرا گلِ امید شگفتہ ہو کس طرح — دل کی گرہ ہے اس کی گرہ پر لگی ہوئی

گلِ مہندی کیوں نہ باغ میں ہو پائمالِ رشک — پاؤں میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک — پروانے سے ہے شمعِ مقرر لگی ہوئی

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر — آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیاگر۔ ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

کوئی ہے کافر، کوئی مسلماں۔ جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے۔ وہ اُس کے نزدیک رہزنی ہے

تکلفِ منزلِ محبت نہ کر۔ چلا چل تو بے تکلف
کہ جا بجا خار زارِ وحشت سے تجھ رہا فرشِ سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوق اس کے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوارِ آہنی ہے

آنکھ اس پُر جفا سے لڑتی ہے
جان کشتی قضا سے لڑتی ہے

شعلہ بھڑکے گا کیا بھلا سرِ بزم
شمع تجھ بن ہوا سے لڑتی ہے

قسمت اُس بُت سے جا لڑی اپنی
دیکھو! احمق خدا سے لڑتی ہے

صفِ مژگاں تری خدا کی پناہ
اک بلا۔ اک بلا سے لڑتی ہے

شورِ قلقل یہ کیوں ہے دخترِ رز
کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے

نگہِ ناز اس کی عاشق سے
جھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے

ترے بیمار کے سرِ بالیں
موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے

آج کہتے ہو کیا طبیعت کو
عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے

زالِ دنیا نے صلح کی کس دن
یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے

تیری شمشیر خوں کی چھینٹوں سے
چھینٹے آبِ بقا سے لڑتی ہے

دیکھو اس چشمِ مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ذوق دنیا ہے مکر کا میداں
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم۔ اسے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں یہ بڑا بدمعاش ہے

کب وہ گذرتے ہیں سرِ لاف و گزاف سے
جن کی کہ آشنا ہے زباں لام و کاف سے

اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

چل میکدہ میں شیخ بسر کر مہِ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو
کھولی نہ آنکھ ابرِ سیہ کے لحاف سے

پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگاں میں وہ پری
اس اپنے ناتواں کو پرے کوہ قاف سے

ہو جوہر کمال یہ ننگا جو خاکسار
اک تیغ ہے کہ ننگ ہے اسکو غلاف سے

گذری ہے مشقِ سینہ شگافی میں اے قلم
عاشق کی عمر نالۂ گردوں شگاف سے

گردش ہے اس کی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد
کافر کو کام کعبہ کے ہے کیا طواف سے

لڑتے ہیں گر نصیب کا ہے فلک سے ہم
فرقت کی رات کم نہیں روزِ مصاف سے

طوفِ سیاہ خیمہ لیلیٰ ہوا نصیب
مجنوں۔ سمجھیو کعبہ کے بہتر طواف سے

جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
ہے دمبدم نکل کے چمکتی غلاف سے

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود
لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے **ذوق** اس جہانکو ہے زیب اختلاف سے

سنہ ۱۸۵۰ء میں مرزا خدا بخش شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ کیا۔ اور دو مصرع طرح کئے

(۱) ع کیا کیا مصیبتیں ہیں دلِ پُرمحن کے ساتھ

دوسرا۔ ع

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

استاد نے دونو طرحوں میں غزلیں لکھی تھیں۔ اور مشاعرہ میں بھی گئے تھے۔ غزل مرقوم الذیل کہہ رہے تھے کہ ایک دوست آئے اور کہا کہ اس میں تو ساری غزل بے محاورہ ہو گئی اس طرح میں نہ کہیئے۔ میں نے کہا بے محاورہ ہماری غزل نہ ہوگی۔ کہوانے والے بے محاورہ ہونگے۔ ایسی طرح کیا سمجھ کر رکھی۔ استاد مرحوم نے تامّل کرکے فرمایا

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جامِ مے تو کیا — ہے دل سے یادِ ساقیٔ کوثر لگی ہوئی

اے ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خونابۂ حسرت کے مزے — زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی محبت کے مزے — بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے — بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

کھائے کوچے میں ترے آ کے جو سنگِ طفلاں — آئے مجنوں کو ترے میوۂ جنت کے مزے

لگتی مرچیں سی کبابوں کو ہیں سن کر کیا کیا — دلِ بریاں سے مرے سوزِ محبت کے مزے

حسرت ہر زخمِ جگر تا نہ ہو صد کانِ نمک — لوٹے کیا عشق میں اس کانِ ملاحت کے مزے

لذتِ عشق میں ہو۔ کاش تنا تیغ ہی آئی — کہ اڑائیں ترے سرباز شہادت کے مزے

دیکھ کر اس کو گیا عالمِ حیرت میں تو میں — پر بیاں کیا کروں اُس عالمِ حیرت کے مزے

سجدے میں پائے خمِ مے پہ ہیں کس لطافت سے مست — یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

پھول گلشن میں ہنسے کر کے زر اپنا برباد — کہ اڑانے ہی میں دولت کے ہیں دولت کے مزے

جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی — پوچھو فرہاد سے اس تلخیٔ حسرت کے مزے

ابر و باراں کے مزے کیونکہ نہ لوٹیں میخوار — کہ اڑاتے ہیں گنہگار ہی رحمت کے مزے

بے نمک پاش جو ہنس ہنس کے وہ لعلِ نمکیں — لے رہا ہے دلِ مجروح جراحت کے مزے

کچھ جتاؤں جو محبت تو ہے کہتا کہ تجھے — دیکھ تو کیسے چکھاتا ہوں محبت کے مزے

ذائقہ چاشنیٔ عشق کا کامل ہو تو دیں — شادیٔ وصل کی لذت غمِ فرقت کے مزے

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں — پر مزے دار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

خنجرِ ناز نے کیا چاٹ لگا دی دل کو — چاٹتا ہونٹ ہے لے لے کے جراحت کے مزے

بے مزاجی کو کہہ ہیں لاکھ ترے ظلم و ستم — پر نہیں بھولتے وہ پہلی عنایت کے مزے

پھر کٹا زخم کا انگور مبارک اے ذوق — دلِ زخمی کو ترے بادۂ حسرت کے مزے

بلا سے گر دانیال کا سا۔ نہیں ہے پاس اپنے فال نامہ۔
ہم اپنے نقطوں سے داغ دل ہی کے فال دولت نہ دیکھ لینگے

اگرچہ درد محبت اپنا۔ کہا نہ ہیں نے زباں سے اپنی۔
وہ میری صورت نہ دیکھ لینگے۔ وہ میری حالت نہ دیکھ لینگے؟

ہلال کو دیکھیں کیوں فلک پر۔ اگر ہے منظور عید ہم کو
تو ان کے تیغ ستم کا دل میں۔ اب جراحت نہ دیکھ لینگے

بہار باراں کو کون دیکھے۔ بغیر یاراں ہے تیر باراں۔
ہم اس کے بدلے سرشک مژگاں کی اپنے شدت نہ دیکھ لینگے

گزر بھی جاؤں گر اپنے جی سے۔ کہیں گے بیتاب جی چرایا
وہ جب تلک اپنے آستانے پہ میری تربت نہ دیکھ لینگے

مجھے یقیں ہے نہیں وہ کن کینگے اپنے رخسار لالہ گوں کو۔
رواں مری چشم تر سے جب تک وہ خون حسرت نہ دیکھ لینگے

تپ محبت کا میرے دل کی یقیں نہ آئے گا ہرگز ان کو
طپاں وہ رگ رگ میں میری جبتک کہ برق سرعت نہ دیکھ لینگے

خط ان کو دے بھی دیا جو قاصد نے **ذوق** دے کر کسی کا دھوکہ
وہ خط نہ پہچان لینگے میرا۔ مری عبارت نہ دیکھ لینگے

کیا مد نظر ہم کو ہے یاروں سے تو کہئے
حال دل بیتاب کہا جائے جو ہم سے
کیا کہئے گا اب دل سے خدنگ شہیداں
پھر تم نہ کہیں حضرت عیسے اگر ان سے
کچھ سوز دل اپنا کسی دلسوز کے آگے
موقوف ہے گر دل کا نسکار آن و ادا پر

گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہئے
گر کہئے نہ لاکھوں سے ہزاروں سے تو کہئے
کچھ فتنے اٹھانے ہوں ہزاروں سے تو کہئے
کہئے کہ یہ تم عشق کے ماروں سے تو کہئے
فرصت ہو تپ غم کے حراروں سے تو کہئے
تو پہلے کچھ ان میر شکاروں سے تو کہئے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہے ان کے تل سے
کیا حضرتِ آدم کی بھی اولاد غضب ہے

پریوں پہ تری طرح سے مرتے نہیں ہمدم
ہم جس پہ ہیں عاشق وہ پری زاد غضب ہے

تارے یہ فلک پر نہیں کہ اڑتے ہیں شرارے
عاشق کی ترے گرمیٔ فریاد غضب ہے

ہے سرو تو پابندِ غمِ بے ثمری میں
کہتے ہیں گرفتار کو آزاد غضب ہے

غصہ ہے ترا قہر ترا قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے بیداد غضب ہے

ہے غم سے نمونہ آئینہ با دیدۂ پر آب
اسکندرِ رومی کی بھی روداد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش یہ غم آباد غضب ہے

قامت تو ترا سرو کے پر ہے قیامت
پر طرۂ سرِ طرۂ شمشاد غضب ہے

سو فتنے ہیں پنہاں نظرِ لطف میں اس کی
یہ لطف نہیں اے دلِ ناشاد غضب ہے

دیں ہوش بھلا مردمِ ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمہاری وہ فسوں یاد غضب ہے

یہ خانۂ ہستی ہے عجب خانۂ رنگیں
اے **ذوق** مگر سستیٔ بنیاد غضب ہے

ہوئے وہ کب قائل قیامت۔ جو تیرا قامت نہ دیکھ لینگے
رہیں گے رویت کے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے

ہمیں غرض کیا کہ جائینگے ہم۔ حرم کو اے شیخ بتکدہ سے
یہیں بتوں میں خدا کا اپنے۔ ظہورِ قدرت نہ دیکھ لیں گے

نہ دیکھی کیسی کیسی آفت۔ جہاں میں ہم نے تمہارے باعث۔
اور آگے کیا کیا غم و الم ہم۔ تمہاری دولت نہ دیکھ لیں گے

دکھانا احوال ان کو اپنا۔ یہ ان کی الفت کا امتحاں ہے
کہ ہوگی الفت تو دیکھ لینگے۔ نہ ہوگی الفت نہ دیکھ لیں گے

کہوں یہ کیوں میں کہ حضرتِ دل۔ شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ۔
کہ آپ ہی تلخیٔ محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لیں گے؟

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھینگے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

سمجھیو وار و رسن. تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

نہ دیتی یوسف کنعاں کی خوبی بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھکو روبرو کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزار آرزو کی بہار
تمہاری باد بہاری میں آرزو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے. اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمر گزشتہ کا کیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

اُس سنگ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے
وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نماز ہے

ناساز ہم سے جو ہے اُسی سے یہ ساز ہے
کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جس پہ ناز ہے

دروازہ میکدے کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

خانہ خرابیاں دلِ بیمارِ غم کی ہائے
ہے وہ دوا خراب کہ جو خانہ ساز ہے

خنجر کہیں نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب
میرے گلے میں نالہ آہن گداز ہے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
دیکھو حرامزادے کی رسّی دراز ہے

اُس بُت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک
ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاکباز ہے

نقطہ پہ خالِ روئے بتاں کے مجھے خدا
بخشے تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

ہر برگ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا
گلشن میں کس کی خاکِ شہیدانِ ناز ہے

اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے تیرا رازِ عشق
جو نالہ ہے کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینہ بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انہیں دریا میں سفینہ بھر کے

عقد پروین پہ نہیں حقہ پروین میں ملک
لائے ہیں اُس رُخِ روشن کا پسینہ بھر کے

اُس گوہر دنداں پہ اگر سوجھے کوئی بات
موتی تو ہیں کیا مال ستاروں سے تو کہئے

جس راہ سے شانہ ہے گیا زلف رسا میں
اُس رستہ کو اُن سینہ نگاروں سے تو کہئے

کہئے نہ تنک ظرف سے اے ذوقؔ کبھی راز
کہہ کر اُسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہئے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

زال دُنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر
مرد دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے

تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھ کو
تہمت اُس زلفِ سیہ نام پہ دھر دیتی ہے

رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گزری
کیا طباشیر سفیدیِ سحر دیتی ہے

ناز و انداز تو ہیں کر چکے سب مشقِ ستم
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری
عین احساں ہے مجھے زہر بھی گر دیتی ہے

کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی
دل کو فرصت نہیں وہ تیغِ نظر دیتی ہے

شمع گھبرا نہ تپ غم سے کہ اک دم میں ابھی
آ کے کافور سفیدیِ سحر دیتی ہے

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا
اب تو اکسیر بھی دیجئے تو ضرر دیتی ہے

غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے
چپتیا منہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے

شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

نخل مژگاں سے یہ کیا جانئے کیا چشمِ ثمر
چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے

کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجر میں پر
نالۂ دل کا جواب آہِ جگر دیتی ہے

[illegible]

کوئی غماز نہیں میری طرف سے اے ذوقؔ
کان اُس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

مزہ تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا ترے تیروں کو آب پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکر بے وضو کرتے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم تم ساعدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم ہم کو جو پاؤ تو چھڑی کو نہیں پاتے

کیا وقت تھا وہ تجھ کو دیا دل تھا جو ہم نے
اے سنگدل اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے

وہ کونسی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

لیتے ہیں شبِ وصل میں اُس لب کے یہ بوسے
ہم لب پہ سحر رنگِ مسی کو نہیں پاتے

ہیں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی
گم ہو کے مری گم شدگی کو نہیں پاتے

رکھتے ہیں دمِ شعلہ نشاں اندرِ دوزخ
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کی دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اِس سرِ خفی کو نہیں پاتے

ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

نبض ملتی ہے کہاں میری فلاطوں چلتی
ہے یہ ضعف اب کہ چیونٹی بھی نہیں یوں چلتی

پہنچے کیونکر جرسِ ناقۂ لیلےٰ کی صدا
آج آندھی تری قسمت سے ہے مجنوں چلتی

کھول دو آنکھوں سے پٹی نہیں دیکھو نکتیں
پر چھری اپنی تو گردن پہ میں دیکھوں چلتی

جب میں دنیا سے چلا۔ سر پہ یہ اولی حسرت
تو اکیلا نہیں ہیں ساتھ ترے ہوں چلتی

دُور کر بالوں کو سر سے یہ ہے کہتی لیلےٰ
پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں چلتی

ہیں تو اُن آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں
کہ نہیں تیری جہاں گردشِ گردوں چلتی

ق

عمر ہے کر رہی ہر دم سفرِ بحرِ فنا
جس کو تو سانس کہے ہے۔ دلِ محزوں چلتی

سمجھے ہے راکبِ کشتی کہ ہے ساحل چلتا
پر حقیقت میں ہے کشتی سرِ جیحوں چلتی

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

سنہ ۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام

روز اُس گلشنِ رخسار سے لیجاتے ہیں
اپنے دامانِ نظر مردمِ بینا بھر کے

دل ہے آئینہ۔ صفا چاہیے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں آئینہ تو کینہ بھر کے

تم پہ جوش کی مانند جھلکتا ہے پڑا
خون حسرت سے لبوں تک مرا سینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کیساتھ
ذوق کے ساتھ تو حج ذوق سے پینا بھر کے

جو تھے مژگانِ پُرخوں سر بن خار نشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر تھے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

عدوئے بدنشیں ان کے گھر سے کب وہ نہیں نکلے؟
الٰہی بُرجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

چھٹے کیا ہم سے شوقِ حسنِ گندم گوں کہ گندم پر
ہمارے جدِ امجد چھوڑ کر خلدِ بریں نکلے

ترے انداز سے سو سو طرح کے نازنیں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے

پسے جا کر نہیں دنیا سے بھی کر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاکِ آدم سے نہ چپا بھر زمیں نکلے

غذا دے دوربینی اور اس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دوربیں نکلے

پلائے گر تصور اس لبِ شیریں کا آنکھوں کو
تو آنسو ہوکے شربت خون ہوکر انگبیں نکلے

قلم کی دیکھو گلکاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جائے حرف گلہائے انارِ آتشیں نکلے

زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیرے جانے کا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے

نہ ہو غربت میں گر قدرِ صفائے پاکیزہ گوہر کی
تو کیوں دریا سے یکتا ہوکے بھی دُرِ ثمیں نکلے

تباہی میں ہے موذی کی حلاوت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے

ہوئے تم میں برابر ہو کے میرے قتل کے درپے
چمکنے سے تمہارے جوہرِ شمشیرِ کیں نکلے

سراپا روسیاہی گر ہے ان نامداروں کو
ہوس دل سے نہ ان کے نام کی مثلِ نگیں نکلے

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
مگر کیا دخل جز زہرآب اس میں انگبیں نکلے

دلِ زخمی کی سلامت پہ دہنِ زخم کیا بولیں
زبانِ تیغ سے نکلے تو شاید آفریں نکلے

جو حسرت میرے دل میں ہے نکالوں میں کہاں اسکو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے

سنا کرتے تھے شہرہ ذوق جن کی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

ساتھ اس کے عاشق مشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو۔ اور اس میں اثبات مضمون بہ گواہوں سے قایم ہو۔ ایس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ۔ اُسے سُن کر جو پڑھتے تو اسی رتبہ کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر نہ دھرا تھا۔ اور وہ ان لوگوں میں نہ تھے۔ کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے۔ اور محل و مقام پہچانتے تھے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عز و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کیلئے — پہ ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے — ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے — کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کے لئے — قفس میں لوٹ رہا ہے دل آشیاں کے لئے

دم عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے — کمند آہ تو ہے بام آسماں کے لئے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لئے — ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کے لئے

جو سنگ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے شیخ — تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لئے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی۔ کہ عالم میں — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا — وگرنہ لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کے لئے

خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن اے یار — یہ جان اٹی ترے مجنونِ ناتواں کے لئے

الٰہی سوز محبت سے اڑتا ہے تنِ زار — کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار — ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کیلئے

مری مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور — کہ جان دی تھی روئے عرق فشاں کیلئے

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا — کہ[1] ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

قدِ خمیدہ دیا اپنے ہیں بال زیب و بال — اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

[1] کانوں پر ہاتھ رکھنا۔ انکار کرنا۔ مکر جانا۔ کان میں کچھ پھونکنا کسی کو اندر ہی اندر بہکا دینا۔

مشاعرہ کیا تھا۔ وہاں یہ غزل پڑھی گئی تھی۔ نواب موصوف نواب عبد اللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے۔ (دیکھو صفحہ ۹۸)۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر استاد مرحوم کے پاس آئے اور بڑے اصراروں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایام! استاد میرے والد مرحوم کے بغیر مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ ان کے پاس آئے۔ والد نے کہا۔ دل افسردہ ہو گیا۔ میں اُدھر نہیں جاتا۔ تم جاؤ۔ مگر جاؤ گے تو سنو گے کسے؟ اور سناؤ گے کسے؟ استاد نے کہا۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ وہ دونو آئے تھے۔ میں نے بھی ان کے اصرار سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤنگا۔ بندۂ آزاد اس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جا سکتا تھا جب تک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور مشاعرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اگلے مشاعروں کی باتیں سُن سُن کر آرزو مند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا غرض کہ مشاعرہ میں گئے۔ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا۔ کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے۔ مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا۔ حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا۔ پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سنا دئیے۔ انہیں دنوں میں ہوئے تھے۔

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
خط بڑھا۔ کاکل بڑھی۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے

اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دل

والد نے کہا۔ انہوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ نجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا۔ جی چھا جاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندۂ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک انکے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہونگے۔ مگر سخن سنج۔ نکتہ شناس تھے۔

ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ناراضی بڑھ گئی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ بندۂ آزاد استاد کی خدمت میں حاضر تھا۔ استاد کے کسی دوست نے کہا کہ میاں صاحب حج کو چلے۔ ایک اور صاحب بولے۔ جاتا ہے نہ آتا ہے باتیں سنا کیجئے۔ اُستاد نے سُن سُن کر فرمایا:۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے ۔۔۔ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

کئی مہینے کے بعد غزل پوری کی:۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے ۔۔۔ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

کیا خط لکھوں انہیں کہ جو لکھنے کی بات ہے ۔۔۔ پہلے ہی غیر واں ہیں انہیں سب پڑھا چکے

آنا بلا سے اُن کا قیامت سے کم نہیں ۔۔۔ ہیں ہم تو مر چکے اُسے آنا ہو آ چکے

زہر آب یا شراب یہاں سب ہے نوش جاں ۔۔۔ ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے

اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا ۔۔۔ جانے دو ہم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے

یاد آ یا یاں کے آنے کا وعدہ بھی خواب نہیں ۔۔۔ جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے

اے دل زمین بوجھ ہے یا آسماں کا بار ۔۔۔ ہیں اب تو سر پہ بار محبت اٹھا چکے

مُدت سے موت زیست پڑے ہیں گلے کا ہار ۔۔۔ تیغِ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے

اب ڈھیر گر خرابہ دنیا میں ہیں تو کیا ۔۔۔ پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اُڑا چکے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل ۔۔۔ سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی ۔۔۔ ہیں تیغ آبدار سے خوں میں نہا چکے

سب ہم سے قیمتِ دل و جاں پوچھتے ہیں آج ۔۔۔ تار اُن کے اک نگاہ میں ہیں سب چکا چکے

ہو معرکے میں عشق کے قائل نہ کیونکہ موت ۔۔۔ جھگڑا یہ وہ نہیں ہے کہ جو بے قضا چکے

اپنا ہی دل نہ پھیر سکے رُخ سے یار کے ۔۔۔ سر اپنا خوب حضرتِ ناصح پھرا چکے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی! ۔۔۔ ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشان ۔۔۔ دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کیلئے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگار زمانہ رہے نشاں کے لئے

امید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس
بہشت تھا نہیں آرام جاوداں کے لئے

نگاہِ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے
دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کے لئے

تمہاری نرگسِ بیمار نے جو کی تھی نگاہ!
وہی جواب ہوا طاقت و تواں کے لئے

مزاج اُن کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاجداں کے لئے

نہیں ہوں تنگ اتنا مجھے بھی ہے معلوم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کیلئے

اُڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنا نہیں سکے ہم
شبِ فراق میں خورشید آسماں کے لئے

چلیں ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
بشارت تو ہے لئے ارمغاں مغاں کے لئے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا ذوقؔ جو انساں کو اُس نے جز و ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

بادشاہی خواجہ سراؤں میں محبوب ایک خوجہ تھا بیگم کی اس پر بڑی مہر۔ بانی تھی وہ بڑھتے بڑھتے میاں محبوب۔ اور میاں صاحب ہو گئے۔ جب بیگم ترقی کرتے کرتے وزارت کی مالک ہوئیں تو محل کے ساتھ مقدمات دربار کے اختیار بھی کل محبوب کو مل گئے۔ اور محبوب علی خاں نواب ہو گئے۔ سفید سیاہ موقوفی بحالی سب ایک خوجہ کی زبان پر تھی۔ بے علم۔ بے لیاقت۔ بیہودہ اُس پر یہ اقتدار ضرورتیں تھیں کہ علما، شرفا۔ امرا کو اس کے پاس جی کر کے بے جاتی تھیں۔ اُس اُس کم بخت مخنث کو جوئے کا مرض تھا۔ شہر کے نامی نامی جواری ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایسے امن کی جگہ انہیں کہاں؟ حضور کبھی کبھی اس سے

زلفیں تری کافر انہیں دل سے مرے کیا کام
دل کعبہ ہے۔ اور کعبہ مسلماں کے لئے ہے

بیٹھا ہے سخنور جو گرفتارِ تفکر
زیبا یہ قفس مُرغِ خوش الحاں کے لئے ہے

مستوں کے لئے رحمتِ باری کے ہیں آثار
زاہد جو دعا مانگتا باراں کے لئے ہے

اپنوں سے نہ مِل اپنے ہیں سب اپنوں کے دشمن
ہر نے میں بھری آگ نیستاں کے لئے ہے

میں کس کی نگاہوں کا ہوں وحشی کہ مری خاک
اک کحل بصر چشم غزالاں کے لئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہے تو میری شبِ ہجراں کے لئے ہے

عاشق کا جنوں طرفہ تماشہ ہے کہ ہر بات
گویا سبق اطفالِ دبستاں کے لئے ہے

وہ زلف سیہ پھینکتی کیوں دام ہے دل پر
یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کے لئے ہے

دل بھی ہے مرا جان ترے مشق ستم کی
جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لئے ہے

دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لئے ہے

چُنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستارو ہیں کیا کیا چناں و چنیں ہے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
خبر بھی نہیں یاں کہ ہے یا نہیں ہے

یہی گر تری چشم سحر آفریں ہے
تو دل ہے۔ نہ جاں ہے نہ ایماں نہ دیں ہے

صنم میرے دل کو خدائی کا تیری
یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہر اک چاند دیکھے ہے انتیسویں کا
جہاں ناتواں ہیں وہ باریک بیں ہے

رُخ کے اشک اور آہ پہنچی فلک پر
مرا عشق کم خرچ بالانشیں ہے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو
یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے

پڑے تفرقے یہ جُدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں۔ دل کہیں۔ جاں کہیں ہے

شبِ غم میں دم ساز و دل سوز اپنا
دمِ سرد ہے نالۂ آتشیں ہے

ہنسی ہے جو کچھ رنجش آمیز اُن کی
تو موجِ تبسم بھی چینِ جبیں ہے

نہ ہوئے اگر تجھ کو دم کا بھروسا
تو جو دم ہے غافل دمِ واپسیں ہے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اٹھو کہیں۔ وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

چھلکے چھلکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ابر کیا۔ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ذکرِ حسنِ شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُن کو در پردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جھوٹ موٹ افیوں کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُن کو کف لاکر ڈرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
لطف اٹھانا ہے اگر منظور اس کے ناز کا — پہلے اس کا ناز اٹھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کہدو قاصد سے کہ جائے کچھ بہانہ سے وہاں — گر نہیں آتا بہانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے
زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے — چاک سینہ کا سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
پوچھے ملّا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا — سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے دئے اس کو نکال — اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں — سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
خط میں لکھوا کر انہیں بھیجا جو مطلع درد کا — دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے — دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جب کہا مرتا ہوں۔ وہ بولے مرا سر کاٹ کر — جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
واں ہلے ابرو۔ یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ — بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
سُن کے آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم — پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل — تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جو سکھایا اپنی قسمت نے۔ وگرنہ اس کو غیر — کیا سکھائے گا۔ سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو کچھ[لہ] کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لئے ہے — آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لئے ہے

لہ جو خانۂ ہستی میں ہے انساں کے لئے ہے۔

گلشن کو آب گر مژۂ اشکبار دے — بلبل بجائے بیضہ دُرِ آبدار دے

کیا خاک تجھ پہ جان کوئی جاں نثار دے — مٹی بھی جس کو تیرے نہ دل کا غبار دے

وہ زلف مشکبار اگر ایک تار دے — پھر میں نہ لوں اگر کوئی مشک تتار دے

جولاں سمندِ ناز کو اے شہسوار دے — تو سرمۂ چشم ماہ میں میرا غبار دے

وہ ناتواں ہوں میں کہ نہ جنبش کروں کبھی — پلٹے اگر نہ مجھ کو دلِ بیقرار دے

عشق اس پری کا ہے وہ بلا جائے لیکے جان — یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اتار دے

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط — قاصد جواب زندگیٔ مستعار دے

عمر یار کار ہے گا مرے ساتھ تا بہ حشر — سچ ہے کہ ساتھ یار کا کیونکر نہ یار دے

کرتا ہے یوں فغاں دلِ امیدوارِ وصل — جیسے اذاں بلند کوئی روزہ دار دے

ٹپ ہوں وہ گل کہ پہنچوں نہ گلبن سے خاک تک — جنبش اگر نہ مجھ کو نسیمِ بہار دے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

میں ہوں وہ زندہ دل کہ مری جانِ بیقرار — برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے

لے دام داغِ دل سے مرے سوزشِ آفتاب — وعدہ پہ روزِ حشر کے پر کون اُدھار دے

سنے رحم ہے۔ نہ پاسِ مروّت نہ منصفی — پھر جان کس امید پہ یہ جاں نثار دے

ہو گرمیٔ وفا سے شگفتہ نہ گل کا دل — جاں اپنی اُس پہ بلبلِ شیدا ہزار دے

بے فیض چشمہ آبِ مصفا کا ہے تو کیا — مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے

جانبازِ عشق جان تلک اپنی کھیل جائے — لیکن قمارِ عشق میں ہمت نہ ہار دے

جوں شمع مردہ کشتۂ زلفِ سیاہ کو — گر دے کفن تو دامنِ شبہائے تار دے

چھوڑے کمان چرخ نہ تیر اپنا چھوڑ نا — یہ آہ تیر ناک میں اس کی ہزار دے

عاشق نہ بدلے انجم گردوں سے اپنے اشک — کیوں کوڑیوں کے مول دُرِ شاہوار دے

نشتہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے — کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

وہ پہلو میں بیٹھے ہیں اور بدگمانی
لئے پھرتی مجھ کو کہیں کا کہیں ہے

ہنسی آتی ہے مجھ کو جب تیرے آگے
کوئی ماہِ کنعاں کو کہتا حسیں ہے

جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو!
لگائے ہوئے میرا دل دور بیں ہے

نہیں وہ رہے ہم سے تم تھے جو پہلے
زمانہ کو تو کچھ تغیر نہیں ہے

وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے
وہی آسماں اور وہ ہی زمیں ہے

نہ کی آہ سوزِ غمِ دل پہ اُٹھا ئے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

مرقوم الذیل مشاعرہ کی طرحی غزل ہے۔ مرزا خدا بخش شاہزادہ کے ہاں پڑھی تھی حکیم آغا جان عیش استاد کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اپنی غزل میں پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے سو وہ بھی گزار دے

شعر کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد مرحوم استاد کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ اُن سے استاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ انہوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہئے۔ طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک نقطہ پر دو فکر پہنچے۔ اور کس کس انداز سے پہنچے۔ حکیم صاحب کے بعد ہی ان کے آگے شمع آئی۔ حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے کیا نیک نیت اور منصف مزاج تھے۔ شعر سن کر خوش ہو گئے۔ رسائی طبع کی تعریف کی اور کہا کہ آپ فی الواقع استاد ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۱۷۴)

چھلا نہیں تو چھلے کا گُل اے نگار دے
پر کچھ نشانی اپنی مجھے یادگار دے

تو چشم میں نہ سرمہ نہ دنبالہ دار دے
مفتونِ چشم کو یوں ہی اک تیر مار دے

ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کب وہ نگار دے
جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے پُشت خار دے

ٹانکے نہ زخمِ دل میں ترا دلفگار دے
تو جب تلک نہ گیسوئے مشکیں کا تار دے

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے
یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دنیا میں
یہ تیرا خواب جادو اے خیالِ خام چلتا ہے

عجب شطرنجِ گردوں ہے کہ جسمیں اپنے گھوڑوں کو
نئے منصوبہ سے روز ابلقِ ایام چلتا ہے

کہو صیاد سے گر ذبح کرنا ہے تو جلدی کر
ابھی کچھ دم مرے سینہ میں زیرِ دام چلتا ہے

ارادہ گر کرے ناقص علوِ جاہِ کامل کا
تو یہ جانو کہ نابینا کنارِ بام چلتا ہے

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا
کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس کے پھیرے پہ ہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تابِ رخِ سیم تن میں ہے
پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب
زیرِ شکنجہ زلفِ شکن در شکن میں ہے

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزہ
پھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

ہیں روزنِ دہن میں جو کژدم لئے ہوئے
یہاں کام ان کا نیش زنی ہر سخن میں ہے

دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق
دیکھیں سہیل کیونکہ چمکتا یمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا درد سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

غزل مذکورہ ذیل ابتدائی مشق ہے۔ اس وقت استاد کی ۱۶-۱۷ برس کی عمر تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک دن والد مرحوم کو استاد نے کچھ پرانے مسودے دئے ہیں ان دنوں لڑکا تھا۔ وہ دیکھتے جاتے تھے۔ اور ہر کاغذ پر حسبِ حال کچھ کچھ کہتے بھی جاتے تھے جس پرچہ پر غزل مرقومہ ذیل کے شعر لکھے تھے۔ اُسے دیکھ کر والد نے افسوس کیا۔ اور کہا۔ اوہو۔ دیکھو جی! یہ وہ غزل ہے۔ ہائے کیا دن تھے وہ۔ اس مرحوم کا بھی افسوس ہی ہے۔ اُستاد نے کہا۔ افسوس!

ع رنگیں ہے آج کل کے گلِ نوبہار سے
اگلا جو رنگ [illegible] لوٹی اس چمن میں ہے

پُرانی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔

پُوچھ مت راہ وفا اُس نگہِ پُرفن سے
رہنمائی کی نہ رکھ چشمِ دلا رہزن سے

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے
بچ گئے جانا کہ یہ اُلجھیں گے ترے دامن سے

کافرِ عشق ہوں گر سر بھی جدا ہو تن سے
نکلے زُنّارِ محبت نہ مری گردن سے

تارِ ہر ساز کے پردہ میں محبت کے سبب
ایک فریاد نکلتی ہے دلِ آہن سے

ہوں میں وہ سوختہ موں شمع کہ مثلِ فانوس
میرا پیراہنِ تن میرے جدا ہے تن سے

تیغ غم سے ہو نہ کیوں سینہ سپرِ مردِ وفا
کثرتِ زخم بدن پر نہیں کم جوشن سے

تیرہ بختوں کا ہے وہ کلبۂ تاریک بلا
ڈر کے خورشید بھی جھانکا نہ جہاں روزن سے

میں گرانبارِ محبت مرا خوں بھی ہے گراں
جی دھڑکتا ہے ترے نازکیِ گردن سے

خوں مرا داغ نہیں دھوتا ہے تو کیا قاتل
یہ نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا ترے دامن سے

ہو گیا کاغذ سوزن زدہ سینہ سارا
دل کی جو پھانس تھی نکلی نہ سرِ سوزن سے

گر جھکے تیغ تری سر ابھی حاضر ہے کہ ہم
اس پہ مرتے ہیں کہ تعظیم تو لی دشمن سے

چشمِ میگون و صراحی بہ بغل۔ جام بکف
دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے

چھوڑ کر گھر ترے ہاتھوں سے نکل جائیں کہاں
تنگ ہمسایوں کو اے ذوقؔ نہ کر شیون سے

فلک تو ٹیڑھا ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے تیری اپنا کام چلتا ہے

بھرے جاؤں گا میں صیاد دم گلشن کے چلنے کا
مرے سینہ میں جب تک دم بزیرِ دام چلتا ہے

ہمیشہ دورِ عشرت ہے جو تم ہو اہلِ کیفیت
کہ مہر و ماہ سے دن رات یاں اک جام چلتا ہے

چلا پہلو سے اُٹھ کر جبکہ وہ آرامِ جان و دل
کہا آرام نے ہم سے کہ لو آرام چلتا ہے

ترا تیرِ نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہے بن کر موت کا پیغام چلتا ہے

سمندِ وحشت اپنا شاخِ گل کے تازیانہ سے[1]
جنوں کی شاہراہوں میں سدا شہ گام چلتا ہے

[1] پہلے فرمایا تھا۔ سمند وحشت اپنا چوبِ گل کے تازیانہ سے۔ پھر فرمایا: ہر شخص نہ سمجھے گا تو عام لوگوں کو کیا خبر ہے کہ ایران میں جیسے موسمِ بہار میں جنون ہو جاتا ہے اس پر یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے۔ اور اسے چوب گل زدن کہتے ہیں۔

تیغ قاتل سے ہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشورکا وہ دن کرے

دن قیامت کا تو ہے پر میرا طور بارِ عمل
ہائے اتنا ہے کہ امکاں کیا و فا وہ دن کرے

نیک و بد سب دن خدا کے ہیں لکھی جس دن کی ہو
کچھ کرو لیکن فرامش کیا قضا وہ دن کرے

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچ میں
یعنی میری فاتحہ کا کون سا وہ دن کرے

ذوق کہتا تھا کرونگا جمعہ کو حبّ کا عمل
کوئی اس کو جا کے تبلا دے ہو اوہ دن کرے

یہ غزل بھی اُسی عہد کی ہے۔ مسودات مذکور سے نقل کی ہے۔

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری حقیقتِ پُردرد کو کوئی اُس سے
یہ آہ و نالہ نہ کہوے بہ چشمِ تر تو کہے

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

بقدر مایہ نہیں گر ہر اک کا رتبہ و نام
بھلا حباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے

جو چپ لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

جل اُٹھے شمع کے مانند قصہ خواں کی زباں
ہمارا قصۂ پُرسوز لحظہ بھر تو کہے

شہیدِ عشق کا ہر قطرہ خون انا الحق ہے
کہے جو حق کوئی منصور اسقدر تو کہے

مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے
کہیگا اور تو کیا۔ پہلے الحذر تو کہے

بھرے گا بارِ محبت کی کیا فلک حامی
یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے

بلا سے ہو وئے مرا مرغ نامہ بر بھونرا
کہ اس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوشخبر تو کہے[1]

سرشک چشم مرے ہیں کہ ہو گئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائینگے

سامنے چشمِ گہربار کے کہہ دو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اُتر جائینگے

[1] دلی میں رسم تھی۔ کہ جب بھونرا اڑتا ہوا پاس آتا تھا۔ تو اُسے شگون نیک سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ خوشخبر خوشخبر۔ خاندان تباہ ہو گئے۔ وہ لوگ اب نہ رہے۔ کون کہے۔ اور کون سنے۔

پھر ایک دن میں نے والد سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ شاہ نصیر مرحوم کے بیٹے وجیہ الدین منیر تھے۔ اُن کی بھی اُس زمانہ میں ۱۶-۱۷ برس کی عمر تھی۔ اور طبیعت بھی تیز تھی۔ استاد کے ساتھ اکثر شعروں اور غزلوں کے معرکے رہتے تھے۔ ایک دن اُنہوں نے اُستاد سے کہا۔ مصرع طرح کرتے ہیں۔ آؤ غزل لکھو۔ لڑکپن کا عالم تھا۔ اُستاد نے کہا۔ کہو۔ کہینگے۔ مگر غزل کہی۔ اُستاد سے (شاہ صاحب) کہوالی۔ پھر کہا کیا؟ منیر نے کہا۔ اچھا پھر تم بتاؤ۔ اُستاد نے کہا ہم تم یہیں بیٹھ کر کہیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔ اور طبع آزمائی ہونے لگی۔ اُستاد نے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں غزل کہی۔ اور کہا۔ کیوں صاحب! اُنہوں نے بھی غزل کہی تھی۔ دونوں غزلیں پڑھی گئیں۔ اُستاد نے اپنی غزل اُنہیں دی۔ اور چلے آئے۔ دوسرے دن اُستاد گئے۔ تو اُنہوں نے کچھ اور شعر بھی سنائے۔ بعض میں ترمیم تھی۔ بعض اشعار پر اُستاد نے کہا۔ یہ شعر تمہارے ہیں؟ اُنہوں نے کہا۔ بیشک۔ اُستاد نے کہا۔ اب یہ شعر استاد (شاہ صاحب) کے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ واہ ہمارے ہیں۔ اس پر خوب گفتگوئیں رہیں۔ طرفین کے یاروں میں صلاح مشورے۔ اور مقابلے ہوتے رہے۔ خدا کی شان ہے۔ شاہ وجیہ الدین نوجوان دنیا سے گئے۔ اُستاد بڈھے ہوئے تو کیا۔ آخر چلے ہی گئے افسوس افسوس! وقت گزرتا ہے۔ باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ الٰہی ہم سے نیکی کا راستی یادگار باقی رکھیو۔ غزل مذکور میں سے جو کچھ باقی ہے وہی لکھ دیتا ہوں۔

یہاں کے آنے کا مقرر قاصد! وہ دن کرے
کون سی شب آئیگا وہ مہ منجم سے کہو
تو کرے قرباں ہمیں جس دن ہمارے واسطے
جب کہا قاصد نے دن وعدہ کا آیا تو کہا

جو تو مانگے گا وہی دونگا خدا وہ دن کرے
میرے سعد و نحس کا معلوم تا وہ دن کرے
عید قرباں سے شرف پیدا سوا وہ دن کرے
اس سے کہدو یوں ہی محشر تک گنا وہ دن کرے

ہے جراحت کا مری سودۂ الماس علاج
فائدہ اس کو کبھی سنگ جراحت نکرے

عشق کے داغ کو دل مہر نبوت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوائے نبوت نکرے

ہر قدم پر مرے اشکوں سے رواں ہیں دریا
کیا کرے بادہ اگر ترک رفاقت نکرے

آج تک خوں سے مرے تر ہے زبان خنجر
پر کرے کیا جو طلب کوئی شہادت نکرے

مکتب صبح ازل کا ہے خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ بھی خلافت نکرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نکرے

پھر چلا مقتل عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نکرے

کہتے ہیں جھوٹ سب کہ نہیں یا نو چھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں یا نو لوٹ کے

چلتا ہو ذوق قید سے ہستی کے چھوٹ کے
یہ قید مار ڈالے دم گھوٹ گھوٹ کے

ڈھالا جو تجھ کو حسن کے سانچے میں اے صنم
آنکھوں کی جائے بھر دئیے موتی سے کوٹ کے

بیدرد۔ سینہ کوٹنا خالی نہیں مرا
دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے لوٹ پھوٹ کے

اس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق
روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

ہر دم دل خوں گشتہ میں ایک جوش فزوں ہے
جو آہ ہے سینہ میں سو فوارۂ خوں ہے

دنیا کی ہے رفعت کا سبب پستی ہمت
گردوں کو ہے اوج اس لئے یاں میں کہ دوں ہے

پھر جاتی ہے سینہ کو مری آہ بھی الٹی
قسمت ہے جو برگشتہ ہوئی بخت نگوں ہے

میں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز
پر دل یہی کہتا ہے کہ ہرگز نہ کہوں ہے

اک غمزہ تری چشم فسوں کار کا کافر!
سو چشم پری کو سبق آموز فسوں ہے

دل کرتا ہے اس کوچہ کا جب قصد تو لیتا
طائر کے عوض رنگ پریدہ سے شگوں ہے

قایم ہے بنا درد کی فریاد سے میری
جو نالہ ہے ایوان محبت کا ستوں ہے

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائینگے

خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہم داں
پر نہیں زخم مرے ایسے کہ بھر جائینگے

لائے جو مست ہیں تربت پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائینگے

پہنچینگے رہ گذر یار تلک کیونکر ہم
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائینگے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرق شرم سے تر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوے تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائینگے

رخ روشن سے نقاب اپنے الٹ دیکھو تم
مہر و مہ نظروں سے یاروں کی اتر جائینگے

شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں
پر یہی ڈر ہے کہ وہ دیکھ کے ڈر جائینگے

ہم بھی دیکھیں گے کوئی اہل نظر ہے کہ نہیں
یہاں سے جب ہم روش تیر نظر جائینگے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائینگے

دل بچے کیونکر بتوں کی چشم شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجتا ہے سینکڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی کر تو واقف نہیں
اس دل بیتاب و جان مضطرب کے ڈھنگ سے

بل بے باریکی کہ گویا ہے ترا تار سخن
جنتری میں کھنچ کے نکلے ہے دہان تنگ سے

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھے گا کہاں تو ہم سے اے رنگین ادا
ہوگا تو جس رنگ میں ملجائینگے اس رنگ سے

جوش گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اس کی تیغ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نماز عشق میں
دل سے کہدیجے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہوگئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نہ کرے
اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نہ کرے

نہیں آتا نہ آئے رحم اے **ذوق** اس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ و زاری سے

یہ غزل بھی ایام شباب کی ہے۔ شاہ نصیر کے عہد میں کہی تھی

یار ہنسنے حال پر ہم دل افگاروں کے لگے
کاش کے ایسے ہی یارب تلوے یاروں کے لگے

اور بھی چمکا سمند وحشت اپنا دشت میں
تیز جوں مہمیز نشتر جب کہ خاروں کے لگے

کس کی کفش پا پہ دیکھے ہیں ستارے اے فلک
رہتے ہیں دیدے زمیں کو جو ستاروں کے لگے

بزم میں گر دانت پیسے بولے۔ توڑیں نقاب
چھوڑ دے مہتاب منہ پر ماہ پاروں کے لگے

اس طرح در پے دلوں کے ہیں ترے چشم و نگاہ
جوں ستمگر لگیں پیچھے ستمگاروں کے لگے

سرزمین باغ الفت میں ترے اے تند خو
نخل قامت جب ترے سینہ فگاروں کے لگے

ٹہنیاں تیروں کی کلیاں پھوٹے سوفاروں کے گل
خنجروں کے برگ دیکھے پھل کٹاروں کے لگے

ہو اگر گرم فغاں مرغ چمن میری طرح
آگ دم میں آشیانوں کو ہزاروں کے لگے

آئے ہم اس بزم میں اک دم ہوا سیر سینکڑوں
تیغ طعنوں کی الٰہی خنجر اشاروں کے لگے

اے خدنگ یار مرہم جائیں غیرت سے نہ کیوں
مرہم آ کر زخم پر سینہ فگاروں کے لگے

ذوق ہمزانے جنوں ہے ہو گیا ہے گردباد
توسن وحشت کو ہیں مہمیز خاروں کے لگے

باغ عالم میں جہاں نخل حنا لگتا ہے
دل پر خوں کا دیاں ہاتھ پتا لگتا ہے

کیا ترے تیر کا دل بسمل کا بھلا لگتا ہے
جب اچھلتا ہے ترے سینے سے لگتا ہے

دل کہاں سیر تماشے پہ مرا لگتا ہے
دل کہیں لگتا نہیں جینا بھی برا لگتا ہے

جو حوادث سے زمانے کے گرا کب اٹھا
نخل آندھی کا کہیں اکھڑا ہوا لگتا ہے

دل لگی کا ہے مزا یہ کہ گزک میں اے دل
سب کبابوں سے نمک تجھکو سوا لگتا ہے

نہ شب ہجر میں لگتی ہے زباں تالو سے
اور نہ پہلو مرا بستر سے ذرا لگتا ہے

ہائے محتاج ہوا مرہم زنگار کا تو
زخم دل از بہر مجھے ہنسنا ترا لگتا ہے

جس دل سے ہوا عشق مرے درپئے تعلیم
ہر خار بیابان تسلیم عشق جنوں سے ہے

مر جاؤں مگر راز محبت نہ جتاؤں
کیا ہی اگر ... دل میں نہ کہوں سے ہے

بیتابیٔ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف
دکھلا رہا گا ہے حرکت گاہ سکوں سے ہے

بیتابیٔ دل کا کوئی مضموں جو ہوا نظم
ہر حرف پہ میرے حرکت بجائے سکوں سے ہے

تلخابۂ حسرت کو بھوں کیوں نہ مزے سے
میری یہی تبرید تپ سوز دروں سے ہے

ہے وصل میں غم ہجر کا اور ہجر بلا سے ہے
آرام محبت میں ہیں یوہی نہ دوں سے ہے

آلودۂ اظہار نہ ہو راز محبت
دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں نہ کہوں ...

کھو آپ کو گر ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل
گم گشتگی اس رہ میں تری رہنموں سے ہے

بار دے سے وہاں لاکھوں ہیں شاگرد کہ حسن
وہ چشم فسوں گر سبق آموز فسوں سے ہے

کیوں حال زبوں اپنا بیاں ہے اُن سے
اے ذوقؔ ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے

کرے ہے کام تیغ یار کس کس آبداری سے
دکھاتی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخم کاری سے

زباں کھولینگے مجھ پہ بدزباں کیا بدشعاری سے
کسی نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے

گزرتی ہے مزہ میں زندگی غفلت شعاری سے
مرے نزدیک بیہوشی سے بہتر ہوشیاری سے

نہ ہوتا گر وہ شوخ خود نما سرگرم آرائش
اٹھاتا ہاتھ خورشید فلک آئینہ داری سے

روا ہے شمع کے اشکوں میں چربی ناک گھل گھل کر
بہا جاتا ہے دل خوں ہوکے اپنا اشکباری سے

خبر کیا پوچھتے ہوا پنے بیمار محبت کی
کہ نوبت دم شماری کی تھی شب اختر شماری سے

جو پوچھے زاہد خشک اپنی دارو۔ کہدو مے پی لے
اگر پرہیز کو پوچھے۔ کہو پرہیزگاری سے

قفس کو لے اُڑیں صیاد اسیر مضطرب تیرے
خبر گل کی اگر اڑتی سنیں باد بہاری سے

کبھی گر سر اٹھا اپنا تو جوں اشک سر مژگاں
زمیں کو جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے

اُٹھائے جاؤں کب تک داغ۔ کاش انکے عوض ہوتے
مری چھاتی پہ پتھر سنگدل دو چار بھاری سے

لگی بھی گر زمیں کو بیٹھ تیرے تفتہ جانو نکی
تو مثل برق اٹھ بھاگے وہیں پھر بیقراری سے

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی

تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیِ عمر
سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارہ آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

وہ ہوں میں پُر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
حذر دوزخ کرے جسکے شرارِ رنگِ تہمت سے

دوئی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
بنا واحد کے کیوں توڑیگا ملا جمعِ کثرت سے

نہ ہو کیسے دامنِ تر ذرہ میرا اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشیدِ قیامت سے

دمِ تکبیر اٹھائے دو جہاں سے ہاتھ یکباری
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسنِ نیت سے

اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں ذراتِ نالاں ہے
تو میں کہدوں محبت سے محبت سے محبت سے

برائے شوکتِ دنیا نہ لیجو عارِ دیں زاہد
سمجھو شوکۃ العقرب کو بہتر ایسی شوکت سے

نمک ہو بشک ہو یا سودہ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے

پڑھو گر فاتحہ تم آ کے مرقد پر شہیدوں کے
تو ہاں اٹھ کر اشارہ کردے انگشتِ شہادت سے

حریصوں کو نہیں ہے وسعت آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلائے فراغت سے

الف کو تیری قامت کے کیا استادِ قدرت نے
مزین صفحۂ ہستی پہ رعنائی کے خلعت سے

لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
مجھے زخمی کیا ہے کس نے ابرو کی اشارت سے

بہت اچھا کیا مجھ کو کیا گر قتل قاتل نے
کہ ہوویگا نہ عاشق اب کوئی اور اُسپہ عبرت سے

علاجِ زخمِ حسرت ہے مرا تیزابِ تیغ اس کا
نہیں سنگِ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے

اگر آرائشِ ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
بھلا باطن میں رتبہ کیا ہے اسکو نیک طینت سے

ہوئی حرفوں میں گویا نقطۂ رحمت سے زحمت
عدد دیتا ہے گر رحمت زیادہ ہوتی زحمت سے

زبانِ ریختہ کردی زبانِ اہلِ ولایت کی
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

سلہ حاشیہ کے لئے دیکھو صفحہ ۲۱۲

آب خنجر ہے جو زہراب وفاداروں کو
ملک سرحد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے[1]

قد مجنوں ترے پھولوں کی چھڑی ہے لیلیٰ
جب ذرا جھکتا ہے سر پاؤں سے جا لگتا ہے

زر ذرا ہد ہے تو کیا۔ کھوٹ ابھی ہے دل میں
ذوق اس زر کو کسوٹی یہ کسا لگتا ہے

اڑائی طرز نالہ کی تھی اکدم ترے مجنوں نے
سوا تبتک دیکھ لے منقار طوطی سُرخ ہے خوں سے

نہ شب آنکھوں میں خواب آیا خیال خال مشکوں سے
رہے بیدار ساری رات ہم ایک حب افیوں سے

یہ دنیا ہے وہ دودخانہ کہ جس میں دور گردوں نے
گل حکمت کئے کتنے ہی خم خاک فلاطوں سے

اثر ہو نالہ پر درد کا اتنا تو اے بلبل
کہ ٹپکے جائے شبنم اشک انجم چشم گردوں سے

شہید چشم میگوں ہوں کہو تربت پہ سب میکش
کریں آکر چراغاں ساغر صہبائے گلگوں سے

ترے مجنوں کے تن پر لاغری کا قطع ہے جامہ
بنا تا پیرہن ہے ایک برگ بید مجنوں سے

خدا جانے ہوئے بخت اپنے واژوں اسکی زلفوں سے
دیا زلفیں ہیں اسکی واژگوں مجھ بخت واژوں سے

اسی باغ سخن میں ذوق جی اپنا بہلتا ہے
جہاں بو عشق کی آتی ہے کچھ گلہائے مضموں سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ترا زباں سے ملانا زباں جو یاد آیا
نہ ہائے ہائے میں تالو سے پھر زبان لگی

کسی کے دل کا سنو حال۔ دل لگا کر تم
جو ہووے دل کو تمہارے بھی مہربان لگی

تو وہ ہلال جبیں ہے کہ تارے بن بن کر
رہے ہے تیری طرف چشم یک جہان لگی

خدا کرے کہے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی
کہ زلف اے بت بے کیش تیرے کان لگی

اڑائی حرص نے آکر جہاں میں سب کی خاک
نہیں ہے کس کو ہوا زیر آسمان لگی

تمہارے ہاتھوں ہمارے دل فگار میں آہ
سنان خنجر و پیکان کی ہے دکان لگی

[1] بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے۔ کہ امراض مہلک میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں۔ کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مر گیا پانی لگا تھا۔

آڑائیں بون جادوگر۔ بلا سے ہم نہیں ڈرتے ہے اپنا دم ہوا ہوتا۔ تری چشم پُر افسوں سے

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغِ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں رلا سے کیا کیا
دلِ بیتاب کریں اور دلِ بیتاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہے سوا
لیوے اس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

گردشِ چرخ ہے اے ذوق مہندس کیلئے
آسماں اس کو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیر اس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے گلِ عبہر میں گھر کرے

یوں میرے دل میں چبھتی ہے دنداں کی اسکے تاب
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

کاکلِ مشت چیں نہیں کہ گئے صبح و شام آئے
دل ہو کہ اس کی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوشِ گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سیکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گردِ باد کے مجنوں نے گھر کیا
سرگشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگِ رخ پہ اس کے تماشا ہے مرا خیال
جس طرح رنگ برگِ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا ہے کیا بھلا
یہ زنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دُزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دل [illegible] کا گم ہوا کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہینگے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو۔ عہد مذکور کا محاورہ سناتی ہے

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے ہے
البتہ آدمی۔ سو کبھی آئے جائے ہے

جو اس گلی میں مثل صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اسکو تمنا لے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو بتلائے جائے ہے
پر میرے پاس سے بھی کوئی کھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشک گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے اک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا سے پرچائے جائے ہے

ابر مژہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

فوارہ سے بجا ہے تو اے شمع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ پھوڑائے جائے ہے

کیا حال جسم زار کہوں سوز عشق سے
اک بال ہے کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمون اضطراب کا ہے یہ بھی اک اثر
وہ مرغ نامہ بر کو بھی پھڑکائے جائے ہے

تابوت تیرے کشتہ کو پہنیں سے کم نہیں
کیا پاؤں اپنے تن سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوق مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائے گی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے جائے ہے

ح واے

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورت سیماب مجھے

اسنے مارا رخ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیے بہر کفن چادر مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دل بیتاب مجھے

چمن دہر میں جوں سبزۂ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے دیا کرتے ہیں زہراب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

سفر عمر ہے یا رب کہ ہے طوفان بلا
ہر قدم سیل حوادث کا ہے گرداب مجھے

سلے ۳۰۔ ۴۰ برس ہوئے کہ اہل ولایت مرد تازہ ولایت شمشیر ولایت۔ عناب ولایتی۔ مردو ولایتی۔ اور مرد ولایت زا اور بلی ولایتی کہتے تھے۔ اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں دیکھو لفظ بلی سے مفہوم بدل گیا۔ آزاد۔

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا ذوقِ شوق
سن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہیں جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ اک زمانے سے
نہیں اس پہ بھی اے ظالم ترا ایماں ٹھکانے سے

ستمگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے

ڈھلینگے شمع کے سانچے میں گذرے سر پہ جو گذرے
بہینگے آنسوؤں میں ان کے آگے اس بہانے سے

پئے تسبیح زاہد ہو نگاہِ مست اگر تیری
تو ٹپکے بادۂ انگور اس کے دانے دانے سے

تمہاری زلف کے کوچوں میں پھرتا ہے وہ دیوانہ
پتہ لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانے سے

کہاں جاؤں اُڑا کر طائرِ بے بال و پر ہوں میں
قفس صیاد کا بہتر ہے تیرے آشیانے سے

نہ کھینچو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جانِ عشق لبِ جاں بخش پہ - دل عشق خطِ مشکیں پہ ہے
عیسائی اپنے دیں پہ ہے - موسائی اپنے دیں پہ ہے
دے سین کی صورت دکھا - تو ہنس کے دانت اپنے ذرا
یاسین کیا پڑھوا رہا - قاتل مرے بالیں پہ ہے
بلبل کا دل ہے خوں فشاں - ہیں عشق کی نیرنگیاں
سرخی رنگِ گل کہاں - یہ دامنِ گلچیں پہ ہے
حرفِ زبانی ہو کہ خط - قول ان کا سچ ہو یا غلط
میری تو اب تسکیں فقط - اے دل تری تسکیں پہ ہے
ہے خوشۂ انگور یا - کرتا ہے دل پر آبلہ -

مژہ تر پہ امنڈ کر جو شب آئے آنسو
شدتِ گریہ سے مو بر سرِ مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوڑتا تیروں کو ترے
کھینچ بھی دل سے جو سوفار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق سے کیا بار ور اللہ اللہ
یہ ثمر لائے کہ سرو لبِ جو ٹوٹ گئے

کہہ بہ تبدیلِ قوافی غزل اک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے جھلاتا ہے تو ٹوٹ گئے

کس کے موشانہ میں اے دستِ ہوس ٹوٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
آئے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آبلہ پا یہ ہے مژگاں سے پیدا
پاؤں میں چبھ کے مرے خار زبر ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اب کے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

رونگٹے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پہ بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

تو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم۔ ایسی ہوئی گم آواز
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

ہم اول ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ ولادت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دود آلود سمجھے
کہ تھے عشق حلوائے بے دود سمجھے

تری بانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے رحم۔ دل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آ گئے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم ان پر
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

کیا بت وعدہ دیدار کس نے — کہ ہے مشتاق اک عالم ابھی سے

ہوا جانا تجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خرم ابھی سے

حالت نشہ میں دیکھنا اس بیحجاب کی — ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی
کوچہ میں آ پڑے تھے ترے خاک ہوکے ہم — یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
قاصد جواب جان مری دیجیو مجھے — پر منتظر ہیں آنکھوں میں خط کے جواب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی منہ چھپا کے تم — دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

اے ذوق اب نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقت ہو حق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغاز شباب کا ہے۔

قفل صد خانہ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے — جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے
خار غم دل سے کسی طرح نہ نکلا اے شوق — ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے
چارہ گر سوزن تدبیر میں کچھ اور ہیں تار — جیب کے تار جو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے
سینکڑوں کاسۂ سر دہر میں مانند حباب — کبھی اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے
تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغر مے — ہاتھ کیا اس کے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
دختر رز نے وہ انداز دکھائے سر بزم — رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے
کیونکہ بن کشتیٔ مے کیجئے سیر دریا — میکشو زیر بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے
دیکھ کر سرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں — ہیں صنم خانوں میں زنار رگ گلو ٹوٹ گئے
تیرے ہاتھوں میں ہیں رنگ گل بازی آخر — بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
چشم مخمور کے اک جام میں سب یاروں کے — رات سر رشتۂ اعمال نکو ٹوٹ گئے
تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دل سے — تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے
کیا بیاں تم سے کروں زور شکست دل کا — کہ مری خاک سے بن بن کے سبو ٹوٹ گئے

صورت دکھائے اپنی دکھیں وہ کس طرح سے
آواز بھی نہ جس نے ہم کو کبھی سنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا غضب اس نے ہم کو کھوٹی کھری سنائی

ہنگام بوسہ گرم جو وہ اک ذرا ہوئے
شکر تو تھی ۔ پسینہ سے شکرتری ہوئے

ثبت اس بیاضِ چشم میں ہیں خطِ سبز سے
جو انتخابِ نسخۂ افسوں گری ہوئے

دکھلائے ہم نے لے کے جو دامن پہ دُرِ اشک
قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

اک خال زیرِ زلف سے ظاہر مرے لئے
اے یار سوختہ نقطۂ بد اختری ہوئے

جل جائے خاکِ وحشیِ چشمِ بتاں پہ گھاس
لیکن ہرن[1] کھری نہ یہ ہے بن ہری ہوئے

کچھ رکھتے آدمیت اگر ہوتے آدمی
یہ نور و روش تو حور ہوئے یا پری ہوئے

ہم جیتے جی جہان سے معدوم ہو گئے
اتنے نظر سے گم بسبب لاغری ہوئے

رسوا نہ ہوتے کرتے نہ گر جیب و سینہ چاک
ہم آپ اپنی باعثِ پردہ دری ہوئے

مطلب نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے ہے کام
دل دیکے اے صنم تجھے سب سے بری ہوئے

طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہمقریں
ہر چند سو قرآن مہ و مشتری ہوئے

اے ذوق آج سامنے اُس چشمِ مست کے
باطل سب اپنے دعوئ دانش وری ہوئے

غزل مرقوم الذیل پر نظرِ ثانی کی شعاع نہیں پڑی ۔

اک صدمہ دردِ دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

آنا ہے اُن کا گرچہ قیامت پہ منحصر
ہم خوش ہیں یہ کہ آنے کی اُن کے خبر تو ہے

ہے سر شہیدِ عشق کا زیبِ سنانِ یار
صد شکر بارے نخلِ وفا باردر تو ہے

اے شمع دل سے رونے میں جلتا تو کیا ہوا
ہو جاتی رات اس میں بلا سے بسر تو ہے

[1] ہرن کھری ایک گھاس ہے ۔ اس کے پتے کی شکل ہرن کے سُم سے ملتی ہے ۔ اس لئے یہ نام پایا ہے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشقِ چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے ۔ قبر پر جو سبزہ اُگے گا جل جائے گا ۔ ہاں ہرن کھری ضرور اُگے گی ۔ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں ۔ اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں ۔

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلوہ سے چمن میں رونق اے گلرو بڑھے
شاخِ گلبن میں بڑھے گل، گل میں نکہت بو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو پہنچوں اے بڑھا کے دست میں
ضعف سے مدت میں جوں شاخِ سر آہو بڑھے

کہہ رہا ہے حسن کے دیواں پہ خطِ پشتِ لب
ایک مطلع اور زیرِ مطلعِ ابرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت دگرنہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے

گفتگو دشمن سے واں شرارت سے جو بڑھکاتے ہیں روز
چاہتے ہیں اور سرائے شوقِ آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی دی ہے وا دے فرحت ترا
جس کے اک قطرہ سے سیروں جسم میں لوہو بڑھے

یوں دمِ گریہ ہوا دل سے مرے نالہ بلند
جیسے جوشِ پانی کے باعث سرِ آب جو بڑھے

حق کیفیت سے ہو معمور اگر مینا سے دل
پھر تو جامِ جم سے قدر کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی تپش اور وہاں غیرت کے سبب
گرمیِ صحبت تری اے شوخِ آتش خو بڑھے

جس نے بڑھ کر تیرا توں بڑھنے دیا نو گھٹے
حسن تیرا روز بر روز اے ہلالِ ابرو بڑھے

کیجو تپِ غم کو مٹا کیا ان کو دوا اس سے طبیب
روز شب ہیں اگر خبر نہ گھٹے کا ہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی ان سے ہم راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غمِ جاناں کی چشمِ دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو ان سے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جب تک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمہاری سب شہر میں ہے پوچھ
ہم کب ہیں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اس سے
گالی کے ساتھ اس نے ایک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہیگا جیسے کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں ہے تجھ تو اے بے خودی سنائی

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی آدھی کبھی سنائی

ہے دل میں درد اگر نہیں ہمدرد میرے پاس
دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے

اے دل ہجومِ رنج و الم سے نہ تنگ ہو
خانہ خراب خوش ہو کہ آباد گھر تو ہے

اُس بُت نے غائبانہ کہا یا نہیں کہا
چپ ہو گیا وہ بارے مجھے دیکھ کر تو ہے

تربت پہ دل جلوں کی نہیں گر چراغ و گل
سینہ میں سوزشِ دل و داغِ جگر تو ہے

کشتیٔ بحرِ غم مرے حق میں ہے تیغِ یار
کر دیتی ایک دم میں ادھر سے اُدھر تو ہے

وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہوئے ذوق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

یہ غزل عنفوانِ شباب کی ہے نظرثانی نہیں ہوئی۔

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
ہنسو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خطِ غبار مجھے
سمجھتے یار ہے کہ ہیں اپنا خاکسار مجھے

نگہ نے اُس کی مجھے سخت بیقرار کیا
بلا سے مار دے آکر کوئی کٹار مجھے

جمالِ یار نے مڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا
پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

تمہارے عشق میں ماہی سے تا بہ ماہِ فلک
دکھائی دیتے ہیں دلہائے داغدار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روزِ وصل پہ موقوف
تو کرنا کیا تھا نظر بند انتظار مجھے

عیاں ہے آئینہ رخ پہ جب سے خطِ غبار
وہ خط میں لکھتے ہیں کہ گرد خطِ غبار مجھے

ہوائے وادیٔ وحشت سے مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

نہ دیتا عشق اگر چشمِ اشکبار نے ذوق
جلا چکی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

لڑکپن کی غزل ہے۔ نظرثانی نہیں ہوئی۔

مرضِ عشق جسے ہوئے اسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

لوٹتے سیکڑوں نخچیر ہیں کیسا یاد رہے
چیر دو سینہ میں دل کو کہ پتہ یاد رہے

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند ہیں دے لو گرہ تاکہ ذرا یاد رہے

قاصد عاشقِ سودا زدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

دیکھ بھی لینا نہیں راہ میں اور کیوں صاحب
ہم سے منہ پھیر کے جانا یہ بھلا یاد رہے

تیرے مدہوش سے کیا ہوش و خرد کی ہو امید
رات کا بھی نہ جسے کھایا ہوا یاد رہے

کشتۂ ناز کی گردن پہ چھری پھیر د جب
کاش اس وقت تمہیں نام خدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا مری اُس کوچہ میں
تجھ سے کہہ دیتا ہوں میں بادِ صبا یاد رہے

گور تک آئے تو چھاتی پہ قدم بھی رکھدو
کوئی بیدل ادھر آئے تو پتا یاد رہے

تیرا عاشق نہ ہو آسودہ بزیرِ طوبےٰ
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آجائیں جفا سے جو کبھی آپ تو پھر
یاد ہم عاشق کو نہ کیجئے گا بھلا یاد رہے

داغِ دل پر مرے پھاہا نہیں ہے انگارا
چارہ گر پیجیو نہ جسکی سے اُٹھا یاد رہے

زخمِ دل ہوئے ترے دل کے نمکخواروں سے
او بھلا کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

حضرتِ عشق کے مکتب میں ہے تعلیم کچھ اور
یہاں لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

گر حقیقت میں ہے رہنا تو نہ رکھ خود بینی
بھولے بندہ جو خودی کو تو خدا یاد رہے

عالمِ حسن خدائی ہے بتوں کی اے ذوق
چل کے بت خانہ میں بیٹھو کہ خدا یاد رہے

چشمِ قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچے میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے

خاکساری ہے عجب صفت کہ جوں جوں ہو سوا
ہو صفا اور دلِ اہلِ صفا یاد رہے

ہو یہ لبیک حرم یا یہ اذانِ مسجد
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی۔ اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ[1]
دیکھئے کب تک انہیں میری خطا یاد رہے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۸

ذوق اس لب شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا
کیا کہیے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

پری رو کیا تمہیں پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھونکے یہاں وقت سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسی کی فندقیں یاد آ گئیں ہیں ورنہ مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے

جو دیں ہیں گالیاں اس بدزباں کو آج کیا کہیے
کبھی نادم ہم اسکو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے اب کے جاں کا حضرت دل بیٹھے حیراں ہیں
پریشاں ورنہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے

کتاب دل شعلۂ عشق سے ہے جل اٹھی شاید
کہ مضموں سوز دل کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے آبلوں میں آب ہے یا آب داری ہے
کہ پہلے خار صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ تھے گزرے
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

زمانہ میں ہیں سنتے شور مدت سے قیامت کا
برابر قامت جو ہیں شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے شعر سن کر ذوق جیسے بزم عالم میں
ہوئے قائل ہیں اب اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشق تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
لگا رہ پر ہے مثل ماہی تصویر پہلو سے

نہ لے اے ناوک افگن دل کو میرے چیر پہلو سے
کہ وہ تو جا چکا ساتھ آہ کے جوں تیر پہلو سے

دل سیپارہ کو دے مانگ تعویذ یمیں ہیکل کے
نہ سرکا یہ حمائل اے بت بے پیر پہلو سے

وہ ہوں بے دست و پا بسمل رسائی جب نہ ہاتھ آئی
کیا تا پائے قاتل از تہ شمشیر پہلو سے

اسیر زلف دیوانے ہیں جیو اے پاسباں شکوہ
دبا کر بیٹھ ان کے پاؤں کی زنجیر پہلو سے

مصور لیلیٰ و مجنوں کی ناکامی پہ حیراں ہے
کبھی بیٹھا نہ مل کر پہلوئے تصویر پہلو سے

یہ دل لب تشنۂ تیغ یار کا ہے رات بھر کرتا
صدائے العطش جوں نالۂ شبگیر پہلو سے

عجب حسرت کا عالم تھا کہ مجنوں کہتا تھا پیہم
چھٹے پہلو مرے محمل کا یا تقدیر پہلو سے

دو ورق ہیں کفِ حسرت کے دو عالم کا ہے علم
سبق عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے اے دل اُسنے
پر غدا ہے کہ اُسے نام مرا یاد رہے

طائرِ بسمل تماشا بن کے کہا دل نے مجھے
کہ تڑپ کر یونہی مرجائیگا جا یاد رہے

جب یہ دیندار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے
کاش اُسوقت انہیں نام خدا یاد رہے

ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد
بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

محو اتنے بھی نہو عشقِ بتاں میں اے ذوق
چاہیے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر عالمِ تصویر کو دیکھو
تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے

ہے شانہ کہ میرا دلِ دیوانہ ہے اُلجھا
معلوم نہیں زلفِ گرہ گیر میں کیا ہے

پارہ کی جگہ کُشتہ اگر ہو دلِ بیتاب
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اتنی چھری تیز
اب باقی بھلا اس ترے نخچیر میں کیا ہے

کچھ سلسلہ جنبانِ جنوں ہے ترا مجنوں
غل دیکھ بپا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

بیٹھا ہے درِ کعبہ پہ حیراں ترا شیدا
لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے

صیاد عبث گرد ہے تو اسکے شب و روز
تو دیکھ تو کچھ اس ترے نخچیر میں کیا ہے

ہے صیدِ نگاہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر
اِس تیر میں کیا لطف ہے اس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا
کیا جانے دلِ عاشقِ دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور ہم تہِ خنجر
تاخیر ہو کیوں؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اُترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا
کیا جانے اُس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دمِ ذبح
لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

؎۵۱ اسوقت نیپالی کاغذ بھی عمدہ کاغذوں میں تھا۔ غنیمت ہے۔ اب کشمیری تو باقی ہے۔ ۷۰۔۸۰ برس کی کمر میں دنیا کی حالت ایسی بدل گئی ہے۔

پڑھی تھی۔ ان کی شاگردی کا تمغہ ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

حدِ رقم سے وصفِ جبیں ہے صنم پرے
برحق ہے شاخِ سدرہ سے لوح و قلم پرے

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تم پرے

کہتا ہے کسکو ناز سے تو دمبدم پرے
تو دو قدم کہے میں رہوں سو قدم پرے

بسمل ترے تڑپ کے بھی پہنچے نہ پاؤں تک
یا دو قدم ورے رہے یا دو قدم پرے

کیوں گرمِ اضطراب ہے اس درجہ اے شرار
ہستی سے کتنی دور ہے ملکِ عدم پرے

پھر کر ہمارے کعبۂ دل میں غزالِ یار
کہتے ہیں دیکھ رہیو غزالِ حرم پرے

قاتل جو تیرے ہاتھ میں پٹی ہو زہر کی
مرہم کو زخمِ دل سے اٹھا رکھیں ہم پرے

ہے موجِ ریگِ بادیہ۔ کیا ایک گام تک
ہوگی سوا کشتیٔ نقشِ قدم پرے

یارب کدھر کو جائے یہ جانباز درد و غم
باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے

اتنا بھی ہم نہیں ہے کہ تیرا مریضِ غم
سر کے نظر سے صورتِ نقشِ قدم پرے

ق

شب گھر پہ ان کے غیر نے تو آلیا تھا پر
دیوارِ بام پہ رکے چڑھے ہم کہ دھم پرے

لکھا اپنی شرحِ سوزِ دلِ بے قرار آج
آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجئے رقم پرے

اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم
ہاتھوں سے جا پڑا مرے جھٹ کر قلم پرے

یہ کیا شبِ وصال۔ کہ دونوں بہم تو ہیں
پر ہم سے وہ ہیں بیٹھے پرے اُنسے ہم پرے

کعبہ نہیں۔ یہ کعبۂ دل ہے مقامِ دوست
رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے

تم آؤ گر تو آؤ۔ نہیں مجھ کو لو بلا
گھر سے تمہارے گھر ہے مرا کئی قدم پرے

برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے ناز سے
مژگاں تک اسکی آکے نگاہِ کرم پرے

میں نے کہا جو ان سے نکلتا ہے میرا دم
بولے خدا کے واسطے رکھئے یہ دم پرے

دیکھو نہ جاؤ حضرتِ دل زلفِ یار میں
رستہ نہیں ہے آپ کے سر کی قسم پرے

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوق
ہے اب تو یہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے

نہ کہنا اُس سے تو اب ان کو یہ عالم لاغری کا ہے
کہ ہے دکھلا رہا میرا دلِ دلگیر پہلو سے

خیالِ ابروئے جاناں نہیں دل چھوڑتا اک دم
سپاہی کب جدا کرتا نہیں شمشیر پہلو سے

تمام اہلِ فن بزمِ سخن میں ذوق حیراں تھا
ملا جو قافیہ تو نے کیا تحریر پہلو سے

برق تو میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی
کچھ جو خاکستر بچا آندھی اڑا کر لے گئی

اس کے قدموں تک نہ بیتابی بڑھا کر لے گئی
ہائے دو چلنے نہ دے اور پھر ہٹا کر لے گئی

ناتوانی ہم کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر لے گئی
چیونٹی سے چیونٹی دانہ چھڑا کر لے گئی

صبحِ رخ سے کون شامِ زلف میں جاتا تھا؟
اے دلِ شامت زدہ شامت لگا کر لے گئی

خون سے فرہاد کے رنگیں ہوا دامانِ کوہ
کیوں نہ سونچ شیریں یہ دھبہ چھڑا کر لے گئی

ہم نے تو چھوڑا ہی تھا اے ہمرہانِ قافلہ
لیکن آوازِ جرس ہم کو جگا کر لے گئی

نوکِ مژگاں جب ہوئی سینہ فگاروں سے دوچار
پارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لے گئی

دیکھی کچھ دل کی کشش لیلیٰ کہ ناقہ کو ترے
سوئے مجنوں آخرش رستہ بھلا کر لے گئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہمیں دم بھر کے بعد
بدگمانی انکے گھر سو گھر پھرا کر لے گئی

داد اے سوزِ دروں کوچہ میں اسکے برقِ آہ
رات ہم کو ہر قدم مشعل دکھا کر لے گئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا
کیا کہوں تقدیر اسے کیونکر اٹھا کر لے گئی

دشتِ وحشت میں بگولا تھا کہ دیوانہ ترا
روحِ مجنوں بہرِ استقبال آ کر لے گئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو
آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لے گئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ
دل اڑا کر لے گئی یا پر لگا کر لے گئی

ذوق مرجانے کا تو اپنے کوئی موقع نہ تھا
کوئے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لے گئی

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہیں

لہ لڑکپن کا کلام ہے۔ گرہ پہلو عجب طرح بیٹھا ہے۔ جاننے والے ہی جانینگے۔ اللہ کی قدرت ہے جس کو جب چاہتے دے

دکھلاتا اک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ
اس سادہ پن کے ساتھ ترا بانکپن مجھے

جیسے کوئیں میں ہو کوئی تارا چمک رہا
دل سوجھتا ہے یوں تہِ چاہِ ذقن مجھے

آکر اسے بھی دو کبھی آنکھیں ذرا دکھا
آنکھیں دکھا رہا ہے غزالِ ختن مجھے

آ اے مرے چمن کہ ہوا میں تری ہوا
صحرائے دل ہوائے چمن در چمن مجھے

یارب یہ دل ہے یا کہ ہے آئینۂ نظر
دکھلا رہا ہے سیر و سفر در وطن مجھے

آیا ہوں نو ریکے میں بزمِ سخن میں ذوق
آنکھوں پہ سب بٹھائینگے اہلِ سخن مجھے

یہ غزل بھی آغازِ شباب کی ہے۔ مضمونِ مطلع بھی گواہی دیتا ہے:-

مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
کہہ دو ہم سے نہ کوئی دیکے نشانی مانگے

اے صنم دیکھ کے ہمدم کی تری کم سخنی
موت گھبرا کے نہ کیوں یہ خفقانی مانگے

نوک سے تشنۂ دیدار کے سبزہ جو اٹھے
تو زباں اپنی نکالے ہوئے پانی مانگے

مار پیچاں تو بلا ہیگا مگر تو اے زلف
ہے وہ کافر کہ نہ کاٹا ترا پانی مانگے

دہنِ یار ہوا اور مانگے کسی سے دل کو
وہ جو مانگے تو باندازِ نہانی مانگے

دل مرا بوسہ بہ پیغام نہیں ہے ہمدم
یار لیتا ہے تو لے اپنی زبانی مانگے

جلوہ اُس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ لے حسنِ معانی مانگے

نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پہ چمن نہیں دیتے

جفائیں بات وہ کیا حکمۃً نہیں دیتے؟
کہ دردِ جاں ہمیں اب زخمِ تن نہیں دیتے

جو بولوں کچھ تو مجالِ سخن نہیں دیتے
سیوں بھی میں تو وہ سینے دہن نہیں دیتے

سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید
دکھا اُسے مرا داغِ کہن نہیں دیتے

میں منع کر رہے رونے کو یہ جو نادانِ دست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

یہ پڑ گئیں تنِ لاغر میں دھجیاں ہیں مرے
کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

تنگ ہو زیست سے ہیں تختۂ تابوت انہیں
مر کے اک تخت ہوا دا نظر آتا ہے

دُرِ مضموں ہیں ترے ذوق زبس بیش بہا
کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے

دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گلبدن مجھے
ہر لالہ یاں ہے نافۂ مشکِ ختن مجھے

ہمدم و بالِ دوش نہ کر پیرہن مجھے
کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے

پھرتا لیے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے
زنجیرِ پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے

تسبیح دو۔ بزم میں دیکھو امام کو
بخشی ہے حق نے زیبِ سرِ انجمن مجھے

اے میرے یاسمن[۱] ترے دندان آبدار
گلشن میں ہیں دُلاتے گلِ یاسمن مجھے

محرابِ کعبہ جب سے بنے تیرا خم کماں
صیدِ حرم سمجھتے ہیں ناوک فگن مجھے

ہے تن میں ریشہ ہائے نئے خشک استخواں
کیوں کھینچتا ہے کانوں میں آ کے ضعفِ تن مجھے

لے لب مسی کو پھینک کہ نیلم ہے کم بہا
یاقوت دیدیا کوئی لعلِ یمن مجھے

ہوں شمع یا کہ شعلہ خبر کچھ نہیں مگر
فانوس ہو رہا ہے مرا پیرہن مجھے

اک سر زمینِ لالہ بہار و خزاں میں ہے
یکساں ہے داغِ تازہ و داغِ کہن مجھے

نسہ وسے تیشہ بولا جو چاہوں نہ تیرا خون
شیریں نہ ہووے خونِ سرِ کوہکن مجھے

رُخ پر تمہارے دام جو ڈالا ہے سبزے نے
آتا نظر ہے دیدۂ عنقا دہن مجھے

یہ دل وہ ہے کہ کر دے زمیں آسماں کو خاک
اک دم کو برق دے جو پہنا پیرہن مجھے

کوچہ میں تیرے کون اٹھا لیتا بھلا خبر
شب چاندنی نے آکے پہنایا کفن مجھے

دکھلاتا آسماں سے ہے روئے زمیں کی سیر
اے رشکِ ماہ تیری جبیں کا شکن مجھے

رکھتا ہے چشمِ لطف یہ کس کس ادا کے ساتھ
دیتا ہے جام ساقیِ پیماں شکن مجھے

ہے جذبِ دل درست تو چاہِ فراق سے
کھینچے گی تیری زلفِ شکن در شکن مجھے

۱ اس شعر کو پڑھکر ایک دن فرمایا کہ ایسے موقع پر اب تک زبانِ اردو کے شاعر اے رشکِ یاسمن کہتے ہیں۔ مگر خیر یہ بھی ایک انداز نکلا۔ جو گیا تو ہو گیا۔ رہا تو رہا ۱۲

خاک اُس زیست پہ جب سنگِ در اُس کے ہوئے
مر کے ہم خاک میں جیتے تھے تو کیا پتھر تھے

میرے نالوں نے تو پتھر سے بہائے چشمے
اے بتو تم ہی پسیجے نہ ذرا پتھر تھے

کعبۂ عشق کا اے ذوق کیا ہم نے طواف
آئینہ خاک تھی اور سنگِ صفا پتھر تھے

دلِ مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مر کے گر خاک میں تو چھاتی پہ پتھر ہی دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاجِ شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھرے گر ترے در پر تھے تو کیا پتھر تھے

کہہ نہ بتخانہ میں اے شیخ بتوں کو دل سنگ
وہاں ترے کعبہ کے اندر تھے تو کیا پتھر تھے

کتنا رویا ہوں ولیکن نہ پسیجے وہ سنگ
سنگدل گر نہ ستمگر تھے تو کیا پتھر تھے

ساقیا خاک ہے گر شیشۂ دل میرا تو کیا؟
اور بلور میں ترے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے

سنگدل وہ رہے اے ذوق صداقت میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں منہ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری
شکوہ کیا کیجے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پاؤں کانٹوں کا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارۂ مصحفِ دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آتے پاؤں کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آ کے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزنِ در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گھٹ گھٹاتا ہے کبھی مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شبِ ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں اک نالہ سے میں حشر بپا سو حشر
شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

بس تھی نکلے جو اُس دامِ بلا سے اے ذوق
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آتے تو سہی

شہیدِ ناز کے جہلم پہ ہے نظر شاید
کہ سرمہ آنکھوں میں تم جانِ من نہیں دیتے

اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتہ یارو[۱]
بتا اُسے مرا بیت الحزن نہیں دیتے

عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گزر
کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

جو مانگا آبِ دمِ تیغ اُس سے بسمل نے
تو بولا - زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

بیانِ شیخ جو ہے وصفِ حور و شعلۂ طور
ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

وہ تیر کھینچے ہے پہلو سے کہہ کے اے دلِ زار
کہ ہے نشانیِ ناوک فگن نہیں دیتے

ہو اُن کی زلف سے کیا زخمِ دل کو چشمِ امید
لگا پھلے کو وہ مشکِ ختن نہیں دیتے

پڑے ہیں دامنِ کہسار و دامنِ صحرا
ترے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

زباں حلاوتِ اُلفت کا ہے مزہ کہ نہ لے
لب اپنی مدت گزر نے سخن نہیں دیتے

پلا یا زہر - دکھایا ہے مے کا پیمانہ
یہ دھوکے اے بتِ پیماں شکن نہیں دیتے

سنبھال ناخنِ وحشت کو اب تجھے دستِ جنوں
کہ سینے پہ مرا چاکِ کفن نہیں دیتے

گلوں سے بن چکے جب دونوں ہاتھ گلدستہ
تو بولے ذوق جلا تن بدن نہیں دیتے

اے صنم ہجر میں ہم جیسے بھلا پتھر تھے
سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے

وہ بھی دن یاد ہیں جب کوئے صنم میں اے دل
بسترِ خاک تھا اور تکیہ کی جا پتھر تھے

دلِ مجروح نے جو کھائے جنوں میں پتھر
اس کو وہ سنگِ جراحت سے سوا پتھر تھے

پوچھا اُس بت نے تو نکلی نہ زباں سے اک بات
حضرتِ دل وہاں کیا بارِ خدا پتھر تھے

جن دلوں نے ہے کیا چور مرا شیشۂ دل
اے بتو دل تو نہ تھے وہ - بخدا پتھر تھے

عمر بھر کھاتا رہا سرو قدوں کی دُشنام
اس شجر سے مری قسمت کے سدا پتھر تھے

کون ہمدم شبِ غربت میں تھا بیکس کا ترے
یا تو سناٹا تھا یا دیتے صدا پتھر تھے

تھے دل سنگ میں جبتک تو رہے قطرۂ خوں
تاجِ شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے

[۱] یہ غزل بھی شاہ نصیر مرحوم کے عہد کی ہے۔ اُستاد مرحوم کی آخر عمر میں جان من اور یارو غزلیت کے دائرہ سے نکل گئے تھے ۱۲

متفرقاتِ یاس

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ میں پیکاں سے
اُڑائے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشمِ فتاں سے
چمکتی ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ یاراں سے
یہاں تک ناتواں ہیں ہم گزر جائیں اگر جاں سے
اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے

دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے
برستے پھول ہیں سر پر یہ شرارِ سنگ طفلاں سے
گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اُنکی مژگاں سے
لگیگی ابرِ رحمت کی جھڑی اب چشمِ گریاں سے
اُٹھائے مور لاشہ کو ہمارے دستِ مژگاں سے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے
پھرتا سرگشتہ زمانہ میں بھلا کیوں خورشید
وہ مرے اخترِ طالع کی ہے وارڑوں گردش
کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قتل
جا کے پھرتا نہ تھا اکبار جہاں ۔ وہاں مجھکو

کون پھرتا ہے یہ مُردار لیے پھرتی ہے
ہوسِ گرمیِ بازار لیے پھرتی ہے
کہ فلک کو بھی نگونسار لیے پھرتی ہے
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے
بے قراری ہے کہ سو بار لیے پھرتی ہے

کون وقت اے وائے گزرا جی کو گھبراتے ہوئے
آتشِ خورشید سے اُٹھتا نہیں دیکھا دھواں
وہ نہ جاگے رات ۔ اور یاں ضد سے بختِ خفتہ کی
چاک آتا ہے نظر پیراہنِ صبحِ بہار

موت آتی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے
آکھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے
بج گیا آخر گجر زنجیر کھڑکاتے ہوئے
کس شہیدِ ناز کو دیکھا ہے کفناتے ہوئے

یہ غزل بھی اسی زمانہ کی ہے ۔

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے
تم آتے آؤ نہیں نہ آؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہ دل ہے آئینہ تم ہو صورت نہیں ہے یہاں نام کو کدورت
کسی کو گھر میں بُلا بٹھاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

خلل بنانے مکاں کو پہنچے تو ہوگا نقصاں مکیں کو پہلے
مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

غلط ہے تہمت ہے افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے
کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

گئی ہے رات اب بہت زیادہ کدھر کا کرتے ہو تم ارادہ
نہ گھر کے جانے کی اب سُناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اپنے رُخ میں ہو کر رہے دن ہو زلف میں شب کے عقدے گن گن
ہزار دل سے نہیں بھلاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

مکانِ دیدہ پسندِ خاطر اگر نہیں ہے کہ ہوں گے ظاہر
تو خیر تشریف تم نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اُس کو دودِ داغ مثلِ لالہ دیا کرو بیٹھکر اُجالا
بگاڑو تم اس کو یا بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہی زباں سے ہے ذوقؔ کہتا تمہارا ہے دھیاں آہیں بتا
جُدا مکاں اور کیوں بساؤ ہمارے دلمیں تمہارا گھر ہے

کیا وہ دنیا جس میں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے
واسطے وانکے بھی کچھ پاس ہیں کے واسطے

خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے
اے سکندر کس لئے؟ دو گز زمیں کے واسطے

ذوق عاصی ہے پہ اس کا خاتمہ کیجو بخیر
یاالٰہی اپنے ختم المرسلیں کے واسطے

سوزِ دل سے مرے نالے جو شرر بار ہوئے
مدعی جل گئے اچھا ہوا فی النار ہوئے

ٹکڑے اڑ جائیں قفس کے تو اڑینگے نہ کبھی
ہم ہیں صیاد کی الفت میں گرفتار ہوئے

چمن دل سے ہوے کم نہ گلِ لختِ جگر
دو اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے

رنگین کی غزل تھی ۳ شعر یاد رہ گئے:۔

چھپا کے پھولوں میں منھ صبا سے جو مسکرائے سحر کلی ہے
تبسم اس گل کا یاد کر کے عجب ہوئی دل کو بے کلی ہے

تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر
دکھایا تم نے جو رو کے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

بناؤ لِلّٰہ چوبِ صندل سے میرا تابوت اے عزیزو
کہ قتل مجھکو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

فرماتے تھے ہمارا رنگین تھا۔ مشاعرہ میں طرح ہوئی۔ ہم نے بھی غزل لکھی تھی:۔

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائینگے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائینگے پر جائینگے

لیکے جب زیرِ زمیں ہم دیدۂ تر جائینگے
خشک ہیں جتنے کنوئیں پانی سے سب بھر جائینگے

ابر رحمت ہے مجھے اسد مم لگادے تو جھڑی
کتنے میں جانکو وہ دیکھیں تو کیونکر جائینگے

ف نالۂ دل مرے سو بار شرربار ہوئے
پر جو سرگرم شرارت تھے نہ فی النار ہوئے

پیشوائی کو بڑھے گر کششِ دل آگے — دوڑے مجنوں کی طرف ناقۂ محمل آگے
جاتے اس طرح سے اُس کوچہ میں ہیں دل او ہم — دل سے ہم آگے کبھی ہم سے کبھی دل آگے
گرچہ ہے وادیِ عنقا سے پرے سو قاف — لیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے
تجھ سا ناقص ہی غنیمت ہے اب اس وقت میں ذوق — کاملیت ہے کہاں ہو چکے کامل آگے

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے — جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے
فردوس میں ذکر اُس لبِ شیریں کا گر آئے — پانی دہنِ چشمۂ کوثر میں بھر آئے
بتخانہ میں گر آہ کروں عشقِ صنم سے — ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے
ممکن نہیں کم ہووے تپِ سوزِ محبت — جوں شمع مجھے لاکھ پسینا اگر آئے

نعل جب شکلِ مہ نو ترے توسن کو لگے — چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے
بوسہ کے مانگتے ہی پھیرنے چتون کو لگے — ایسے کیا لعل لبِ غیرتِ گلشن کو لگے
آشیاں ہو جیو مرغان ہوا کا برباد — بند کرنے تری دیوار کے روزن کو لگے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے — بے درد اگر دل بخدا بھی ہے تو کیا ہے
آزارِ محبت کا مزہ کیا کہوں جس کی — ہے درد دوا۔ دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود — اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

گر رُخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے — ہے مثل وہ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی
فرہاد ضربِ تیشہ سے ہے سخت ضربِ غم — سچ پوچھئے تو چوٹ ہیں دونے کڑی سہی
تم دو گھڑی کو آؤ تو میں لب پہ جان کو — ٹھہرا رکھوں کہ اور بھی یہاں دو گھڑی سہی

یاں لگ چکے سب یہ دل و جان ٹھکانے
کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد

اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے
آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

مرے حسنِ عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے
اگر انسان قانع ہو تو ہے اکسیر سے بہتر

مری توبہ پہ توبہ۔ توبہ استغفار کرتی ہے
ہوا و حرص لیکن اُس کی ہمیں خوار کرتی ہے

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں وفا کے بندے
مت بھول بندگی پر غرہ میں آ کے بندے

اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے
زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائیں گے
دیکھیں تو کب تک نہیں کرتے ترے دل میں اثر

یہ بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے
ہم بھی نالے اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے

کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے
کیونکہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار

ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے
چار آنکھیں ہوئیں تجھ قوت بینائی سے

کونسے دن نگہ تیز نہ خونریز رہی ؟
آتشِ عشق تو ہے گلشنِ جنت کی ہوا

مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی
یاں مگر آتشِ دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے یا کوئی گمراہ ہے
کیا بشر مانندِ یوسف کیا بشر ہاروت وار

اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یا اللہ ہے
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیرِ چاہ ہے

لہ مری طاعت

لہ غنی ہو دے دو عالم سے

رنگین کی غزل ہے۔ والد مرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے۔ ۳ شعر ہی یاد تھے۔

گزرد ہے کھونا دل مضطر سے کسی کے
پائی تو بلا وار کے سر پر سے کسی کے

دل ہیں میں ٹپا اُسکے کہ جوبن میں نہ آیا
جادو سے نہ ٹونے سے نہ منتر سے کسی کے

اللہ کرے یاں نہیں پیوند زمیں کا
جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

جو دل بہ کشمکش طرّہ دوتا میں پڑے
تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

ہوائے سایۂ طوبےٰ نہیں ہے مستوں کو
رہیں گے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے

بتوں کے دزدِ نظر سے دل مرا نالاں
یہ چور وہ ہیں کہ جو جا نہ خدا میں پڑے

ایک کلک آہ بس ہے شرحِ غم کے واسطے
کون نیزے واسطی ڈھونڈے قلم کے واسطے

سر تو ہے تن پہ مرے تیغِ ستم کے واسطے
پرا [illegible] رکھتے ہیں وہ جھوٹی قسم کے واسطے

تم بیٹھے بغل میں جو رقیب بغلی کی
کی گرم بغل ہمنے بھی گور بغلی کی

اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت
کیا کام تبرّہ کو محبت میں علیؓ کی

مقابل اُس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

وہ دم نہیں کھینچتا ہوں میں آہِ آتشیں اے ذوق
کہ برق دیکھے تو فی النار والسقر ہو جائے

اسیری پہ ترس کھاتا ہوں نے قمری رنگین سے
جُدا تن سے ہوئی گردن نہ اترا طوق گردن سے

مجھے گہوارہ بھی تھا کشتی طوفاں زدہ آسا
رہا جوں طفل شک آفت رسیدہ میں تو بچپن سے

ف ہمارے سینہ میں دم آہ آتشیں ہے ذوق

رہی اس طرح بعد از مرگ دنیا کی ہوسناکی ‏‏ ‏‏ شرابی کرکے توبہ جس طرح ہو جاوے تریاکی

راتوں کو نہ ہو حق کرا اے شیخ منا جاتی ‏‏ ‏‏ سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

کیا ہم سخنی کرتا ہے اُس گُل کے دہن سے ‏‏ ‏‏ غنچہ سے یہ کہدو کہ چٹخ جاوے چمن سے

قطرہ قطرہ آنسو جس کے طوفاں شدت ہے
ٹکڑے ٹکڑے دل جو پڑا ہے تودہ تودہ حسرت ہے

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بُتِ گمراہ ہی چاہے ‏‏ ‏‏ ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

کل کے جو وصل کے عالم میں نظر میں پھرتے ‏‏ ‏‏ آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم نہ ہوں گے ‏‏ ‏‏ ہم ہونگے وہ نہ ہونگے ۔ وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

جنوں کے دستِ مبارک ہیں پیرہن کو لگے ‏‏ ‏‏ رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

لاشہ کو دفن کیجیے میرے کہ پھینکدیجیے ‏‏ ‏‏ مردہ بدستِ زندہ جو چاہیے سو کیجیے

معلوم ہوا بینی و ابروے بتاں سے ‏‏ ‏‏ اک تیر ہے گویا کہ چڑھا ہے دو کماں سے

عزیز و ناقۂ لیلیٰ کے دیکھو گے خستر غمزے
اگر ملی جایگی مجنوں کو خدمت سار بانی کی

کہاں ہم ۔ اور کہاں غم ہیکشو نکو غم سے کیا نسبت
مگر اے حضرتِ دل آپ نے یہ مہربانی کی

یہ دو شعر سب سے اخیر کا کلام ہے ۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہا ۔ حافظ ویران سنے کئی دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اس محاورے کو کیونکر باندھیں ۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ۔ بیماری کا دوسرا یا تیسرا دن تھا ۔ فرمایا ۔ حافظ تم نے اُس دن کیا کہا تھا؟ پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھ سے کہا لکھ لو یادداشت میں ہے

رہے خاطر نہ بے شغلِ محبت کیونکہ بند اپنی
کلید قفلِ دل فریاد ہے مثلِ سپند اپنی

زمیں کیا ہے؟ فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے
ہماری خاک پر دکھلا دو رفتارِ سمند اپنی

جو دل سے اپنے دمِ آتشیں نکل جائے
فلک کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے

ستم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم
الٰہی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے

اُٹھا تا عشق کی کیوں لے لے نادان جو کھوں ہے
ابھی تو مال جو کھوں ہے پھر آگے جان جو کھوں ہے

پیش آ اکرام سے ساری کرامت ہے یہی
عادتِ بد ترک کر تو خرقِ عادت ہے یہی

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سو دے میں ال جاہ کے
طفلِ مکتب بنتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

لحد کو چاہیے یوں پیر پشت خم دیکھے
سرا کو جیسے تھکا اونٹ دہیدم دیکھے

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

وہ لعلِ شیریں کسی کے دل کی الٰہی کیا ہوگیا دوا ہے؟
کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو گیا ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے	خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے
اب ہے جا زیرِ مغیلاں ترے دیوانوں کی	مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی
لعنت کانشہ جب کوئی مرجائے تو جائے	یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے
رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے	بہہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے
کوئی جو اُس کو پڑھ کر عاشق کا خط سُنائے	اک حرفِ مدعا پر سو بے نقط سُنائے
لاشے کے ساتھ بھی نہ مری قبر تک چلے	ہوتے ہی اذنِ عام کے گھر کو کھسک چلے
نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے اک دم ٹھہرتی ہے	ترے بیمارِ غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

ناخن سے منقار کی میرے داغ جنوں کو زاغ کھجائے
عشق یہ تیری فطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

چاہیے زرانِ بتانِ سیم تن کے واسطے	یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے
پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پہ پیمانہ ہے	ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے	ناامیدی سے مگر آرام کی اُمید ہے
اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے	لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے
باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی	کالا کرے گا مُنھ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی
عیاں ہے اشک کی گرمی ہویدا شورشِ دل ہے	کہ آتا اپنا اشک سوختہ مانندِ فلفل ہے
دردِ دل سے لوٹتا ہوں میرا کس کو درد ہے	میں ہوں لفظِ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے
دل گرفتار ہوا یار کی عیاری سے	ہم گرفتار ہوے دل کی گرفتاری سے
جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یوں ہی سہی	آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یوں ہی سہی

جس در پہ یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقل سحر اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

رازِ درونِ خم سے کسے اس پردہ میں آگاہی ہے
یوں تو ہر اک زعم میں اپنے افلاطونِ الٰہی ہے

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سُن سُن اپنے
کرکے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن[۱] اپنے

بیمارِ غم جو اُس کا کھا کر زمین دیکھے
خوش خوش وہ مقبرہ کی جا کر زمین دیکھے

کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے
ملتی اس پر کفِ افسوس ہے مقراض کہ ہائے

وحشت اگر تبنگ کو ہووے گی داغ سے
زنجیر گھنگرو کے ڈالیں گے دو چراغ سے

تری عمرِ دو روزہ غافل ایک پتلی ہے دو کل کی
کہ اک کل روزِ آخر کی ہے اک کل روزِ اول کی

دکھانے کو نہیں ہم مضطرب حالت ہی ایسی ہے
مثل ہے رو رہے ہو کیوں کہا صورت ہی ایسی ہے

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی
پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی

جو تیرے ناخنِ پا تیرا اُٹھ دھو کے پی جاوے
تو اُس کے دست و پا پھر ماہِ کامل ہو کے پی جاوے

جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے
یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

[۱] کتبِ تصوف میں لکھا ہے کہ جب انسان کو بہت ہنسی آئے تو ناخنوں کو دیکھنے لگے ہنسی تھم جاے گی سبب اس کا یہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ بہشت سے نکلے تھے تو ان کا جسم مبارک ایسا نعاف اور روشن تھا جیسے ناخن - دنیا میں آکر بدلنا شروع ہوا اور اولاد کا رنگ بدلتے بدلتے ایسا ہو گیا کہ ظاہر ہے - جب انسان ناخنوں کو دیکھتا ہے تو روحانی آگاہی سے دل متنبہ ہوتا ہے اور افسوس میں ہنسی جاتی رہتی ہے - ۱۲ - اُستاد رحمۃ اللہ علیہ

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی	ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی
مصروف چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے	مرہمیں سی لگ رہی ہیں زخم جگر کو میرے
مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی	جو کچھ کہ تھی مُراد محبت میں مل گئی
بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے	ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے
لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے	میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے
کیا تاب دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے	دوزخ بھی ہو تو اُن کی چلموں پہ آگ رکھے
کرے کعبہ میں کیا جو سرِ بتخانہ سے آگہ ہے	یہاں تو کوئی صورت بھی نہیں اللہ ہی اللہ ہے
ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے	بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پاے مردی سے
جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے	کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے
خاک اُڑاتا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے	پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے
جہاں دنیا میں دیکھا سچ کے اوپر جھوٹ فائق ہے	کہ پہلے صبح کاذب ہے تو پیچھے صبح صادق ہے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے - فرمایا قلعہ سے آتا ہوں - مرزا شاہرخ[1] آج کہنے لگے بھئی استاد میں نے مولوی صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سنایا تھا - اُنھوں نے کہا "شنود نہیں "شنید" چاہیئے - اسی وقت مجھے شعر یاد آیا - میں نے کہا مولوی صاحب سے تعجب ہے کہ ایسا کہا ہو ؎

گر عشق نبودے و غم عشق نہ بودے	چندیں سخن نغز کہ گفتے و شنودے

مطلع مرقوم الذیل میں خدا جانے بادشاہ کو کیا پسند آ گیا تھا - استاد فرماتے تھے کئی دفعہ حضور نے اس کے مضمون کو ہیر پھیر کر کے لینا چاہا - ہم نے ہر دفع اپنے مطلع کا پہلو بچا دیا - یہ بھی اتفاق ہے کہ استاد نے ایسا کیا ورنہ اُن کا یہ طریقہ نہ تھا - میں نے ایک دفعہ سبب بھی پوچھا - فرمایا خدا جانے جب ہوا یونہی ایسا ہی خیال ہو گیا -

کیا کہوں اُس ابروئے پیوستہ کے دل بستہ ہے	ایک طعنہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالم شباب تھا - ایک بزرگ کہن سال نے کسی پرانے شاعر کا مطلع سنایا ؎

آبلے دکھلائے جب اس اِل رنجور نے	دانتوں میں تنکا لیا خوشۂ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اُسی وقت یہ مطلع ہوا ؎

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے	خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

اُس زمانے کے لوگ بڑے باانصاف ہوتے تھے سُنکر بہت تعریف کی -

قطعہ

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر	کہ تھی اُس اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر	مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تپ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم	اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

[1] مرزا شاہرخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہد وقت سے چھوٹے تھے - وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے - اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے +

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر
سو بھی آ کر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

اس شعر پر خاتمہ اُن کا اور اُن کی شاعری کا ہو گیا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

۱۸۳۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی نام ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں مر گیا۔ حسین بھی تھا اور بادشاہ کو بھی اُس سے محبت تھی۔ رنج ہوا۔ اور ایسا ہوا کہ کئی ہفتے تک شعروں میں ٹلتا رہا۔ انہی دنوں میں اُستاد مرحوم ایک دن قلعہ سے پھرتے ہوئے والد مرحوم کے پاس آئے۔ مجھے یاد ہے اول بادشاہ کے ملالِ طبع کا حال بیان کیا۔ پھر ایک مطلع سنایا۔ کہ اُسی وقت غزل درست کر کے آئے تھے۔

گل کچھ تو اُس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کُملا کے جھڑ پڑے

پھر کہا ردیف مناسب مقام نہیں۔ اور ذرا سوچ کر آپ نے مطلع پڑھا اور خود کتاب یادداشت میں لکھ دیا۔

گُل بھلا کچھ تو بہار اے صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یا اللہ۔ کیا وقت تھے اور کیا کیا موقعے پیش آتے تھے۔ پھر فرمایا حضور کا ایک قطعہ بھی ابھی درست کر کے آیا ہوں۔

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسبِ حال
دیکھے تماشے میں نے جو ملکِ وجود کے

اک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے
پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے

اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
رہا وہ خدمت مُرشد کی قید میں برسوں
گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر
جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اُس کو
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
جو ہوشیار رہے تو ہے وہ شرع کا پابند
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ

تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہوا پیوست
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالا دست
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجے شکست
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے ست
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
گیا زباں سے نکل اُسکی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کہ ام شد آزاد
بریدہ زہمہ - باخدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوہ گلہائے رنگا رنگ ہم
آخرش ہو گا دہی اکدن خزاں کے ہاتھ سے
ہے غنیمت کوئی دم نظارہ رنگ بہار
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت

مثل نرگس جب تلک ہے اس چمن میں چشم وا
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
پھر کہاں یہ گلشن اور گل - اور سبزہ یہ ہوا
ایں تماشائے جہاں امفت می بینیم ما

رُباعیات

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا - ہوا کرم سے تیرے
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہو گا ترے کرم سے ہو گا

اعلیٰ جو علیؑ کی ہے امامت کا مقام
جو لوگ صفِ اولِ میثاق میں تھے
رکھتے ہیں خبر اُس سے یہاں خاص نہ عام
پوچھے کوئی اُن سے کہ وہ کیسا تھا امام

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے

سوا ظلمت کے پردے سے نکالے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

عوض کس بادہ نوشی کے تجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مری سینہ زنی کا شور سن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

اٹھایا گاہ اور گہ سب بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے

کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ
بہت الماس کے توڑے نگینے

نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جاں کنی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوع صبح سے منہ روشنی نے

کہا جی نے مجھے یہ حسرت
نہیں ہے صبح تک دیں گی نہ جینے

گلے پانی ہوا نے منہ میں آنسو
پہنچایا ہیں سر زانو بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب خانہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی
اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

موذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق
کہ تو اکھڑ کے اُدھر سے اِدھر ہوا پیوست

گزرتی ہوگی بآرام زندگی تیری
کہ تجھکو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست

کہا یہ اُس نے کہ قید حیات میں انساں
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست

اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ با فراغ کرے کنج عافیت میں نشست

ان آنکھوں سے روئے لالہ گوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوق
اور پھر ان کو پُر اشکِ خوں بھی دیکھا
یوں بھی دیکھا جہاں میں دوں بھی دیکھا

دُنیا کے الم ذوق اُٹھا جائیں گے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے
اب جائیں گے اوروں کو رُلا جائیں گے

دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت و سیاہ
بد اصل کو کیا نام خدا کوئی بتائے
وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بندوق کا طوطا نہ کہے حق اللہ

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا
ہم پیروِ عشق و عشق اپنا ہادی
اس وحشیِ رم دیدہ کو کیسا رمنا
جو عشق کہے ذوق کہو سلّمنا

کھلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں
کہیے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے
ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں
کل حزب بما لدیھم فرحون

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑا کروں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے
غصہ سے کروں کس لیے دل کو خوں میں
تم ہو تم ہو - جو کچھ کہ ہوں میں - ہوں میں

سبطین نبی یعنی حسنؑ اور حسینؑ
زہرا و علیؑ کے دونوں وہ نور العین
عینک ہے تماشائے دو عالم کے لیے
اے ذوق لگا آنکھوں سے انکے نعلین

دل کو سرِ بازارِ جہاں کر نہ اُچاٹ
جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ حصے
سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے
سب کہتے تھے اُن کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون۔ ایسے تیسے

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اِک دم نہ ترا صرفِ مناجات ہوا
جب تک تھا جوان تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا۔ پیرِ خرابات ہوا

آنکھ اُس کی نشہ میں جب گلابی ہو جائے
صوفی اُسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ روئے کتابی اے ذوق
سب مدرسہ کافرِ کتابی ہو جائے

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل
اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہل ہل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے
اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کل کل

اے ذوق فرشتے ہیں یہ کہکر روتے
اے کاش کہ انسان ہی ہم بھی ہوتے
غفلت میں یہ رہتا ہے یہاں تک ہشیار
شیطان کے چلا دیتا ہے سوتے سوتے

دل سے میں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام
میں حضوری میں ہوں اس کی نہ کس طرح مدام

دل کہو۔جان کہو۔جانیں ہیں اس بات کو سب
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

یک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازع تھا۔ اُستاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کروا دی۔ اور اس قطعہ سے اس کی بھی دلجوئی فرمائی۔گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھکو ملامت تو نہ کر
بسکہ مجھکو عشقبازی کا ہے شوق

کس طرح میں عشق سے بیزار ہوں
کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا لکھکر زرنگار کاغذ پہ لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھکر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔

خوش ہوا ے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے
رُک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

رُباعی[1] مرقومۂ حاشیہ میں نے ایک دن اُستاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے۔ فرمایا کاٹ دو۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے۔ فرمایا رُباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں۔

دُنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے — جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑیگا اس پیرہ زال کو — یہ پیرہ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جنکو اس وقت میں اسلام کا دعوے ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُنکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق — ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے — کیوں بُرا کہنے سے تو اس کو بُرا مانتا ہے

قدم سنبھال کے رکھ راہِ عشق میں اے ذوق — گزرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلۂ پا ہے مور بھی ہے یہاں — ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

نذر دیں نفس کس کو دنیا دار — واہ کیا تیری کارسازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق — مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

[1] رباعی مرقومہ ذیل دیوانِ مروج و مطبوعہ میں مؤلفوں کی بےخبری سے درج ہو گئی تھی۔ الحمد للہ کہ جو اس میں اصلاح ہوئی۔ بندہ آزاد کو یاد تھی۔ ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کیا ترک — دنیا ہے بڑی بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دُنیا — جب تک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعوٰے ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنہیں ملا۔ اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے ادا شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ۔ اور یہ قطعہ لکھکر حضور میں گزرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غُلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مُدعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مثنوی

نواب حامد علی خاں مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک شوقیہ خط کی استاد مرحوم نے فرمائش کی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لیے کب فرصت دیتی تھیں

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تاب گرانباری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرہ کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع کو دیکھکر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے تو دیکھو!۔ انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھدو اور کہا۔ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی۔ حضور دیکھا۔ عرض بیٹھ گئے اور عرض کیا:۔

اے جواں بخت مُبارک ترے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا
تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے مُنور سہرا
وہ کہے صلِ علیٰ۔ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھے مُکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مُرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا
اِک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھُولوں کا معطر سہرا
سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پہ سہرا
رونمائی میں تجھے دیں مہ و خورشید فلک
کھولدے مُنھ کو جو تو مُنھ سے اُٹھا کر سہرا

ہے فلک اک نمونہ قدرت کا　　یا قلمداں ہزار صنعت کا
رخِ قرطاس کو صفائی دی　　اور سیاہی کو روشنائی دی
دیا قمری کو مصرعِ نالہ　　مصرعِ قدِ سروِ پر بالا
کی نو خطوں کو کلکِ ادا　　کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا
نمک افشاں ہے عشقِ شور انگیز　　زخمِ دل کرتے ہیں بریز بریز
عکس ہے سبزۂ لبِ جو کا　　وسمہ قوسِ قزح کے ابرو کا
آئے گلشن میں فصلِ گل سو بار　　بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار
ساقیا جلد اٹھ درنگ نہ کر　　عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اتارے شیشہ　　طاق پر رکھ کتاب اندیشہ
شیشۂ مے کی یہ دراز زباں　　اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں
میں ہوں مانندِ ساغرِ لب ریز　　جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز
جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے　　پاؤں توبہ کے لڑکھڑانے لگے
ق
کردے یاں تک مجھے نشہ میں چور　　تاکہ مانندِ خوشۂ انگور
دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں　　نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں
شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی　　نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
بسترِ رنج و کنجِ تنہائی　　رات کیا آئی اک بلا آئی
شام سے حال ہے یہ صبح تلک　　نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بولتے فلک کے طیور　　کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
گر لکھوں خط میں بیقراریِ دل　　نامہ بر ہو کبوترِ بسمل
مضطرب اب جو ہوگیا دل ہے　　دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے
دل کی وا شد کی کیا کروں تدبیر　　غنچۂ دل ہے غنچۂ تصویر
جانِ بیتاب جیسی بیکل برق　　وہ بھی گرمِ رہِ فنا کالبرق

مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں رمضان آگیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا۔ انہوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کر دیا۔ اور کئی دن میں ۰۰ ۳ شعر ہو گئے۔ لیکن ادھر رمضان ہو چکا ادھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کر دیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اُٹھی مگر ایک دن کبھی دو دن ۲۰-۲۵ شعر ہوئے۔ پھر رہ گئے۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا۔ تو اکثر اس کا ذکر کیا کرتے اور کہیں کہیں کے شعر بھی پڑھا کرتے۔ میرے بار بار کہنے سے اُسے نکالا تو دیکھا کہ ۲ تختیاں مشق اطفال کی تھیں۔ دونوں طرف سے سیاہ تھیں۔ اور کچھ کاغذی مسودے تھے۔ تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی نہ جاتی تھیں۔ فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچکر بتاتے گئے۔ میں لکھتا گیا۔ ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ نامہ ناتمام تھا۔ مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا۔ میرے دامن کے ہوئے ہیرے بھی اُنہی غزلوں میں تھے جو خلیفہ صاحب کے ہاں جا کر صاف کیا کرتا تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی گئے اس کا نام "نامۂ جاں سوز" تھا۔ اول حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ۔ پھر القاب معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا۔ اس کے بعد یاد ایام وصل۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ معنوں کی نزاکت۔ لفظوں کی لطافت۔ ترکیبوں کی خوبیاں۔ اندازوں کی شوخیاں۔ کیا کہوں۔ سامری کا جادو اس کے آگے دھواں ہو کر اُڑتا تھا۔ چند متفرق شعر دیوان مطبوعہ میں ہیں۔ چند شعر مجھے یاد تھے یکجا لکھ دیتا ہوں کہ جو یادگار رہ جاوے وہی غنیمت ہے۔

مثنوی

زینت نامہ زیب سرنامہ	چاہیئے نام اُسی کا اے خامہ

قصیدہ نمبر (۱)

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے:۔

سحر جو گھر میں ۔ بشکل آئینہ ۔ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ ۔ حور طلعت ۔ بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت ۔ چمن کی رنگت ۔ گر اس کا شیوہ ۔ تو اس کا جلوہ
زبان شیریں ۔ بیان رنگیں ۔ کلام رنداں ۔ خرام مستاں
انیس خلوۃ ۔ جلیس جلوۃ ۔ حریف حکمت ۔ ظریف صحبت
بہ بزم یاراں ۔ بدل بہاراں ۔ با اہل عزلت ۔ کلے بداماں
حسیں بشکل و مہ منور ۔ عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو ۔ نگاہ جادو ۔ خدنگ مژگان و چشم فتاں
بروے رنگیں ۔ نگار بستاں ۔ شگوفہ خنداں ۔ کرنہ خنداں
ہوسے پیچاں ۔ بے عشق پیچاں ۔ جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب کج کلاہی ۔ جو دیکھو بینی تو یا الٰہی
دہن میں غنچہ ۔ لبوں میں گل برگ و روے روشن پہ مہر تاباں
نگاہ ساغر کش تماشا ۔ بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو ۔ وہ گوری ساعد ۔ وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں
کمر نزاکت سے لچکی جائے ۔ کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
دو زانو اس پہ سو نور لہر کھائے ۔ پھر اس پہ ہیں وہ قمر فروزاں
وہ ران روشن ۔ وہ ساق سیمیں ۔ وہ پاے نازک حنائے رنگیں
وہ قد قیامت ۔ وہ فتنہ قامت ۔ دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا ۔ کہا خوشی ہوں ۔ جو وصف پوچھا ۔ تو دلبری ہوں

نبضیں چھوٹی ہوئی غشی طاری ‖ ایک فرقت ہزار بیماری

دل سے رخصت ہے تاب طاقت کی ‖ بیقراری نے استقامت کی

ہوس سیر باغ ہے کس کو ‖ دل ہے کس کو دماغ ہے کس کو

کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر ‖ سگ دیوانہ بن گیا ہے گھر

اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت ‖ تن بہ تقدیر سنگ آمد و سخت

ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر ‖ رہویں دریا میں اور مگر سے بیر

ماہ بے مہر ملکہ دشمن مہر ‖ ہر ستم میں ستم شریک سپہر

برق کا وہ ذرا چمک جانا ‖ اور بغل میں ترا دبک جانا

فتنہ استاد نرگس فتاں ‖ گرد مژگاں ہجوم شاگرداں

رخ تعالی و زلف صل علی ‖ قدوہ سبحان ربی الاعلیٰ

زلف جنباں میں رخ کی مُتراقی ‖ کرے مشاطیوں کو اشراقی

لو انا ربکم نہ منھ سے کہے ‖ لیک جاری زبان ہر موے

مچھلی بازو کی یا ہے دو الصفین ‖ غرقہ کش بحر خوں سے مردم عین

کمر و ناف از پئے دل زار ‖ رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

رنگ پاں لعل روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر

ت زلف و رخسارہ وہ کہ صل علی

تری سخاوت کا ہُن کے عالم - اُمنڈ پڑا ہے تمام عالم
عرب سے آیا ہے چل کے حاتم - بلب سوال و بدست داماں
جو آئیں جنبش میں لعل شیریں - چمک ہو اُن کی کلام رنگیں
جو حکم دیوے تو ہوویں آئیں - تو ہنس کے بولے تو گُل ہو خنداں
جو ہو سوار سمندِ تازی - کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دور فلک کو بازی - بپائے گوے و بدست چوگاں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
وہ تیرا ہے فیلِ کوہ پیکر - کہ جس پہ کہتے ہیں سب نظر کر
فلک پہ دُمدار ہیں دو اختر - و یا نمایاں ہیں اس کے دنداں
(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)
ترا جو وصفِ خجستہ شاہانے - قلم کو کہاں ہے یارا ؟
ثنا دعا پہ ہے ختم کرتا - جو ذوقؔ تیرا ہے تہنیت خواں
کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں - حسود ہوں سرنگون و محزوں
یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں - سدا ہمہ فر و شوکت و شاں

قصیدہ نمبر ۲

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے - افسوس کہ نظرِ ثانی سے نور نہ پایا - ورنہ عجب جلوہ دکھاتا - اکثر شعر اس کے زبانی سُنا کرتے تھے - دل روشن ہو جاتے تھے - کئی شعر مسودہ موجودہ میں نہ تھے - بندہ آزاد کو اُن کی زبانی سُنے ہوئے یاد تھے وہ بھی درج کئے ہیں -

صبح سعادت نویدِ ارادت تن بہ ریاضت دل بہ تمنا
جلوۂ قدرت عالمِ وحدت چشم بصیرت محوِ تماشا

سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا۔ کہ ذوق تو بھی عجب ہے نادان
وہ شاہ جو ہے۔ محمد اکبر۔ جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوس جشن اس کا آج ہے فلک پر۔ اُسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں
یہ سنتے ہی میں نے باعنایت۔ لکھا وہ مطلع شفق شتابا بہت
کہ جس کو سن کے سخنور۔ پڑھے یہ تحسیں ہر اک سخنداں

مطلع

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں ہے چتر بن بن کے ہوتا قرباں
کہ بنتِ اختر بصفتِ لشکر۔ ہیں آج یکسر مطیع فرماں
وہ ہے ترا اخترِ ہمایوں کہ ہو کے روشن چراغ گردوں
بام کاخ پر ہے تیرے آسا۔ بزیر فانوس چرخ گرداں
سحاب رحمت جو درفشانی کرے بہنگام حکمرانی تو
تو موج آفات سے پانی پانی۔ ہوا یہ یکدست ابر نیساں
تری عدالت میں ہے یہ قدرت۔ کتاں کو دیکھے نہ ماہِ روشن
وگرنہ ہالہ ہو طوقِ گردن۔ کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں
جو تیغِ برّاں کو تو نے بخشا۔ کرے علم تو بزور ہیبا
تو زیرِ دامانِ ابر پنہا۔ دکھاوے جلوہ نہ برق رخشاں
یہ تیرا خنجر ہے پاک شمشیر۔ کہ جس کے کھٹکے ہی دم میں اُڑ کر
قفس سے ہوتا ہے تن کے پرّاں۔ ترے مخالف کا طائرِ جاں
ہے عید قرباں میں تیری میموں۔ رکھا بزرگوں نے شتر گردوں
کہ کہہ کے گاو زمیں نہ ہیبت۔ کہیں بزیر زمیں ہو لرزاں
رکھے گا فغفور چینی خانہ۔ تو حکم دے اے شہِ زمانہ
بنا صفاہاں یہ آستانہ۔ کہ بیٹھے دارا بجائے درباں

کان ملاحت بحرِ صباحت جوئے فصاحت گلشن راحت
شورِ میں لیلےٰ نور میں سلمےٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لبِ میگوں عارضِ گلگوں وہ قدِ موزوں چشمِ پُر افسوں
برگِ گلِ تر لالہ احمر سرو صنوبر نرگسِ شہلا
خال بلب ہے۔ نقطۂ مشکیں۔ یا ہے ہلال و چشمۂ شیریں
مردمِ دیدہ محو بدیدہ لالہ بہ داغ و دل بہ سویدا
فوجِ نظارہ جوں رمِ آہو۔ آہوئے کعبہ نرگسِ جادو
چیں بہ جبیں محراب بہ کعبہ۔ طاق دو ابرو مسجدِ اقصےٰ
چاہ زنخداں آبِ زلال۔ اور اس پہ تکلم چشمۂ شیریں
ناصیہ روشن یوں کف موئے زلف شکن در خطِ چلیپا
پان کی سرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوسِ قزح سے
دام برائے گردن عنقا چشمہ و چیر اغ دیدۂ حورا
بیت زلالی لب بہ تکلم۔ فردِ خیالی رنگِ تبسم
موئے میاں جوں معنیِ نازک تنگ دہاں سرابیہ معما
عارضِ گلگوں چشم پُر افسوں سبزہ بہ ستہ طرز نظر سے
پایۂ نازو۔ غمزہ طرازو۔ گلشن رازو۔ رازِ بدلہا
فتنہ سراپا۔ نشتر سراسر۔ شستہ و فا میں پست جفا میں
شرم سے ڈوبا نیم حیا میں۔ ناصیہ روئے عالم بالا
رمز سے ہو کر صرف تکلم۔ ناز سے ہو کر لب بہ تبسم
مجھ سے کہا ہو زمزمہ پیرا۔ تو بھی تو بول اے بلبل شیدا
میں نے پڑھا اک مطلع روشن مدح میں تیرے جس سے ہو گلشن
روح معزّے اسے شہِ عالم غش ہیجمبر اور شاد ہو اشفا

قصرِ رفیع و صحنِ وسیع و طرزِ صحیح سطحِ مربع
باغِ ارم یا روضۂ رضواں خلدِ بریں یا جنتِ ماوے
مرغِ خوش الحاں بہ سرِ بستاں ہر گلِ بستاں خرم و خنداں
گوشِ شقائق محوِ سرود و دیدۂ نرگس مستِ تماشا
لحنِ قماری شکلِ مسبّح صوتِ عنادل وردِ مہلّل
سروِ بقامت نخلِ دعا و نکہتِ گل یا دم بہ مسیحا
فصلِ ربیع و موسمِ اردی معتدل اک جا گرمی و سردی
میل عناصر سوئے طبائع ربط قوئے با عالمِ اشیا
چہرہ گلشن آتش رخشاں سرخیِ گل میں لعلِ بدخشاں
سبزہ بہ شبنم رشکِ جواہر لالہ بہ ژالہ لولوئے لالا
قلب کو فرحت روح کو راحت عقل کو قوت طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمۂ مطرب نالۂ چنگ و نشہ بہ صہبا
خندۂ گل پر نشۂ مُل پر، سیرِ چمن پر، لطفِ سخن پر
نغمۂ بلبل نالۂ صلصل قہقہۂ قلقل بر لبِ مینا
غلغلہ اندر محفلِ مستاں، وجد میں خیلِ بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں باربد آسا چنگ نوازاں شکلِ نکیسا
جامِ بلوریں یا مے لعلیں صبحِ بہار و گلشنِ رنگیں
پنبۂ مینا بہ سرِ مینا اخترِ صبح و گنبدِ خضرا
ساقیِ مہوش مستِ شبانہ مطربِ دلکش صرفِ ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسم وقتِ سعید انوار سراپا
آں بتِ ترسا یا دلِ سنگیں نسبت کافر با ہمہ تمکیں
صورتِ لات و شکلِ منات و رشکِ یعوق و غیرتِ عزّے

رو بہ رضا دل بہ دعا و دست بہ ہمت پا بہ اقامت
لب بہ ہدایت دل بہ درایت صرف بہ زہد و محو بہ تقوے
تو بہ حقیقت تو بہ طریقت تو بہ شریعت تو بہ ودیعت
پاک سرشت و نیک نوشت و سینہ مطہر قلب مصفیٰ
رو بہ تجمل خو بہ تحمل کف بہ تکلف لب بہ تکلم
بہ دکشش یوسف ہمسر صالح ہمرہ موسے ہمدم عیسےٰ
تیری محافظ آیۂ کرسی - تیری معاون آیت شوریٰ
زیب تمایم سورۂ یٰسین حسن عزائم سورۂ طٰہٰ
جانب اعدا تو سر میداں کھینچ لے جب دم صارم بُراں
نعرہ ہو اس کا قتل قتل - ندیہ اس کا نحن قتلنا
جلوہ سے تیرے ہو نہ منور شام و سحر آفاق تو کیونکر
نہ ہو دوائے دیدۂ شپر مہر ضیا سے حیرت حربا
تو دم فرحت تو دم عشرت تو دم دولت بر سر دولت
ماہ نبرطاس نہ ہو میزاں تیر بہ قوس و شمس بہ جوزا
فہم ترا وہ عقل ارسطو بالعرض جس سے جوہر ثانی
عقل ترا دے درس فلاطوں فلسفہ جس کی ابجد اولی
حال دو عالم تجھ میں ہے پیدا - اور ہے یہ نور کشف ہویدا
غیر قیافہ غیر سر وہ غیر تفاؤل غیر بہ رویا
تیری شمیم خلق سے طاری - تیری نسیم طبع سے جاری
باد بہاری مشک تتاری - عود قماری عنبر سارا
فکر فرنگ و دانش یوناں آگے ترے ہے طفل دبستاں
تو ہے وہ ماہر - تو ہے وہ باہر - تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا

اے شہِ عالم در ہمہ عالم۔ عالیِ اعلےٰ والیِ والا
لب بہ ستائش۔ دل بہ نیائش جلوہ طراز عرشِ معلّےٰ
نفس خلافت از رہ رتبت تخت خلافت عرش بہ عظمت
تو ہے بحکم وجہ جو صورت وہ ہے بہ نفسِ رتبہ ہیولےٰ
روح مجسّم عقل مکرم نفس مقدس جسم مطہر
باطن صافی جان ہوائی پردہ بہ دنیا جلوہ بہ عقبےٰ
علم حقیقی علم مجازی تیرے حلولِ ساری و طاری
اصل مبانی نقل معانی عقل کو تیرے عیش مہیا
سارے پڑھتے اسمائے الٰہی سب ہیں مؤثر اے شہ اکبر
اسم جو اعظم ہے تو وہی ہے جس سے ہے تیرا اسم مسمّیٰ
نہم ہیں لیکر صافی طینت رکھ کے نظر میں اوج قرینت
عرق حیا ہیں زمزم وکوثر سر بہ زمیں ہیں سدرہ و طوبےٰ
خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقا و خاک شفا و نار خلیل و بادِ مسیحا
تو سر دنیا ظلِّ الٰہی حکم ترا تا ماہ بہ ماہی
تخت ہے تیرا تا بہ ثریٰ۔ اور فوق ہے تیرا تا بہ ثریا
حکم بہ حاضر نظم بہ ناظر۔ تیرے جلوس جشن کی خاطر
فوج سکندر لشکرِ دارا۔ تختِ فریدوں مسندِ کسریٰ
تجھ سے ہی قائم شام و سحر ہے۔ تجھ سے ہی دائم تازہ و تر ہے
بارِ مراد و برگِ نشاط و شاخِ امید و نخلِ تمنا ؁
تو بہ ریاست تو بہ فراست۔ تو بہ مقالت تو بہ سیاست
فطرت لحیاں فکرِ جماعت حسنِ بیاض و غصہ حمرا

پیش نظر ہے دور کا عالم سُن تو سہی افلاک پہ ہے کیا
وردِ ملائک نامِ خدا ہے دیکھ زباں پر کس کی ثنا ہے
دل کہ سراپا دستِ دعا ہے۔ دستِ دعاؤ دامنِ شبہا
تاکہ زماں منضم بہ زمیں ہو۔ دور میں چترِ چرخ بریں ہو
شاہ کا عالم زیرِ نگیں ہو۔ سطحِ زمیں ہو عالمِ بالا

قصیدہ نمبر ۳

ایک شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔ افسوس کہ نظرِ ثانی سے محروم رہا۔ آغازِ جوانی کا کلام ہے

خضرِ نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو — اور شاہ راہِ دل پر چشمِ ہنروری ہو
منظورِ ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں — روشن قلم سے میرے تاجِ سکندری ہو
ذرہ کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا — اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو
میں رستمِ معانی اور سیستاں سخن ہے — دیتا جو زورِ قسمت دل کو تناوری ہو
برگشتہ بخت اپنا گر آئے راستی پر — گردوں بھی سرنگوں پھر دکھلائے اپنی سروری ہو
یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی — وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو
تجھکو خبر نہیں کیا ہے دورِ شاہ اکبر — نخوت سے پست جس کی شانِ سکندری ہو
بے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں — اور دل کا اُس کے مقصد خود بندہ پروری ہو
مثلِ حباب جاکر باندھے ہوا افلاک پر — جس پر کہ اُسکی چشمِ الطاف سرسری ہو
دربار میں تو اُسکے ہو بہرہ یاب جاکر — پیروزی ہو وے میری اور تیری بہتری ہو
لیکن ہو رسائی اُس وقت ہوگی روشن — جب خضرِ راہ تیری طبعِ سخنوری ہو
تو ہی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا — اُس کے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو
اُس کی نظر چہ حیں گریہ تابدار گوہر — پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو
تب بحرِ فکر میں دل غواص ہوکے اترا — معلوم تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو

تیغ ہے تیری پیکرِ دشمن ۔ حلقہ بہ حلقہ جب ہو بہ جوشن
ہمیش حکیماں کب ہے ثابت ۔ عقل ستے جزوِ لایتجزّیٰ
زینت لوح شوکت و شاں تو زیب سر توقیع جہاں تو
اس پہ مزین جوں گُل طغرے ۔ اس پہ تجمل جوں خط امضا
حاتمِ دوراں منذر نعماں رستم دستاں شیر نیستاں
تو بہ سخاوت تو بہ عنایت تو دم جرأت تو سرِ ہیجا
حسن ادائیں نکتہ موزوں ۔ طرز بجائیں ۔ گوہر مکنوں
شغل و عمل میں نظم مسجع ۔ حرف سخن میں نثر مقفےٰ
تیرا ہے توسن سایہ ذوالمنن ۔ بر سرجستن در دمِ رفتن
برق جہان و آب روان و شعلہ آتش موجہ دریا
باد بوقتِ تیز روانی ۔ ابر بوقتِ قطرہ فشانی
جب تو اُڑا دے کوہ و جبل پر جب تو رواں ہو جانبِ صحرا

(یہاں سے دو شعر رہ گئے)

فیل ہے تیرا ابر بہاراں ۔ پر بہ خیالِ بادہ گساراں
ہودے درخشاں برق بہ باراں دے جو ہلا زنجیر مطلّا
بحر بوسعت کوہ بہ رفعت ۔ پردۂ کوہ نور بہ ظلمت
اُس پہ طلوعِ جلوۂ طلعت ۔ طور پہ گویا نور تجلےٰ
پشت پہ اُس ہودجِ زریں قوس قزح سے ستک رنگیں
تیرا طلوع اے خسرو جا اور صبح شفق میں کردے ہویدا
تھا جو سخن آغاز ثنا سے ختم سخن ہو حسنِ ادا سے
ذوق سخنداں تیری دعا سے طرز سخن موزوں ہو سراپا
دل ہے ترا یا نور کا عالم بلکہ فروغ طور کا عالم

یا روب کش ہے تیرے مشکوے خسروی کا ۔۔۔ زیبا ہے ماہ کو گر فرمان بہتری ہو

رشید نذر لائے جب افسر شعاع سے ۔۔۔ منشور افسری پر توقیع خاوری ہو

ابروے تاج بخشی جس دم کرے اشارت ۔۔۔ کشتی میں لیکے حاضر وہ افسر زری ہو

لامیں پئے سواری توسن کو جب سجا کر ۔۔۔ صورت میں ہووے تیلی پر واز میں پری ہو

چلتا ہوا ہے افسوں اڑتا ہوا چھلاوہ ۔۔۔ پھر اس سے آگے بڑھکر کیا سحر سامری ہو

یا برش قلم وہاں دکھلاے شہسواری ۔۔۔ جب توسن تصور کھاتا سکندری ہو

خاک قدم ہو اس کی۔ اہل نظر کو سوتا ۔۔۔ جو نقش سم ہے اسکا وہ مہر اکبری ہو

تو اس پہ بر سر زیں۔ جوں حل پراد بے ۔۔۔ ام الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو

کس وصف کی ہو سیڑھی ہاتھ تیرے موزوں ۔۔۔ کرتا نہیں گردوں جس کی برابری ہو

اس طرح جلوہ گر ہے تو بر سر عماری ۔۔۔ برج حمل میں جیسے خورشید خاوری ہو

یار آئینہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو ۔۔۔ اور سر پہ اس کے ٹوپی فولاد کی دھری ہو

جیسے آئینے سے تیر نگاہ گزرے ۔۔۔ یوں غرق اس میں تیری ہر تیر کی سری ہو

کیا سعد و نحس کا یاں ہووے حساب باقی ۔۔۔ جب چھائی آسماں پر فرخندہ اختری ہو

ختم ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر ۔۔۔ تو مدعا یہ اس کی گر ملتفت ذری ہو

ہو جو ترا دعا گو گلرنگ ہو وہ کھل کر ۔۔۔ بدخواہ اگر ہو خنداں صد برگ جعفری ہو

ہو سیر بخت میری گر اوج میمنت پر
رفتار بخت اعدا بر رجع قہقری ہو

قصیدہ نمبر ۴

یہ قصیدہ ایام طالب علمی کا ہے ۔ مطالب اس کے عہد مذکور پہ شاہد حال ہیں افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا ۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے :-

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام ۔۔۔ ہے پے افلاک لازم نفی خرق و التیام

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار بن کے موتی | شرمندہ جس کے آگے صد کانِ جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جس ذرہ پہ پڑی ہو
وہ آسماں پہ جا کر خورشید خاوری ہو

دیکھی ہے چین ابرو آئینہ جبیں میں | کیونکر نہ تن میں اسکے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے | گر بہر پائے بندی ایما سرسری ہو
یہ آستانِ دولت ہے سجدہ گاہ عالم | دل کو تری عقیدت اور رنگ سروری ہو
دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی | دربان جو تیرے در کا۔ کرتا سکندری ہو
سورج فلک کا تیرے اک پھول مہر انور | قربان چترِ دولت۔ نہ چترِ چنبری ہو
باغِ جہاں میں نرگس لے کیوں نہ جام زریں | جب ہر گدا کو دیتا اک ساغرِ زری ہو
دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی | شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو
کشتِ امل کو سرسبز آبِ گہر سے کر دے | ابرِ کرم کی تیری جب فیض گستری ہو
بیشہ میں معدلت کے وہ شیر ہے تو شاہا | نوشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو
شیوہ مہوسوں کا۔ ہر کرم میں تیرے | تیری گداگری ہو۔ کیوں کیمیاگری ہو
گر آفتاب تیرا ڈالے کرن کو اپنی | تاجِ گدا کا جلوہ۔ جوں تاجِ قیصری ہو
تیری ثنا میں شاہا۔ لکھتا ہوں اب یہ مطلع | جس کی چمک سے کاغذ جوں کاغذ زری ہو

پابوس نقشِ پائے تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پہ اسکو تاروں سے برتری ہو

ابرِ کرم سے تیرے کیا دور ہے کہ شاہا | کشتِ فلک میں پیدا سرسبزی و تری ہو
سورج کی جو کرن ہے۔ گردوں سے لے زمیں تک | مانندِ عشق پیچاں پھر سر بسر ہری ہو
مریخ کو فلک پر جس تیغ سے ہو ہیبت | دشمن کو بھاگ کر پھر کیا اس سے جانبری ہو
نعرہ سے تیرے ہو دے ہیبت کا چاک سینہ | دل پر دلاوری کے۔ وہ تیغ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں کون آج ہے توانا | جو دل کے ناتواں کو دیتا تونگری ہو

...کریں تا دعوئے رویت کو اہلِ اعتزال
اور ملاحدہ وسوسوں سے دیں نبی کو اتہام

...موجب تک کہ جوگی شغلِ استدراج میں
سینہ و سر میں رکھے مرغِ نفس کو اپنے تھام

...کہ سالک مسلکِ تقوے میں کرتا ہو سلوک
تا رہے مجذوب مستِ بادۂ غفلت مدام

تا جو دیاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظامِ اہلِ عالم ہووے عالم میں تمام

تا خراسان و عراق و زابل و نیمروز سے
نغمہ ریزِ فارس آباداں کرے اپنے مقام

...ہم و پنچم کھرج گندھار دھیوت اور نکھاد
نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

...ذر دی ابارد آب ایلول اودیل
ماہِ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام

یارب اس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں
دولت اس کی ہو کنیز اقبال ہووے غلام

...ن وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ
نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیکنام

...بیداری سے جس کی ہے دکھائی خود بخود
بیخ و بنیانِ ضلال و کفر شکلِ انہدام

...یا تعجب ہے اگر اس کی ہوا فیض سے
گلشنِ گیتی ہو رشکِ روضۂ دار السلام

...عالم اس کی فیض سے ہے سبلہ سبز
پائے ہے رنگِ زمرد پارہ سنگِ رخام

...کشاں سے لے عصائے نقرئی پیرِ فلک
کرتا ہے وقتِ سواری شکلِ چاؤش اہتمام

...ے شمیمِ خلق اگر اُس سے تو ہو جائے ابھی
طبلۂ عطار کی صورت معطر ہر مشام

گلشنِ مدح و ثنا سے اس کے لئے گلچینِ فکر
لاگل مضمونِ تازہ جلد بہرِ اشتمام

مختصر عرض یوں ذاتِ عالی سے ہے جمہورِ انام
حلقۂ تسبیح میں جوں سر بر آوردہ انام

مائدہ اور من و سلوی کی کسے ہے احتیاج
مطبخِ عالی سے تیرے سب کو پہنچے جب طعام

بہرہ ور خورشید سے کوہِ بدخشاں سب فقط
تیرے اجلال کی تیرے نظر عالم پہ عام

غنچۂ تصویر کو بھی مثلِ گلہائے چمن
ہے نسیمِ لطف سے تیرے ہوائے ابتسام

ق

ہے ملا دستِ خلق کے ساتھ تجھکو زورِ حکم
دستِ قسّامِ ازل سے اسکے وقتِ انقسام

فیض تیرا ہے کہ پائے خرقۂ ماہی درم
حکم تو دیوے تو ہووے زیبِ دریا تشنہ کام

تا خطِ محور پہ ہووے گرم گردش آفتاب　　تا نہ قطبین فلک تک پہنچے دو صبح و شام

سبعہ سیارہ ہوں سار تا سہ صفت آسماں　　ہو ثوابت کا سپہر ہشتمیں پر اثر دوام

منجمد ہوکر میان طبقہ ہائے زمہریر　　قطرہ افشاں تا بخارا بہ ہو بن کر غمام

آب باراں سے گزر کر نفتہ تا ہو شعاع　　انعکاس رنگ سے قوس قزح پائے نظام

تا حقیقت کے لیے لطف سخن ہووے مجاز　　صنعتیں ہوں اُس سے پیدا باِمرام و بہ مرام

تا کریں روشن معانی و بیاں سحر بدیع　　جن سے ایراد معانی ہو بہ تحسین الکلام

تا اَن و لَن کے اِذَن دیں فعل مستقبل کو نصب　　جازم فعل مضارع اِن و لَم لَمّا و لام

تا کہ علم شعر ہو داخل بہ اوزان بحور　　تا افاعیل و تفاعیل اس سے پائیں انتظام

اور زحافوں کا عمل لیکر ردیف و قافیہ　　گہ عرب کا ہے عجم میں اُن کو دے تو دل مقام

تا اطبائے زماں کو ہو شرف علم طب کے ساتھ　　غور نبض و فکر بحران فکر الوان قوام

تا حس و حکاک لازع رحوہ و ثاقب ثقیل　　صبلک مر اض مہلک کا اطبا میں ہو نام

یہاں سے چند شعر چھٹ گئے

کلیات خمسہ ہوں منطق میں ایسا عو جیا　　یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرض عام

مادی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ　　علت غائی پہ دیویں اہل دانش انصرام

تا ریاضی و طبیعی سے بزور فلسفہ　　فیلسوفانِ جہاں علم و عمل میں لیویں نام

تا کہ بیت سعد اکبر ہوں فلک پہ قوس و حوت　　تا کہ جوزا و حمل میں شمس کو ہو احتشام

سنبلہ کو تا منجم کہوے ہے شاید قسمہ　　تا کہ ہو دست و بغل جوزا فلک پر شادکام

حکم ہو برجیس و کیواں کا رواں ... و نیہ　　تا کہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام

تا خراساں مہر کو بہرام کو ہو ملک ترک　　ماورا النہر پہ ناہید کو تا ہو قیام

تا کرے معلوم اصطرلاب سے اختر شناس　　ارتفاع مہر ستارہ روز و شب یا صبح و شام

تا زحل کے ساتھ مشکل عقدہ انکیس کو　　زائچہ میں دیتے ہوں صاحب مل نسبت مدام

ہووے دائرہ عرصہ برزخ میں تا بحث حکیم　　ہوں نہ مذہب جبر اور تفویض میں اہل کلام

وادیِ بطحا میں جیسے بر سرِ اصحابِ فیل — معجزِ طیراً ابابیل آیا وقتِ انہزام

جنبشِ خامہ سے میرے سرد ہو برقِ جہاں — گر کروں شاہا رقم وصفِ سمندِ تیز گام

ترکتازی میں پڑی تھی اسکی شوخی پر نظر — ابلقِ چشمِ بتاں کی ہو گئی ترکی تمام

سنبزہ عیرا پہ کھائے نقطۂ رمال رشک — دیکھے نقشِ سم جو اس کا جلوہ گردِ خرام

سرعتِ طیِّ منازل کا لکھوں گر اُسکے وصف — حال و استقبال کا داخل فعلِ ماضی میں ہو نام

عرصۂ چوگاں میں جب اس کی بوقتِ معرکہ — لائے جولانی میں دیکھ جنبشِ دستِ لگام

گاہ سرپٹ گہہ اُڑان اور گاہ بیٹھا پویہ — گاہ ڈلکی ایسیہ اور گاہ جائے شاہ گام

اور اشارہ ہو اگر اس قاف سے اُس قاف پہ — اس طرح اُڑ جائے جوں مرغِ نظر بالائے بام

نیل کو تیرے شبِ یلدا تو کہتا ہے جہاں — بر جو ہے نقشِ قدم اس کا وہی ماہِ تمام

یا سیہ خیمہ ہے لیلی کا دیا ہے تسمہ گی — جانِ قیسِ تفتہ دل بنکر دھواں شکلِ غمام

حلقۂ زلفِ بتاں کب کھائے یوں پیچ و تاب — جب اُٹھا خرطوم کو اپنے کرے نہ وہ سلام

منزلِ توصیف کو کیونکر تری طے کر سکے — دم کہاں پیکِ خرد میں یہ خیال اسکا ہے خام

تہنیت کو ہے دعا پر ذوقؔ کرتا مختصر — ہو مبارک تجھکو با عیش و طرب عیدِ صیام

جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں
اور ہوا خواہوں کے دل ہو ویں ہمیشہ شادکام

قصیدہ نمبر ۵

افسوس کہ نظرِ ثانی سے محروم رہا

صبحدم فکر جو تھا سیرِ فلک کا مشتاق — عرش پر اُڑ گیا اک آن میں مانندِ براق

چمک اس برقِ جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر — افقِ طبع پہ دکھلائے فروغِ اسراق

شعلۂ رنگِ حنا کر کے اُڑا دیوے ابھی — قفسِ دل میں جو ہیں بند طیورِ اشواق

رات مجھکو یہ فلک گرد وہاں لیکے گیا — کہ عقولِ عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

دشمنِ بدبیں کو آبِ خنجر بھی زہراب ہے
اور دمِ عیسیٰ گلے میں ہے برشِ آبِ حسام

یہ ہوا خواہوں کو تیری مرحمت سے خسروا
فیضِ انفاسِ الٰہی ہیں نفوسِ انتسام

دستِ صحت سے رگِ ہر سنگِ کوہ و دشت میں
نبضِ سالم کی طرح جنبش دکھائیگی مدام

دیں مریضوں کو دمِ عیسیٰ تو یوں نکلیں وہاں
قطرۂ ریزش گریں جس طرح سے وقتِ زکام

مستفیدِ نور کب ہے شمس سے جرمِ قمر
نیّرا جلال سے تیرے جلا لیتا ہے دام

روبرو دستِ کرم کے ہوتی گردِ باد ہے
آبروئے ابرِ گوہربار اے ذوالاحترام

تو جھروکوں میں جو بیٹھے آکے بہرِ عدل و داد
شیر و آہو گھاٹ پر جھکے ہوں آپس میں رام

تا نہ آئے زخمِ عاشق کے دلِ ناکام پر
تیغِ ابروئے بتاں رکھتے ہیں دمہ سے نیام

ق

اے فریدوں تو جو کر دے راہِ خونریزی کو بند
اور لبوں سے جام کے چھلکے رحیقِ لالہ فام

شانۂ ضحاک کی مانند ایک ایک اس کی موج
مارِ پیچاں بنکے ہوئے متحد با خطِ حجام

معجز انصاف سے تیرے سرِ دشت و جبل
ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام

قصدِ صید اس کا کرے کوئی معاذاللہ اگر
ہو خدا کا قہر نازل اس پہ بہرِ انتقام

آیا جب تیرے مقابل اے نہنگِ بحرِ رزم
شکلِ خرچنگ الٹے پاؤں ہٹ گیا دستانِ سام

گنجِ استدلال پہ ہے قفل اگر تیری سپر
وقت پر شمشیر ہے مفتاحِ ابوابِ مہام

جوں عصائے حضرتِ موسیٰ سرِ دریائے نیل
نیزہ تیرا لشکرِ اعدا میں کر جاتا ہے کام

ہے خدنگِ تیر تیرا ایا ہوا پر ہے عقاب
دمبدم دے ہے قضا کا اُڑکے اعدا کو پیام

گر عدو سدِ سکندر کو کرے چار آئینہ
آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

تیرے وصفِ ناوک اندازی پہ تیر اندازِ فکر
مطلعِ برجستہ کو ہے لکھ کے دیتا انتظام

برسر پرواز ہوں جب تیرے شہبازِ سہام
جوشنِ جسمِ عدو میں ہوئے دم محبوسِ دام

دستِ دہقاں میں فلاخن شعلۂ جوالہ ہو
لیں ترے برقِ غضب کا کشتِ اعدا پر جو نام

گر سحابِ قہر تیرا ہو تگرگ افشاں تو ہو
حالِ اہلِ قاف وہ اے خسروِ عالی مقام

فلسفی دہر کے جو جیتے ہوئے مشائین
نورِ اشراق سے تھے ہو گئے سب اہلِ وفاق

تھے سعادت سے جو سب برجِ فلک مالا مال
بخت و دولت سے یہ لبریز تھا ہر قصر و وثاق

تھی تعجب کی نہ جا بارِ جلالت سے ہو گر
حرکتِ چرخِ گرانبار کی قطبین پہ شاق

انجمِ ثابت و سیار سعادت سے بہم
یوں نظر آئے کہ جوں سبت و بغلِ اہلِ نفاق

نجمِ ناہید لقب جس کو ہے رقاصِ فلک
تما بیٹے است بہ آہنگ رباب و عشاق

بدر تھا پیرِ قمر چاند سا نظر آتا ہلال
خدمتِ دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق

اس کا طنبور جو دیتا تھا سروں کو حیات
جرمِ خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اشراق

تیرِ گردوں کا خوشی سے تھا جو دل لہراتا
دیکھے ترتیب ثریا کو باقسام ایاق

چلتے تک ایسی بجاتا تھا کہ نیچے میں تھے
لعبتانِ فلکی صورتِ اہلِ اوراق

نظر آتا تھا اگر اخترِ فدار کوئی
دیتا مریخ دمِ تیغ سے اس کو الحاق

ہاتھ پھر مارتے چورنگ تھا آپ عطرقی سے
دم میں تھا اپنے طپنچہ پہ چڑھاتا چقماق

جو چلا پارۂ تن اس کا سوئے عالمِ خاک
یہ اڑا اس پہ تڑاقا وہ اڑا اس پہ تڑاق

سعدِ اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضیِ فلک
حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربطِ وفاق

ہوتا زاہد بھی تھا آمادۂ دامادی
زالِ دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دیکے طلاق

چرخِ ہفتم پہ فلک سے جو بطی الحرکت
عالمِ خاک میں پڑ رہے تگ و دو کا مشتاق

نفخِ تفریح سے پُر باد ہے گردوں کا شکم
لیکن اس وقت میں تنقیہ بہت اسکو ہے شاق

ہے جو ہر کوچہ میں آراستہ نوبت خانہ
خالی آوازۂ باجے سے نہو کوئی رواق

یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزمِ طرب
گلشنِ عیش و طرب کیوں نہو بزمِ آفاق

آج وہ روزِ ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید
بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دلِ اہلِ مذاق

بزمِ خسرو میں چل اے یار بہ بزمِ سخن
سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

تیرا قانون ترے پاس خطِ مسطر ہے
چھیڑ دے زابل و تبریز و خراسان و عراق

تیرے نغمے ترے مضمون ہیں ہم شہنائے قلم
دلکشی یہ ہے سرو ست کمر بستہ و چاق

دختِ رز کو یہ سرِ محفلِ اہلِ تقویٰ سے
جب تلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فواق

سمجھو آفاق میں ہووے رمضاں بھی مہِ عید
ہو ترے رویتِ دیدار پہ عیدِ آفاق

اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن
یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایامِ محاق

صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے ازہاق

قصیدہ نمبر ۶

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے:-

گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا اگر
اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ

سینہ میں دل اگر نہ گرہ تھا تو اس لئے
ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ

اپنا دلِ گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا
غنچہ ہزار حیف پہ کھلا اور ہوا گرہ

چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل
ہے ایسی چشم ترے ہم آشنا گرہ

قمری سے لائی چاک گریباں چمن میں آہ
اے سروِ گل سے لے سرِ بندِ قبا گرہ

ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر ہجومِ اشک
ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگورہ آ گرہ

میں تخمِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند؟
کھولے ہے کا بستہ کی میری صدا گرہ

تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں
وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ

مرقد پہ میرے طرۂ شمشاد کی طرح
پھوٹے گی نخلِ شمع میں بھی جا بجا گرہ

آیا ہوں بس سرشت میں لیکر گرفتگی
ہووینگے استخواں پہ گلوئے ہما گرہ

رہویگا شکلِ دستِ حنا بستہ حشر تک
قاتل کے دست و دل میں مرا خونبہا گرہ

گر میں گرفتہ دل ہوں تو جوں دانۂ انار
محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ

میں عکس اپنا دوں تو ہو جوہر سے آئینہ
جوں دامِ موج و شکلِ خطِ بوریا گرہ

عکسِ دلِ فسردہ سے مینائے بزمِ مے
رہ جائے شکلِ دانۂ انگور کیا گرہ

ہو ترے فیض تکلم سے شفا عام تو ہو
زہر کی جا دہن مار میں پیدا تریاق

عدل نے تیرے سنہا دفع یہ کی خونریزی
فصد کی منع اطبا نے پئے رفع خناق

اللہ اللہ یرے لشکر کا ترے خیل و حشم
ہم عدو جس سے نہ ازبک ہو نہ ہمسر قلماق

تیرے دربار جلالت کے جو ہیں میر غضب
کہکشاں کو ہیں سر دوش لئے مثل چماق

اور اک مطلع دلکش نے طبیعت سے مری
ہے ترے عدل کی تعریف میں پایا الصاق

اُٹھ گیا مدرسہ دہر پہ شر و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبد پیروزہ میں رہیں گے محبوس
دم نہ ماریں گے مگر گونج کے شور و شلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپ جہانگرد کا میں
دے فلک زیر پا پامال قلم ہفت اوراق

تن میں اس طرح سے ہے اُسکے بھری تیری شوخی
قفس تن میں ہو جوں طائر جان عشاق

ماہی زیر زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندھئے فتراک میں اگر اُس کا
چرخ پہ دار سے کھینچا کرے مانند نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شابا
جودت طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سوئے فلک جیسے سفر بہ شام
بوئے گل جائے تنفس میں دم استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیل فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اسکی تن البرز پہ شاق

عمر بھر مطبخ عالی میں رہا نعمت خواں
صفت اطعمہ پہ خام رہا جوں بسحاق

ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں انہی ہاتھوں کو لگی
نور رحمت کا زمانہ میں جو ہے عام انفاق

بر سر دشمن بدکیش یہ ہنگام دعا
گر فشوں ہووے بلورینہ پہ دشت قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اس کشور برفانی میں
شعلۂ تیغ شرربار ہو برق حراق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالم نور
جس کی مشرق سے کریں نور معانی اشراق

کر دعا صدق ارادت سے کہ ہے وقت دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوق زباں کو مشتاق

دوش گردوں پہ ہو تا فرغل سنجاب غمام
سبزہ تا خاک پہ ہو پیرہن استبراق

گل کی گرہ بہار کرے گر صبا سے وا
وہ کھولدے دلوں کی بفضل خدا گرہ

لایا ہوں یہ نذر میں وہ دُرِ آب دار
ہوجس کو دیکھ آپ دُرِ بے بہا گرہ

جوں برق لکھ کے مطلع برجستہ خامہ نے
مطلع سے آفتاب کے دی ہے لگا گرہ

مطلعوں میں حسن سے کی تو نے وا گرہ
کیوں میرے دل میں خال سویدا رہا گرہ

کھل جائے نام پاک سے اک آن میں ابھی
گر ہووے کوہ مردہ کو وصف گرہ

ہیبت سے تیرے نطق کے تجالہ نکلے ہے
دعوے کے لب پہ آ سخن مدعا گرہ

چاہے جو اس کو آب فصاحت کرے رواں
لکنت وہیں زبان پہ دیوے لگا گرہ

تیرے سحاب جود سے گلشن میں صبحدم
لے شست تر ہے غنچہ گل باندھتا گرہ

گردوں تنک کی جانِ فرو بستہ کھینچ کے ہو
مابین کوہ قاف میان ستا گرہ

تو ناخنِ نگاہ سے مانندِ آفتاب
دے کھول دم میں دیکھ کے یہ ماجرا گرہ

کھولے ہیں کار بستۂ عالم سے دانہ وار
تیری بہ لطف وسحاب عطا گرہ

دستِ گرہ کشا نے ہے باقی کہاں رکھی
جز کیسہ ہائے پیرہنِ اغنیا گرہ

البتہ دل میں غنچۂ پیکاں کے ہے ترے
جانب سے حاسدوں کے صباح ومسا گرہ

یا جو تری کمانِ نگاریں میں ہے نمود
وہ ابروئے نگار پہ ہے خوشنما گرہ

الدم میں تیرے ناخنِ شمشیر سے ہوں وا
ہیں سر جو حاسدوں کے بروز وغا گرہ

تیرے فروغ نیر حشمت سے کیا عجب
گر مہر ہو ہمت کے بشکل سہا گرہ

اللہ رے تیری قوتِ بازو کہ مثل گوے
چوگاں کے آگے کوہ کو ہے جانتا گرہ

تو چاہے گر تو دامن ساحل میں بحر کو
دونوں طرف سے کھینچ کے دیوے لگا گرہ

پنجہ سے تیرے مہر کے گردوں پہ ہر سحر
کھل جاتی ہے ستاروں کی لاانتہا گرہ

منقار ماکیاں کی طرح ناخن ہلال
ہے بیضۂ فلک کی سدا کھولتا گرہ

لائے جو شعلہ حرف شرارت زبان پہ
تاثیر عدل سے ہو تری لب پہ آ گرہ

یہ زہرِ غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیرِ زلف
سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

میں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں
حیرت سے اینٹھ کر ہو نہ بانِ درا گرہ

رویا میں شکلِ شیشہ کبھی کھول کر نہ دل
میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

وابستگی کا اپنے قلمبند کرکے حال
بازو پہ مرغِ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوترانِ گرہ باز کی شکست
سینہ سے آن کر سرِ دوش ہوا گرہ

وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے
جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبینِ صبا گرہ

پھیلاؤں گر شمیمِ مضامیں کو ہند میں
ہووے ختن میں نافۂ مشکِ خطا گرہ

رجعت سے نجم بد کی مری تا بہ سپہر
خرچنگ بن کے بیٹھ رہے ایک جا گرہ

پیدا ہوں سو گرہ اگر اک دل سے کھولئے
جوں کوکنار لالہ و تخمِ حنا گرہ

گھٹنا تا ہر دکا ہے کہتا کہ دیکھیو
قینچی کی طرح کترے ہے چرخ دوتا گرہ

ق
آہیں تو کھینچیں سینۂ صد چاک سے بہت
کھلنی تھی میرے دل کی مگر کیا بھلا گرہ

سوزن کا رشتہ نکلے کھنچا بستری میں آہ
ہے زیرِ پا سے رشتہ بپا دوسرا گرہ

قطروں سے خونِ دل کے ہوں سو سو گرہ عیاں
اک آئنہ سے دل کے جو کھولوں ذرا گرہ

یہ عقدہ مثلِ ابروئے خوباں کینہ جو
ہے ڈالتا یہ ناخنِ عقدہ کشا گرہ

رمال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پر تو ہو
انگلی سے پوری پوری میں اس کی جدا گرہ

ہر قطرۂ سرشک مرے روئے زرد پر
خاطر گرفتگی سے ہے جوں کہربا گرہ

یارب وہ شانہ پاؤں کہاں میں جو دل سے آہ
دے کھول شکلِ عقدۂ زلفِ دوتا گرہ

وابستہ تار موئے میاں سے ہوں شکلِ تاب
چشمِ کشادِ کار رکھے مجھ سے کیا گرہ

نقطہ کی طرح مرکزِ گردش رہا صدا
میں تھا مگر یہ دائرۂ دیرپا گرہ

دل تھا گرہ خیال میں جو آکے عقل نے
یوں کھول دی یہ ناخنِ فکرِ رسا گرہ

اس آفتاب پر تو نظر کر کہ جوں تگرگ
پل بھر میں اک زمانہ کی ہے کھولتا گرہ

وہ کون یعنی اکبرِ ثانی کہ جس نے وا
تیرے بھی کام دل سے ہے کی بارہا گرہ

پر تیرے مدعی کی نہ وا ہووے جوں حباب
ہرگز محیطِ دہر میں غیر از فنا گرہ

قصیدہ نمبر ۷

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے:-

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار
تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادو کار

سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ
زباں سے اسکی ہیں وابستہ انکے سب اسرار

سوارِ توسنِ دستِ رواں پہ ہووے یہ جب
کرے قلمروِ معنی کو دم میں باجگزار

جو شاخِ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں
تو اڑ کے صورتِ شاہیں کرے یہ اسکو شکار

زبانِ تیغِ نگہ سے لیا فنوں شاید
کہ اس پہ اڑ کے مضامیں ہیں کرتے جی کو نثار

ہیں دست بستہ کھڑے جا ہوں باندھ لوں جسکو
کہ لفظ و معنی و مضموں ہیں بے شمار و قطار

یہ کرتی کام جہاں جا کے اسکی نوکِ زباں
قلم دبیرِ فلک کا ہے واں پڑا بیکار

سخن زباں پہ ہے اور ہے نگاہِ دل دل پہ
کہ سو ہیں دل تو ہر اک کی ہے اپنی اپنی بہار

سخن شناس انہیں دیکھکر یہ کہتے ہیں
کہ جو گہر ہے وہی اس میں ہے دُرِ شہوار

کروں میں اس کو گر کیا کہ مشتری نہ رہے
متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار

شرابِ درد سے دل ہو گیا ہے مست ایسا
کہ شامِ روزِ جزا تک نہ جس کا اترے خمار

بنائے ناوکِ تقدیر خاک تو وہ جسے
بچا سکے اسے کیا خاک بلبلے کا حصار

ہزار درد اسے بے دردیِ زمانہ دکھائے
زباں پہ لایا نہ لائے گا شکوہ یہ زنہار

میں لایا سینہ میں تھا دل کی جا پہ آئینہ
ق کہ اہلِ دل اسے سمجھیں گے مطلعِ انوار

سو اس کو توڑا ہے لوگوں نے سنگِ باراں سے
میں کہتا تھا کہ گہربار ہونگے یا گلبار

صفا کا اسکے اک ادنے سا وصف یہ دیکھو
غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو اس پہ ہے بار

میں آبگینہ کے آگے ہوں آپ شرمندہ
کہ ایک بات سے پڑتے ہیں بال اس میں ہزار

اللہ رے بیم عدل کہ خون زمانہ میں
دشنہ بھی رکھے گر کے جبیں پا با گرہ

ق

زلفوں کے دام جیسے حسینانِ نازنیں
ہیں ڈالدیتے دیکھے لبوسے قفا گرہ

مارِ سیہ کے سر میں اسی طرح زہرمار
ہو ویگا مثلِ مہرۂ مار ایکجا گرہ

انجم سے تیری سالگرہ کے لیے فلک
ہر سال کہکشاں میں ہے دیتا لگا گرہ

توسن ترا زمیں پہ جو کاوے کا ڈالے نقش
سمجھیں کہ بیٹھا مار کے ہے اژدہا گرہ

جولاں پہ اپنے آئے تو جوں جنبشِ صبا
غنچوں کی کھولے باغ میں وہ بادپا گرہ

دامانِ ابرِ تر پہ وہ پاتا ہے برق نام
اُس کا شرارِ نعل جو دے ہے اُڑا گرہ

گر اُس کی گردِ سُم سے بمیدان کارزار
ہو گرد باد دامنِ صحرا میں کھا گرہ

لائے اُڑا کے تو ابے از شرق تا بغرب
کھلنے نہ پائے یہاں یہ جبین ہوا گرہ

رفعت پہ تیرے فیل کی طبع رسا نے رات
پھینکا کمندِ وہم کو جو کر کے دا گرہ

آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں
اک نقطۂ مشکِ ناب کا ہے ہو رہا گرہ

ہے سبکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دلمیں شوق
دیکھا جو نیشکر میں کہ ہیں جابجا گرہ

کرتا ہے آشنا اُسے دنداں سے وہ فقط
اس واسطے کہ اُس کی بھی ہو دل کی وا گرہ

سلکِ دُرِ سخن میں دلا صبح تا بہ شام
جوں سبحہ دیگا بیٹھا ہوا تا کجا گرہ

وا کر لبِ سوال بدرگاہ ذوالجلال
تا رہ نہ جائے سینہ میں دل کی دعا گرہ

غلطاں بزیرِ گنبدِ گردوں ہوا کرے
بن بن کے تا زمانہ کی صبح و مسا گرہ

تا چرخ واژگوں پہ سرِ شاخ کہکشاں
ہو خوشہ وار عقدِ ثریا سدا گرہ

میداں ہو تا سپہر کا اور گوے ماہ و مہر
اور دورِ مہ سے ہو ذنب و راس تا گرہ

تا دل گرفتگی سے زمانہ کی بزم میں
ہر دم گلوے شیشہ میں ہو قہقہا گرہ

حبِ نبات کو بیے دردِ مریضِ عشق
تا دیں بحالِ لبِ بتِ شیریں ادا گرہ

جبتک شمیم کاکلِ پیچاں کے رشک سے
نافہ میں ہووے مشکِ ختن بے خطا گرہ

ہر سال تجھکو جشن مبارک ہو خسروا
اور مشکلاتِ خلق کی ہو اُس سے وا گرہ

یہ شعبان فلک پر ہوا خوشی کا جوش — سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

(یہاں سے کئی سطریں پڑھی نہ گئیں۔ آگے چند شعر متفرق آتشبازی کے ہیں :-)

شب برات کی وہ روشنی کہ صفحۂ ملی — جو ہو زمیں پہ اگر آئے سامنے شب تار

جو مٹیوں پہ ہوئی روشنی تو شور اٹھا — فلک نے کھینچی زمیں پہ ستاروں کی دیوار

دیا ہے لایا ارسطو طلسم یونان سے — کھلایا سد سکندر میں چین کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتشباز — تو بولے اہل نظر دیکھنا ہے طرفہ بہار

یہ دینگے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو — تو آ کے ہو دینگے طاؤس خلد ان پہ نثار

سب اک طرف کو لگی جگمگانے چپ در گنج — زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانوں کے پردے تو اڑ گئے اس دم — پٹاخے گرنے لگے چھوٹ کے جب بہم تکرار

بتا رہے سب کہ تو اعدے فوق ہیں شاید — کہ تیر اڑتے ہیں پہ صف میں ہیں قطار قطار

عجب تماشہ ہوا پتیوں کو جب دی آگ — کہ ناچنے لگے مل کر ثوابت و سیار

ہوئی کبھی تھی جا کر شہاب ثاقب سے — لہو زیادہ جو پائیں فزوں ہوں آتشبار

ہیں ابر طور سے برسے زمیں پہ نور کے پھول — زمیں تو تو وہ کل ہیگی آسمان گلبار

(کئی شعر اور پڑھے نہ گئے)

اب اس دعا پہ قصیدہ کو ختم کرتا ہے ذوق — کہ دوست تیرے سرافراز اور عدو ہوں خوار

پر اس ہوس کی ابھی چھٹ رہی ہے بیتابی — قلم میں سال عروسی کا پھول دیوے بہار

اسی خیال میں تھا دیکھتا خدا کی طرف — کہے ہاتف فطرت نے والب گفتار

کہو سر لب بستہ ہے شادی فرزند — مبارک آپ کو ہوا ہے شہ سپہر وقار

۳۰ + ۲	جو ہو دیں اسکے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز ہوں اسکے دشمن بدکیش خالداً فی النار	۱۱۹۳ ۳۲ ۱۲۲۵

مگر تردّدِ ایام کیوں کروں اے چرخ
نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار

لے آیا حسنِ عقیدت اُس آستاں پہ مجھے
کہ سجدہ کرتے ہیں جھُک جھُک کے جس پہ لیل و نہار

سحاب جود ہے اُس کے زمانہ ہے گلشن
نہال ابرِ کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سُن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں
کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی
کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابرِ دریا بار

سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں
مذاقِ آب گہر میں ملا لیا کئی بار

اور اُس کے بعد ہوں کہتا کہ نامِ پاک ہے وہ
جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

خدا کا سایہ ہے اور نائبِ رسولِ خدا
محمد اکبرِ عالم نواز و عرش وقار

ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت
بہ دیں پناہ و بدل دولت و بہ رُخ انوار

خدا شناس و طریقت نما حقیقت بیں
بدست جود ہے دریا بہ تمکنت کہسار

نہ حقِ وصف ہو اُس کا ادا کبھی لب سے
زباں بہر سرِ مو آ کے گر کرے گفتار

ہوا ہوں لے کے میں حاضر یہ تہنیت کے پھول
کہ اور پاس رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شہا! ہے آج اُسی شاہزادے کی شادی
جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاد نشاں
وہ شاہزادہ جواں ہے ولے کہن کردار

پڑھوں حضور میں اک مطلعِ دعائیہ
قبول جس سے دعائیں ہوں بر سرِ دربار

شہا خدا سے یہی ہے مری دعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

شکوہِ شادیِ شہزادہ کس زباں سے کہوں
کہ جوں شگافِ قلم بند ہیں لبِ اظہار

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

جو لکھنے بیٹھا میں ساچق کا وصفِ آرائش
تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خطِ گلزار

یکایک اُتریں پرستاں سے آ کر پریاں
ہوئیں جو تختِ ہوائی پہ ناچنے کو سوار

ہجومِ عیش و طرب اس قدر زمیں پہ ہوا
دبیرِ چرخ سے بھی ہو سکا نہ اُس کا شمار

بزم عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظارہ
پڑھتا یہ مطلع رنگیں ہے وہ ہو کر خرم

ہے اٹھا عیش کا طوفان لبِ ساحلِ یم
زمزمہ فوج کا بر لب ہے ہوا ہے ہمدم

گٹکری کا سا ہے پھاہا یہ گلوئے مینا
ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم

لوگے جس سازِ خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑوگے طرح کا تو سنوگے پیہم

نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی تم کے ہے کوئی اور بھی غم

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ کو حرام
وجد میں آئیں شیخ آج گرا ہوئے حرم

تارِ طنبور رہی آج رگِ سنگِ صفا
بے زباں زمزمہ سازی کرے ہیچ زمزم

نہیں کچھ دور کہ تبدیل ہو کعبہ کا لباس
تاکہ دکھلائی نہ دے صورتِ اہلِ ماتم

دھوم اس شادی کی ہے کہ منڈھے کی صورت
چھا گیا گلشن آفاق پہ ہے ابرِ کرم

رقعہ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا
کہ جو انانِ چمن آئیں جو مل کر باہم

شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطرداں میں گلِ نرگس نہ بھرے عطرِ سہاگ
سارے گل بھرنے لگیں بلبل بیتاب کا دم

بل ہے تیاری پوشاک کہ چرخِ اطلس
لایا اطلس جو لگانے تو یہاں نکلی کم

یہ خیاطہ کی ہے جلدی کہ کھلا جاتا ہے
شکم کرم بریشم ہی میں تارِ ریشم

یہ چڑھاوے کی ہے کثرت کہ جٹے ہے ہر صبح
ڈگدگی پر گل داؤدی کے ہیرے شبنم

اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ
جس کی انگلی میں پہنائیگا سلیمان خاتم

ہوئی نوبت کی یہ نوبت کہ سحر اس کی ٹکور
گوش افلاک سے بھرتی ہے سو اگوش اصم

نئے قلیاں کو بھی گرمنشہ سے لگا تا ہے کوئی
تو وہ بھرتی ہے ہم آوازی شہنا کا دم

پہنچا یہ طنطنۂ کوس کا گردوں پہ دماغ
کہ نہیں رکھتا سرِ روئے زمیں اپنا قدم

آتی اس طرح سے پیہم ہے جلاجل کی صدا
کہ پری زاد ہے آتی کوئی کرتی چھم چھم

کہتا ہر دم ہے یہ نقارچی پیرِ فلک
کہ بعادت سے دمامہ کا گئے پھولا شکم

قصیدہ نمبر ۸

اکبر شاہ مرحوم کی مدح ہے - عالمِ شباب کا کلام اور نظرِ ثانی سے محروم ہے :-

اُفقِ دل پہ مرے عیش و طرب دونوں ہم / آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام

ایک کا ایک سے وہ ربطِ سخن تھا گویا / دو لبِ یار ہیں یا حضرتِ عیسیٰ ہمدم

روشِ ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی / لام الف لکھا تھا اسلام کا یاقوت رقم

یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل / یا کہ پیوند تھے دو نخلِ گلستانِ ارم

ملکے دو تارِ نظر ایک ہوئے تھے دونوں / یا وہ اک عینی کے دو پردے تھے باہم ہمدم

دونوں پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں / کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعدِ پُرخم

ایک معنی کے وہ لفظِ مترادف تھے دو / ایک مضموں کے دو فقرے تھے مگر مستحکم

تھے جڑے دو دُرِ شہوار کہ ہرگز نہ ملیں / ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم

ایسے تھے دونوں وہ یکدل کہ دو تا لب یکجاں / یکزباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاکِ قلم

آئے لپٹے ہوئے یوں عالمِ سرشاری میں / نالۂ زیر کی ہمراہ ہو جوں نالۂ بم

میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونے کا / تو یہ الفت نے کہا غیب سے ہو کر مُلہم

کیوں نہ ہوں کے دلِ تنگ میں حتی ہوں پہ تنگ / جب یہ معلوم تو پھر بات رہے کیوں مبہم

آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوی[۱] / کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم

کون وہ ظلِّ خدا - شاہ محمد اکبر / جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر اربابِ ہمم

شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم / ہو سلامت روی اُس کی بہ سلامت نعم

اس لیے عیش و طرب مثلِ قران السعدین / متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اس دم

یُمن اس عقد نے بخشا ہے جہاں کو ایسا / جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم

آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر / دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم

دیتا شکلوں میں ہے پیوند بدیع الانتاج / یہ تکلم سمجھے نہ تہذیب نہ جامعِ سُلّم

[۱] طوی - عروسی ۱۲

سر اٹھایا یہ ہوائی نے ہے آخر کہ ہوا
شعلہ اس کا علم کاہکشاں کا پرچم

ٹہنیاں جھومی ہیں اس رنگ سے نافرماں کی
جیسے رکھے ہوں تراشے ہوئے جام تسلیم

ہاتھی اڑتے نہ سمجھنا۔ بلِ عشرت نے بزور
سر کودو کوہ کے ٹکرایا ہے مانند غنم

نخل ہوا ہوا دم بھر میں نکل آتا ہے
ہے اناروں میں اچنبھے کا تماشا عالم

چھوٹے گن چکر اس انداز سے کھا کر چکر
چرخ میں آیا جسے دیکھ کے گردون دژم

پھولیں کیونکر نہ چمک کر گل آتشبازی
شاخ تھی گل کی قلم بنگئی شوسے کی قلم

جھاڑ ابرک کے نہیں۔ چادرِ مہتاب کے ہیں
جڑ تمک لپٹے ہوئے نخلِ گلستانِ ارم

نجرِ طور کا جوں وادی ایمن ہو نور
شمع ابرک کے کنول میں ہے دکھائی عالم

ہیں جو سرگرمِ شادی سے فتیلے روشن
تاب کیا خانہ گیتی میں رہے سایہ غم

باندھے سو شعلۂ فندق بسرِ ہر انگشت
پنج شاخوں کو کھوں میں نہ کبھی دستِ صنم

کھولا مصحف تو زہے یمن کہ سرلوحِ ورق
اسم اعظم تھا عیاں خطِ شعاعی سے رقم

رونمائی پہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روے تو دیدن نہ دہم

ایسی شادی کے تجمل کو لکھے کیا کوئی
دھوم ہے جس کی گئی تا سرِ ہفتم طارم

جی میں ہے توسنِ خامہ کی عناں پھیرکے میں
مدح اکبر شہ ثانی کروں پھر زیبِ رقم

جس کے باعث سے منور ہے چراغِ خورشید
جس کی دولت سے ہے آراستہ بزمِ عالم

جسکے دیں داری کے نقارہ کی اللہ سے صدا
از عجم تا بہ عرب اور ز عرب تا بہ عجم

جس سے پوچھو کہ تو آگہ ہے؟ کہیگا کہ بلے
انت تعرف کہو جس سے وہ کہیگا کہ نعم

مدح میں اُسکی رقم کرتا ہوں اک تازہ غزل
کہ غزلخواں ہے ہر اک آج بجانِ خرم

تو ہے وہ ابرِ سخا۔ تو ہے وہ دریائے کرم
جس میں ہوں فلس کی جا کیسہ ماہی پہ درم

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب
مشک سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

پہنچی ہے روحِ عدو سہم کے ناوک سے ترے
مثلِ آہوے رمیدہ سرِ صحرائے عدم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اس شادی میں — اس کے سینہ سے جو نکلیں گے یہ آوازہ بم
چو گھڑے روپے کے اور سونے کی تھلیاں انہیں — صف بہ صف دیکھ کے ان کو یہ پکارا عالم
ہے یہ سلک دُرِ شہوار بگوشِ بہجت — یا کہ ہنستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم
ہر سبوچے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ — اپنے اُبھرے ہوئے پستاں پہ چڑھائے محرم
دیکھ نقلوں کو سبوچوں میں یہ حیران ہے خلق — کہ بھرے موتیوں سے کیونکہ حبابِ لبِ یم
ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پر ان کو — وصفِ شیریں سخنی پائے زبانِ ابکم
کروں تحریر جو رنگت کو حنابندی کی — شاخِ گل مہندی ہو پھولوں سے ابھی میرا قلم
ہوئے روشن جو کنول شکلِ گلِ آتشناک — تو لٹیں اُنپہ دھوئیں کی ہوئیں زلفیں پر خم
کاغذِ زر کے پھولوں میں یہ گل کترے تھے — آ گیا تھا گلِ صد برگ کا پھر کر موسم
نخلِ آرائش اگر دیکھو تو ایسے دل کش — نوجوانانِ چمن جیسے بصد ناز و نعم
بیاہ کی شب وہ تجلی تھا کہ اللہ اللہ — کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم
سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے — کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تھیں آنکھوں کی قسم
دیکھے دولہا کے نہیں دستِ حنابستہ ابھی — ورنہ مٹھی کا غنچہ کے کھُل جاتا بھرم
مُنھ پہ نوشاہ کے یوں سہرۂ زرتار کی زیب — روئے خورشید پہ جوں خطِ شعاعی کی جھلم
ہوا شبدیز فلک سیر پہ دولہا جو سوار — روز نے صدقہ کیا اشہب و شب نے ادہم
(مطلع) وصف میں اُس کے پڑھوں کیونکہ نہ اک مطلع میں — توسنِ طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم

یار ہمدم نہیں لیکن ہے وہ نسلِ آدم
ہے وہ اُس نسل میں جس اصل میں رخشِ رستم

رمز راکب سے یہ آگاہ وہ صرصر رفتار — گزرے گر دل میں توقف تو وہیں جائے ہی تھم
ہے تو وہ حور شمائل - نہیں یہ زادۂ حور — خوئے آدم ہے ولیکن نہیں نسلِ آدم
چادریں بھیجتا مہتاب کی ہے بسکہ فلک — چاہیے اس کو زمیں پہ نہ گلیم و نہ گلم
نور کے قطرے فلک سے ہیں نہیں یہ برسے — چھوٹتے گنج ستاروں کے کہاں ہیں پیہم

میں وہ مجنوں جگر آشفتہ ہوں جس کے دم فصد
سر بن موت عوض خون تڑپنے نکلتا ہے دھواں

چشم سوزن سے نہ ہو سلسلۂ زنجیر کا تم
دل وحشت زدہ ہے لاغر بے تاب و تواں

ہوں وہ افتادہ کہ ہمت کبھی یاور ہو تو ہو
دستگیر آکے عصائے مژہ ہو موئے کتاں

ہوں وہ تصویر سر صفحۂ عالم جس پہ
ہو قلم دو تو ادے کار سناں و پیکاں

دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار
اک گرہ وا ہو تو صد آہ ہوں اندر داماں

ہوں وہ فرسودۂ غم جس کے بچشم بینش
کرتا سرو چمن دہر ہے کار سوہاں

قطرۂ شبنم کا ہو گل پہ تو مری نظروں میں
سنگ حسرت ہے کہ رکھتا ہوں بزیر دنداں

میں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے
اور اگر ہے تو ہے آغشتہ زہراب سناں

فلک سبز کے نیچے ہوں میں تلوا کا کھیت
آب شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے مری جاں

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمر تلف کردہ کسے
حشر تک ڈھونڈیں تو نکلیں نہیں ہاتھ آئے نشاں

ماہ نخشب کی طرح ہوتا عیاں ہوں سر کوہ
اور اپنی بلا میں ہو دکھے تو عیاں ہو تو نہاں

ہوں وہ سرگشتہ کہ گر ساقی دو ساغر پا بولا
حلقۂ دور فلاکت ہو بدست دہقاں

اس گلستاں کی روش پہ گل بازی ہوں میں
نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

دل نے لیموں سے کیا رنگ طلا کا روشن
ترش روئی سے رخ زرد ہے میرا تاباں

میں وہ گردش زدۂ دہر ہوں جس کا ہوں مرگ
سنگ تعویذ بھی جگر میں ہو مانند فساں

نیم بسمل ہوں دل خوں شدہ جس کے خوں میں
تیغ قاتل بکشش کشتئ دریا ہو رواں

اشک خونیں ہے مرا آتش یاقوت میں
گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

دل اٹھا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا
طائر رنگ حنا بن کے ہوا ہوں پراں

شغل معصوم کا ہے خواب مری موت و حیات
کہ یہی لب مرا خنداں ہے یہی ہے گریاں

وہ سیہ بخت ہوں میں خاک نے جس کی کہ سر
ہے سیہ کردیا آئینۂ حیرت گرداں

میں وہ بیمار ہوں مایوس شفا جس کے لیے
دم عیسیٰ نے کیا کار رفو ہی تعباں

اٹھ سکا سر نہ مرا مزرع گیتی میں فرا
دل ربا دانۂ روئیدہ تہ سنگ گراں

تیرا خنجر ہے نہنگ ایسا کہ غرقِ زہر آب
تیری شمشیر وہ اژدر ہے کہ ہے آتش دم

حق میں اعدا کے ترا تیر ہے پیغامِ قضا
اور ترا جوہرِ شمشیر قضائے مبرم

توڑے دل شیشہ کا ہرگز نہ ترے عہد میں سنگ
زخم کھاوے کہ لیا اُس نے مرے گھر میں جنم

تیرے انصاف کا پرتو ہے جو عالم پہ محیط
تو نہ پایا ہے نہ پائیں گے فروغ اہلِ ستم

روبرو بچۂ آہو کے نہ روشن ہو چراغ
ڈالے روغن کی جگہ اُس میں جو پیہ ضیغم

ق
گلشنِ مدح میں دے تیرے ترا ذوق لگا
خرمنِ گل کی جگہ تازہ مضامیں کا اتم

یہ یہ سمجھا کہ ہے جز کرتا دلالت کل پر
کہکے اک شمہ تری وسعت کا اے نیک شیم

یہ دعا کرتا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے
شادیِ وصلتِ فرخندہ بصد جاہ و حشم

ہوں شبستاں میں ترے دست و بغل عیش و طرب
گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

قصیدہ نمبر ۹

یہ قصیدہ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا۔ بندہ آزاد اُن دنوں طفلِ مکتب بھی نہ تھا۔ جب حاضرِ خدمت ہونے لگا۔ تو حضرت مرحوم اکثر اسکے اشعار پڑھا کرتے تھے [illegible] کی فرصت نہ تھی۔ ایک برس وفات سے پہلے فرمایا کہ اگر ہوتا تو اُسے درست کرتے طبیعت نے عالمِ جوانی میں بلند مضامین پیدا کیے تھے۔ چنانچہ اکثر اشعار اور مطالب خیال ہی میں ہیں۔ ایک قطعہ لکھدیتے ہیں چنانچہ ۲۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عیدِ قرباں کی تہنیت میں ابو ظفر بہادر شاہ کو سنایا۔ بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا۔ الحمد للہ کہ یہاں تک پہنچا۔ اول قصیدہ لکھتا ہوں۔ پھر قطعہ

دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ نازِ بتاں
زخمِ تیغ اسکو غنیمت ہے کہ دیکھا لبِ ناں

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامنِ دریا سمجھوں
برقِ پر سوز کا ہاتھ آئے جو طرفِ داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جس کے نفسِ سرد سے آہ
دم میں یخ بستہ ہو سرچشمۂ مہرِ رخشاں

میں ہوں وہ شعلۂ جوالہ بزیرِ گردوں
کہ اگر دل کو قرار آئے تو چکر میں ہو جاں

ترے خنجر کو ملا شہپرِ قدرت سے ہے زور
مرغِ دل سینوں سے جوں زاغ و زغن ہیں پرّاں

تیرِ ناوک کو ترے دیکھ کے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کرے گا طیراں

آتشِ قہر کی ہیبت سے تری نارِ سعیر
رکھتی شعلہ سے ہے انگشت بزیرِ دنداں

گنبدِ چرخ ہوا کلبۂ پر دود اُسے
روح کو سینۂ حاسد میں بجائے خفقاں

تیرا فرماں تھا کہ فرماں برِ دولت کے سوا
ہووے اک برگ نہ پیدا یہ گلستانِ جہاں

ہووے یہ منکرِ اقبال ترے ناپیدا
کہ چمن میں نہیں اُگتا ہے گلِ نافرماں

تیرے مہتابِ کرم سے جو سرِ قلزمِ قہر
پردۂ نور میں پلتا ہے تنورِ طوفاں

عدل نے تیرے دکھانے ہیں بہم آتش و آب
آبِ آئینہ میں روشن ہے رخِ برق وشاں

دلِ افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے سنگِ جراحت پہ سرِ زخم نہاں

تیری تاثیرِ محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبزِ خوباں

افعیٔ صبح سے کافور کا لیکر مرہم
رکھتا مہتاب ہے ہر سینۂ صد چاک کتاں

سرزنش عہد نے کی تیری یہاں تک معدوم
کہ نظر آتا نہیں شست میں کانٹوں کا نشاں

بے علف ناقۂ لیلیٰ ہے مگر قیس غریب
نہیں دیتا یہ ضیافت سرِ خارِ مژگاں

خسروا تیری توانائی اقبال سے آج
ناتوانوں کو ہوئی دہر میں یہ تاب و تواں

مور کا سلسلۂ نقشِ قدم گر ہو کہیں
اپنے حلقہ میں جکڑ لیتا ہے صد پیل دماں

آگے جلوہ کے ترے پرتوِ خورشید ہے گرد
آگے رتبہ کے ترے خاک ہے جرمِ کیواں

اس تصور میں جو ہے پیشِ نظر عالمِ نور
اس کو اک مطلعِ موزوں میں ہوں کرتا میں بیاں

گر تری ذات نہ ہو کعبۂ اقبالِ جہاں
آسماں ہووے نہ پھیری کے زمیں کے قرباں

ہوس ناصیہ سائی تری خورشید کو روز
مولشاں لاتی ہے در پہ ترے سرگرداں

مہرگاں ہمتِ عالی کا جو بادل لائے
لیتے نیساں سے وہ آفاق پہ ہو قطرہ فشاں

جن کی شادابیِ گوہر کو اگر دیکھے تو دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یہ قالب

شرحِ جانسوز سے میری نئے قلیاں کی طرح
کیا عجب نائے قلم سے جو نکل آئے دھواں

دلِ مایوس یہ تھا کہہ رہا مجھ سے کہ حسرت
یوں لگی کہنے کہ بیفائدہ کیوں آہ و فغاں

پھر تو کر غور کہ مداح ہے کس شاہ کا تو
دیکھ وہ ابرِ کرم قلزمِ جود و احساں

وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر
ہنستے مہوش ہیں تو کرتے ہیں ستارے افشاں

ماہِ گردوں پہ ہے اور آئنہ زمیں پر مہتاب
کثرتِ عیش سے دریا میں ہے شب کو رقصاں

سن کے یہ مژدۂ جاں بخش [illegible] اک کو یہاں تک
شوقِ نظارہ ہوا عام بہ گلزارِ جہاں

دیکھتا ہوں کہ سرِ شاخِ مژہ [illegible] چشم
رخِ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس داں

آج عالم کا ہے دل شاد کہ ہے عالمِ نور
جلوہ گر ہے سرِ اورنگ بصد شوکت شاں

ماہِ فرخندہ لقب شاہ [illegible] اکبر
تاجِ شاہانِ زماں فخرِ سلاطینِ جہاں

دیکھا ہے دولت و صولت نے جو اسکے اقبال
دہرِ سرکش کا بھی قد ہو گیا خم مثلِ کماں

مدحِ حاضر کیلئے حاضرِ دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانیِ ہند اور وہ ہے خاقانِ جہاں

پوچھ لو آج فلک سے کہ ہے خورشید کہاں؟
گر ہے کچھ وزن تو آجائے بسوئے میزاں

تیرے جلوہ کے تجلی نے جو روشن کیا دل
ہو گیا شمع مرے سینہ میں تارِ رگِ جاں

آستیں اپنی ہلا دے جو ترا دستِ کرم
ہر شکن سے ہو عیاں بحہ بحرِ عماں

کیوں نہ اربابِ ہمم ہوں تری ہمت کے غلام
تو یہی ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَان

آگے دریا ترے تو کھولے ہے لبہائے سوال
کہوے کس منہ سے کہ کچھ بھی ہے کھتا مرجاں

سرخروئی ترے حاسد کو جگر خواری ہے
شیر کے بال سے ہے تیز ترا اسکو رگِ جاں

کانپتے ہیں ترے ہیبت سے پلنگ اور نہنگ
بحر و بر پر ہے تری تیغ کی برش یکساں

ہے زرہ رکھتی اسی واسطے ماہی تہِ آب
پہنے جوشن ہے نیستاں میں ہر اک شیرِ ژیاں

تیغِ ہندی تو کمر میں ہے پر اک اک جوہر
رکھتا در زیرِ نگیں ہے صفحاتِ صفواں

کوہ پر بیٹھ کے یوں بیٹھے بہ پشتِ ماہی
جیسے ابروئے بتاں ہو تہِ آئینہ عیاں

جو دعا گو ہیں ترے ان کی دعائیں ہوں قبول
صبح جشن طرب افزا میں ہو دائم خنداں

اور بہ رنگ شب دیجور ترے سب بدخواہ
روسیہ محفل عالم میں ہوں جوں ماتمیاں

یہی قطعہ ہے کہ قصیدہ مذکور کی طرح میں وفات سے ایک سال پہلے تحریر فرمایا۔

خسروا جلوہ ترا وہ طرب افزائے جہاں
کہ جسے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں

حکم دے تو جو تہا واسطے قربانی کے
سعد ذابح بھی کرے ایسا چھری کو براں

گاؤ گردوں نہ فقط خوف سے اس دم کانپے
بلکہ ہو زیر زمیں گاوِ زمیں بھی لرزاں

تو جو ہو حامیِ اسلام تو بت خانہ میں
بت کرے قصدِ نماز اور کہے ناقوس اذاں

نیر جاہ شب و روز ترا جلوہ فروز
مہر تاباں کبھی ظاہر ہے کبھی ہے پنہاں

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت
لیلے بنجہ میں گہر بحر سے نکلے مرجاں

اور گہر بھی ہوں وہ خوش آب جنہیں دیکھ کے دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ثریا کا رشتہ ل

نطق شیریں ترا وہ ہے کہ ثنا میں اس کے
تر زباں موجہ دریا ہو اگر ایک زباں

آب دریا میں ہو یہ جوشِ حلاوت پیدا
لبِ دریا بھی بہم ہو کے ہوں دونوں حیاں

اس قدر تابعِ فرماں ہے زمانہ تیرا
نہ ہو گلشن میں بھی بے وعدہ گلِ نافرماں

ہو کے سرسبز بہارانِ کرم سے تیرے
شاخ پہ گل چمنِ دہر میں ہو شاخ کماں

بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ سرِ شاخ خدنگ
روشِ غنچۂ گل ہووے شگفتہ پیکاں

وہ ترا زورِ حمایت ہے کہ جس کے باعث
ناتوانوں کو بھی ہو دہر میں یہ تاب تواں

ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں
ایک تارِ نگہِ مور سے سو پیل دماں

دیگ مطبخ پہ ترے یہ فلکِ پر انجم
کیا عجب صورتِ سرپوش ہو گر قطرہ فشاں

پیل تیرا گلِ سوسن کا پڑا ہے انبار
گل مہتاب کے گلدستہ ہیں اُسکے دنداں

اُس کی خرطوم کسی دلبرِ لیلے وش کی
جعد مشکیں ہے کہ ہے کاکلِ عنبر افشاں

لکھوں شوخی جو ترے توسنِ چالاک کی میں
جنبشِ خامہ بھی ہو موجِ رمِ برق جہاں

آتشِ قہر و غضب تیری حیاذاً باللہ
ہے یقیں صورتِ نخلِ گلِ آتشبازی

ماجرا خامہ نے شیریں سخنی کا تیری
سخن و اہلِ سخن سب سرِ ساحل تھے کھڑے

وصف شوخی ترے توسن کا ہوں کس طرح رقم
باندھوں کس طرح سے مضموں سواری میرا تے

قلم و حرف نہیں پیشِ نظر ہیں اس دم
کہوں شائستگی اس بادیہ پیما کی میں کیا

نہیں انساں ہے مگر کام ہیں انساں سے فزوں
خسروا سرعتِ رفتار ہو گر مدِ نظر

جلوہ گر خانۂ زیں پر ہو پھر اس شان سے تو
تازیانہ جو لگا دے تو کفل پر اس کے

ابھی کوڑے کی صدا کوہ سے پھر کر نہ چلے
کیا دکھاؤں ترے ہاتھی کی بلندی شاہا!

جھومتا جھامتا آتا ہے درِ دولت پر
سمتِ قبلہ پہ ہے ابر آیا سرِ دوش ہوا

اس کی مستک پہ سپر اور وہ نگارِ خرطوم
اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی مہوش کی

اس کے دنداں یہ نہیں خود سے دیکھا میں نے
کیا لکھوں آگے ترا وصف کہ منہ میں میرے

ختم کرتا ہے ثنا تیری دعا پر اب ذوق
تجھکو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ و جلال

مشتعل ہووے اگر سوے گلستان جہاں
نخلِ فوارہ بھی پانی میں رہے شعلہ فشاں

صورتِ موج میں دریا کے دیا تھا بزباں
دونوں لب سکے حلاوت سے ہم تھے چسپاں

کہ قلم صفحۂ کاغذ پہ ہے جوں برق طپاں
تڑپ اٹھتا ہے ترے جنبش اگر طبع رواں

سرِ حاسد سے ہے دل کھیلتا گوئے چوگاں
تازیانہ ہے بکار اس کو نہ درکار عناں

پر نہیں پر وہ پری سے ہے زیادہ پرّاں
چلے ہو قاف سے تا قاف سراسر میداں

بر سرِ دوش صبا جیسے شمیمِ ریحاں
ادھر چمک کر کبھی اڑ جائے وہ بجلی تیراں

وہ کئی بار پھرے واں سے یہاں اور یہاں سے واں
آنکے کوسوں سے نظر سب تو عیاں ہے پیہاں

کہتے ہیں ساقیِ طنّاز سے یوں بادہ کشاں
خم یہ خُم آج چلے جام نہ آئے بمیاں

کریں آنکھوں پہ قوسِ قزح کا عنواں
زلف پر گل ہے و یا کاکلِ عنبر افشاں

کشورِ زنگ میں آئے ہیں فرنگی بچہ گاں
یا سرِ آدا ہے جوں شعلہ زباں ہے لرزاں

کہ زباں کو بس اب آگے نہیں یارائے بیاں
عقل ہو پیر تری بخت ہیں تیرے جواں

ہے بحر اُسکے سامنے کشتی بکف گدا
پھرتا صدف ہے کھولے ہوئے لب سوال کے

ہیں اُس کے در کے خاک نشینوں کے دل غنی
خواہاں وہ ملک کے ہیں نہ جویاں منال کے

دنیا نے خاکساری اُسے دی ہے نذر میں
مٹی خمیر یہ ہے گہر میں کلال کے

ہو اُس کا حکم عام جو بہر منع انقطاع
رہ جائے آرہ چوب پہ دندان نکال کے

[illegible]ن جس کا اُسکے زورِ حمایت سے ہے قوی
وہ پیر زال سمجھے ہیں رستم کے زال کے

ہیبت جو اُسکی وادیٔ حق میں کرے ظہور
جا بیٹھے چھپ کے شیر بھی بر میں غزال کے

اُس کی شمیم خلق معطر کرے جو گل
لے لیکے سونگھیں اہل تمیز [illegible] نعال کے

خوشبو ہے اُسکی فیض سے ہوتا ہے مشکبو
سچ ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

[illegible] دن میں تغیر ہو بال [illegible]
یہ [illegible] گر زمانہ میں دن اعتدال کے

ہو منظر شہ سے اگر اس کی کامیاب
لب بند ہوویں طوطی شیریں مقال کے

[illegible] بھی اُس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوے
نکلے ہے [illegible] صدا منھ سے لال کے

آب گہر میں ہووے رواں کشتی گدا
دستِ کرم سے اُس شہ دریا نوال کے

[illegible] چاہتا ہے ہوکے مخاطب بیاں کروں
اوصاف ایسے شاہ کرامت خصال کے

اے سپہر جلال کے خورشید پر جلال
قربان جائیے تو سے جاہ و جلال کے

شمع بزم خاص کہ جب آگیا تجھے
صانع نے اپنے نور کے سانچے میں ڈھال کے

[illegible] بھی پست ہوکے ہوا خوب منفعل
تب لو دکھا جب ترے اوج کمال کے

[illegible] انہیں ہیں کہتے منجم جہان کے
[illegible] ہیں یہ ہیں [illegible] انفعال کے

اے شاہ تیرا نام تصدق [illegible]
قطرے [illegible] میں [illegible] خیال کے

دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا
دریا بھی منھ چھپا کے گریباں میں ڈال کے

جس دل پہ تو نگاہ کرے آکے سامنے
جام جہاں نما ہے بنا [illegible] سفال کے

ق

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال
روشن ہوا کمال سے قطب شمال کے

سنتے ہیں جاں نثار وہ جب تیرا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منھ سے بلال کے

وقت کا دیکھے دمِ معرکہ راکب اُس کا
سرِ حاسد کو رکھے صورتِ گوئے چوگاں

دل میں ہیں جوشِ ثنا میں تو نہایت لیکن
دل حوادث سے زمانہ کے ہے بیتاب و تواں

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیری
کیا لکھے وہ ترے اوصاف کہ قاصر ہے بیاں

عید اضحےٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے
تجھ پہ ہو سایۂ حق اور ترے سایہ میں جہاں

قصیدہ نمبر ۱

جب پہلے پہل ۱۲۴۵ھ ہجری میں سائیں نثار علی شاہ وارد دہلی ہوئے بیان کیا کہ اورنگ آباد ہمارے وطن میں میاں عاشق نہال حقی ایک بزرگ ہیں اُن کے ہم دیکھنے والے ہیں۔ اُستاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جبھی ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور تعجب یہ کہ اُن کے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا۔ کوئی کوئی شعر سُنا یا کرتے تھے۔ سائیں نثار علی شاہ ان دنوں ایک سید بزرگوار کے گھر میں اُترے تھے۔ خدا کی قدرت۔ ۲۰ برس کے بعد اُس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس۔ پاکدامن۔ اہل اللہ۔ بی بی۔ میں کبھی کبھی اُن کے سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُنہوں نے مجھے ایک بستا اجزا کا دیا کہ یہ سائیں چھوڑ گئے تھے۔ اُن میں دیکھا تو قصیدہ مذکور ہے۔ جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اُس کی تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے۔ بچ تو گیا ہے۔ اللہ شہرتِ عام اور بقائے نام نصیب کرے۔ اصل سے نقل ہوتی ہے۔

پیشانی پر یہ عبارت لکھی تھی:۔

قصیدہ در مدح زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت سید عاشق نہال چشتی ادام اللہ برکاتہم

ہے ابرِ درفشاں وہ چمن میں کمال کے
عاشق نہال کیوں نہوں عاشق نہال سے

ہیں دیدہ ورستاروں میں خورشید و ماہ اگر
روشن ہیں دونوں نور سے اس کے جمال کے

اُس کی نگہ سے گر جگرِ سنگ پاسے رنگ
بھر جائیں پل میں لعل سے دامن خیال کے

کہا، اسی وقت بیگم[1] صاحب کا حکم پہنچا ہے۔ کہ کل اُستاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ اُستاد نے کہا بہت خوب میری طرف سے اُنہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے اور ایک دم گرم بھر کر کہا ’’بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کے مُنہ بند کرتی ہے! میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوان خاص کے درودیوار سے واہ واہ ہوں گی‘‘ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے۔ وقت معین پر ایما ہوا کہ اُستاد اپنا قصیدہ عرض کریں۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے سب صم بکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ۔ اور آگے آؤ پاس پہنچے تو اشارہ کیا کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا۔ ہوں! (یعنی پھر پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے۔ خوب تعریفیں ہوئیں۔ بیگم نے بھی سُنا کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ ۱۸۴۹ء میں لکھا تھا۔

پیری میں پر ضرور ہے جام شراب ناب
پائے فروغ صبح نہ بے نور آفتاب

تائب نہ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سفید
کر خوب میکشی کہ یہ ہے سیر ماہتاب

ہے پیر دل خنک کی ہوا پر بقا سے عمر
یہ برف وہ نہیں ہے رکھیں بند سے داب

ہستی کا اپنی کر نہ بھروسہ حباب وار
تعمیر بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

[1] بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت ان کے نام کر دی تھی۔ ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا منتظم تھا۔ خلیفہ اسمٰعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں اس لیے اسے ہمیشہ خطرہ تھا۔ کہ شاید اُستاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ اُستاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر اُستاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ نہیں کہا۔ نہ بیگم کی شکایت کی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ اُن کا قول تھا کہ زبان جوہر لطیف ہے اسے عیب سے آلودہ کرنا اچھی بات نہیں ۱۲

سرتا قدم ہیں شوق ترے طالب جمال
ساعت بقدر روز ہے۔ اور روز ہفتہ وار
بیتاب اس طرح ہیں ترے اشتیاق مند
مرغ نظر کے ساتھ اُڑا جاتا ہے دل
جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف
شاہا یہ ذوق ہے امیدوار لطف
تا جلد اس کا کوکب طالع بنے عروج
کر دے بہار نام سے اپنے اسے نہال
دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر

مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے
ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے
جیسے طیور تازہ گرفتار جال کے
مژگاں سے دونوں بازوؤں تیر پر نکال کے
دھو دھو کے پاؤں پیچھے پیک خیال کے
ہو حال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے
آجائے سمت اوج پہ گھر سے وبال کے
جھونکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے
ایمان اس کے ساتھ ہو وقت انتقال کے

نکلے بہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

بقلم مصنف عقیدت کیش صداقت اندیش۔ سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق۔ برائے نذر جناب فیض مآب گلشن فضل و کمال حضرت سید عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم جمادی الاول روز پنجشنبہ ۱۲۴۵ھ ہجری قدسی مطابق ۲۴ اکبر شاہی در قلعہ شاہجہان آباد۔ گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

قصیدہ نمبر ۱۱
در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

اُستاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھیں گے۔ چند شعر لکھے تھے جو مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے۔ (اور آہستہ سے

بہتر میرا یہ ہے کہ تقوے سے ہے گریز
تقوے سے ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب

لیکن ہے ابرِ رحمتِ باری سے دُرفشاں
دامانِ ترمرا روشِ دامنِ سحاب

مداح ہوں میں اُس کا کہ ہے جس کے دور میں
شیبِ زمانہ کو بھی کیفیتِ شباب

پیرِ فلک بنے ہے جوانِ سیاہ مست
ریشِ شعاعِ مہر پہ ہے ابر سے خضاب

مانندِ نافِ آہو اگر جام میں ہو خوں
اُس کی شمیمِ خلق سے ہو جائے مشکناب

اس شاہ کے نمِ کرم و بوئے خلق سے
ہر خارِ بن ہو ہمسرِ فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسمِ پاک
ہے درجِ زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب

ظلّ الٰہ خسروِ دیندار و دیں پناہ
شاہِ بلند جاہ و خدیوِ فلک جناب

تیغ اُس کی وہ ظفر دم و نصرت اثر کہ ہے
گنجِ ہزار فتح کی مفتاحِ فتحِ باب

روشن دلی سے اُس کی عدو تیرہ بخت کے
دزدِ سیاہ کار کو آفت ہے ماہتاب

ہر مغزِ جانِ کافرِ نعمت کے واسطے
مطبخ میں اُس کے تیغ ہے مرد دہر تاب

ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں
اُس میں بہم وفورِ عطا گرمیِ عتاب

کج خلقی اس کی طبعِ رواں میں نہیں ذرا
دریائے موج زن کو ہزاروں ہیں پیچ و تاب

پڑھتا ہوں میں وہ مطلعِ روشن حضور میں
جس کا ہو وے مطلعِ خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نورِ مجسم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو ترے سایہ سے اکتساب

تلوار تیری ہے وہ غضب برقِ کفر سوز
ہے جس کی آنچ آتشِ دوزخ کا التہاب

جو برسے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا
کرکس کا لہو کے بہ حرفِ آیتِ عذاب

ق

اللہ رے پاسداریِ اسلام و پاسِ شرع
اللہ رے تیری تقویت اللہ رے احتساب

نکورِ زخمِ دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے
اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب

کیسا ہی مے پرست ہو مانندِ چشمِ یار
مقدور کیا کرے قدحِ مے کا ارتکاب

بلکہ نہ لے دعا قدح کا بھی منہ سے نام
بالفرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

آئی ہے جب سے قالب خاکی میں تیری جاں
غافل پئے سفر ہے اُسی دن سے پا تراب

جو دم مزے سے گزرے غنیمت سمجھ کے روز
گردش سے ہے آسماں کو زمانہ کو انقلاب

ہر بازیٔ فلک پہ تو نوروز روز کر
رکھ آفتاب گنجفہ پہ سال کا حساب

حاصل ہے کیا منہ سے دلا آئینہ کو دیکھ
جو ہے سے دل میں رکھتا ہے کس درجہ پیچ و تاب

گر ہو سکے تو خاک در میکدہ ہو تو
اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب

آسودگان کنج خرابات کے لیے
جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب

یا شکل ہیں سبدِ داغ سبو ہیں کہ منہ سے وہ
دکھا جواب تا نہ کسی رزق کو جواب

رکھتا ہے پر نہ اہل سعادت کو بد مذاق
گزران ہے ہماں سر روزی کا باب

دیکھے جہاں کو دیدۂ عبرت سے تو اگر
جام جہاں نما ہے ہر اک کاسۂ حباب

ساقی جو مجھکو عین عنایت سے جام دے
لے لوں لگا کے آنکھوں سے پی جاؤں اسے شتاب

گر بے حساب جام پہ جام آئیں میرے ہاتھ
روز حساب تک تو پئے جا علی الحساب

مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سنا
جامی بھی لکھے دل پہ جسے کرکے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
مینوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بط شراب

گلگون نشہ سے گلگوں پہ ہو سوار
پابوس آسماں روش حلقۂ رکاب

مستی مری سکھائے اگر جھومنے کی طرز
ٹپکے ہمیشہ ابر سے مے بجائے آب

بیہوشیوں میں ہیں مری وہ رمز ہوشیاں
ہوتے ہیں جس سے ناظر ہوش خرد کباب

جاگ اٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند
غفلت میں گر بلند ہو میری صفیر خواب

نہ پردہ فلک کو اٹھا دوں اک آن میں
ہو جاؤں میں جو عالم مستی میں بے حجاب

ہو وہ صدا بلند فلاطوں میں ہم نشیں
کہہ بیٹھوں گر نشہ میں کوئی حرف ناصواب

یہ ذہن کو ہے عالم مستی میں روشنی
بنتی ہے نسخہ حکمت اشراق کی کتاب

ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھکو شغل
ہے مثل شغل آئینہ و شغل آفتاب

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی | کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک | معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیرِ ہوا سے | گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرفِ ہوا ہے طربِ عیش کا عالم | ہے مدرسے میں بھی سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور | زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی

ہو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں | گویا کہ ہے مینا سے مے کاہ ربائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی | کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنیِ خار کا صحرا میں جہاں فرش | سبزے نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لئے جامۂ رنگیں | زیبائشِ غنچہ کے لئے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل | برگِ گلِ سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ہر دو یہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید | سرخیِ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم | جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی

کیا ساغرِ رنگیں کو کیے جلد مہیا | نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوئی متحمل نہیں اک ساغرِ گل کی | شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی

عجائب نواسنجیِ مطرب سے چمن میں | ہر خار کی ہے نوکِ زباں نغمہ نوائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر | ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی

شاہا ترے جلوہ سے ہے یہ عید کو رونق | عالم نے تجھے دیکھ کے سب عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے ابرو نے وہ تیری | کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے ترے جامِ مے عیش سرِ بزم | لے ساغرِ جمشید کرے کاسہ گدائی

ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرہ گہری شکل | ہو شکلِ فلک جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے | دریا کی کہاں ہو سکے کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلعِ موزوں | احسنت کہیں سن کے بہائی و ثنائی

شاہا تری حمایت و دولت کے سایہ میں
گنجشک شکِ باز ہے رشکِ ہما غراب

کرتا ہے روز شب کو برابر شہنشہا
تعمیلِ عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشید شیر چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ
چاہے ہے شیر جنگ یہ تجھ سے مگر خطاب

کہئے ترے تکلم شیریں کو شہد کیا
یہ شربتِ خضر ہے شہا وہ قئے ذباب

ق

چالاکی ہے وہ توسنِ چالاک میں ترے
شوخی ہے چشمِ یار میں عاشق میں اضطراب

کاوے میں یوں وہ جیسے کہ طاؤس وقت رقص
اُڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چمکائے اک ذرا سر میداں جو تو اُسے
بے پر ہوا پہ جائے وہ جوں ناوکِ شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر اب اختصار
یارب دعائے ذوقؔ ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عیدگاہ ہو اور خطبہ و نماز
تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھکو عید ہو فرخ بعز و جاہ
ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کامیاب

قصیدہ نمبر ۱۲

در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروے پُرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتیِ طلائی

ہے عکس فگن جامِ بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ تمیز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

خورشید و مہ کو روبرو تیرے کہاں مقدور لاف کرتے ہیں دونوں روز و شب گرتے در کا طواف
اے قبلۂ روشن دلاں اے کعبۂ اہل صفا

ہے تیری فر و فرہی فر فریدوں کا نشاں نصفت کو تیری دیکھکر کسری کی بھی ہو کسر شاں
وہ سکندر قدر ہے اے فخر شاہان جہاں تیرے ضمیر پاک کو پہنچے ہے جام جم کہاں
وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

تیری بہار لطف سے ہر دشت ہے رشک چمن پیدا ہوا ہے خار خشک میں گلہائے نسرین و سمن
ہے سحاب فیض سے اس خلق پر تیرے زو امن جس جا کہ موج ریگ ہو بحر رواں ہو موجزن
اور وہ زمیں ہر موج پر لاکھوں ہوں در بے بہا

اللہ رے دریا دلی تیری دم جود و کرم ہے دل ہی دل شاہنشہا تو سر سے لیکر تا قدم
آگے تری بخشش کے ہے دریا بھی تہ یم تو بخش دے اک آن میں سو گنج دینار و درم
پیسہ بھی ہے رکھتا نہیں وہ فلس ماہی کے سوا

جس پر عنایت ہو تری اسکو نہیں پروائے زر جس کا کہ حامی تو ہو کیوں دل شکستہ ہو کمر
اللہ نے تجھکو کیا بیچارگاں کا چارہ گر اے خسرو والا گہر تیرے تلطف کی نظر
ہے مفلسوں کو کیمیا ٹوٹے دلوں کو مومیا

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسرو والا نگاہ اب یہ دعا ہے ذوق کی حق میں ترے شام و پگاہ
جب تک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پہ مہر و ماہ فرخ ہمیشہ عید ہو تجھکو شہا با عز و جاہ
بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

تمت بالخیر

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہرِ گدائی

گمرہ کو ہدایت جو تری راہ پہ لاوے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشانِ سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تیری نذر سدا نقدِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوٹے
گر سر بہوا ہو دے ترا تیرِ ہوائی

ہر کوہ اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو ذہن رسا جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگِ صنم میں
ہر بُت میں کرے صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعر غزل میں ترے حسنی شفا ہیں
قربان غزل کے تری دیوانِ شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ
خونریزی کو ہو عہد میں تیرے نہ رسائی

دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمونِ ثنا میں
ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ جشنِ عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

قصیدہ نمبر ۱۳ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظر ثانی نہیں پائی

شاہِ جمال و حسن کا لکھوں [illegible] کیا
ظاہر میں تو ظلِ خدا باطن میں تو نورِ خدا

جلوہ ترے دیدار کا ہے اس قدر بہجت فزا
روئے مقدس کو ترے جس نے کہ دیکھا یہ کہا

صلِ علیٰ صلِ علیٰ صلِ علیٰ صلِ علیٰ

انوارِ عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صاف
جس کی پہنچتی روشنی ہے قاف سے لے تا بہ قاف

بھوک کی شدت سے اُسکو یکنفس فرصت نہو — قرص سے خورشید کی جب تک نہ کرے ناشتا

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کا دانہ چرخِ پیر — پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں — لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ذکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے — جوں حباب اس کی نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم — جید الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال — ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا

رکھیگا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس — بارغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو — پھینکدیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج — نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو — جبکہ ہو اس کی نویدِ غسلِ صحت جانفزا

وہ ولیعہدِ زماں مرزا محمد بوظفر — اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگِ زرد — ہوں مقویِ دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا

شادیِ صحت سے اُسکے آج ہو کر شاد شاد — تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں — بلبلِ تصویر سنکر بول اُٹھے مرحبا

مطلع

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت اِنتما — دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جاں بخشِ صحت ہے ترا ماء الحیات — جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمرِ خلق — ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آبِ بقا

قطرہ افشانی سے آبِ غسلِ صحت کے ترے — ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہو ویں استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر — بخشے پیرانِ کہن کو نوجوانوں کے قوے

جسم کو مل مل کے دھو دیا تو نے جسدم وقتِ غسل — گرد کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا

دل عدوے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت — زیرِ پا پامال ہوتا ہے برنگِ سنگِ پا

قصیدہ نمبر ۱۴

مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے عالمِ ولیعہدی میں ولیعہدی کے بعد غسلِ صحت کیا تھا۔ اس کی مبارکباد میں، استاد مرحوم نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ عالمِ شباب کا کلام ہے ٭

واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر نرم صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزار عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغِ سیہ یاں تک لگا نشو و نما

ہوگیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگِ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نہ سمیت
بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ

راحت و آرام کا اس دور میں ہو دور دور
چاہیے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا

آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

فرق جا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شتاب
کیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا

صبحِ صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام ۔ عقل کو تجربہ کی [illegible] بھی کثرت
نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے نہ تھا شکل سے کام ۔ تھی مری فکر کو ہر [illegible] عصمت
ذہن میں سب مرے حاضر صدریہ علمیہ ۔ پر جتانی مجھے منظور [illegible] عملیت
یار و نا چار جو ترغیب یاروں کی کبھی ۔ درس تدریس پہ [illegible] مجھ کو رغبت
کبھی ہمت تھی مری قاعدہ صرف و عرف ۔ کبھی نحو میں [illegible] مجھے [illegible]
کبھی منطق کو تفوق یہ مرے [illegible] ۔ [illegible]
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں ۔ کبھی میں کرتا [illegible] تنجیم نجوم و ہیئت
کبھی تفہیم فرائض کبھی تفہیم اصول ۔ کبھی تعلیم عقائد [illegible] کتاب و سنت
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا ۔ کبھی کرتی تھی طبیعی [illegible] طبیعت جودت
کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانند حکیم ۔ کبھی [illegible] مجھے [illegible]
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہات ۔ اور کبھی کرتا تھا باطل [illegible] انشقت
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل ۔ کبھی [illegible] تناسخ پہ مجھے سو حجت
حشر اجساد میں تھا گاہ تردد مجھکو ۔ کبھی تھی عالم برزخ میں مجھے اک حیرت
کبھی تھی عرصۂ تدویر فلک کی مجھے سیر ۔ کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وسعت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش ۔ کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت
کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جو ہر قائم ۔ کبھی میں کرتا تھا حلول سے ثابت علت
کبھی منقول پہ مائل کبھی سوئے معقول ۔ کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت
کبھی میں حافظ قرآن بعلم تفسیر ۔ کبھی میں قاری قرآن بعلم قرأت
کبھی کرتا تھا سطحی پہ حواشی تحریر ۔ کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی صحت
کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج ۔ کبھی میں کرتا تھا قاموس [illegible] تصحیح لغت
کبھی میں لون سے بیننده بیمار و صحیح ۔ کبھی میں نبض سے [illegible] ضعف و قوت
گہہ نباتات کی آگاہی کیفیت سے ۔ گہہ جمادات کی معلوم [illegible]

خوردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لیے
دے گیا ابرِ بہاری نذر دُرِّ بے بہا

شادیِ صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تارِ شمع کو گر ناخنِ موجِ نسیم
بزم میں پیدا ہو تارِ سازِ مطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے یوں موجِ تبسم موجِ مے
شورِ قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزم میں [illegible] فانوس [illegible] کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیرِ گردوں جابجا

کر رہا صحنِ چمن ہی میں [illegible] کیا طاؤس رقص
آشیانے چھوڑ کے رقصاں طیورِ قبلہ نما

تھا نہاں نے شمع میں بھی تیلیوں کو رقص سے
ہے جو منظورِ نظر سب کو تماشا رقص کا

چھوٹی آتش [illegible] کو دیکھ
رات کو کتنے تھے آپس میں [illegible]

عقدِ آتشبازی پر سیرت [illegible] ہوتی ہے تقلص
سنگ پارس سے کہیں بارود کو پیسا تھا کیا

ہوگئی [illegible] شہر بھر کی یہ کہ [illegible] سے
ریزہ و قرص و چکلی بنتے گلہائے طلا

گنج بنتے تھے ستاروں کے حباب [illegible] سے
ماہ پاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما

منہ پہ کیا جو رنگ سے [illegible] مہتاب ہو
غازہ سے ہر چند چمکے رنگِ روئے مہ لقا

برج جو اُڑ کر ہوئے قندیلِ شب زیرِ فلک
برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ جس کے روبرو
جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبانِ خامہ عاجز آپ کی تعریف میں
ذوق کہتا ہے اٹھا کر ذوق سے دستِ دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شافیِ مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

قصیدہ نمبر ۱۵

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت معمولی کے ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا تھا۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاجِ حصولِ صورت

فائدہ کیا جو ہر اک علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا جو ہر اک فن کی کھلی ماہیت

فائدہ کیا کہ جو دیکھیں کتب ہر مذہب
فائدہ کیا جو ہوئی آگہی ہر ملت

عقل سے گرچہ کیا مادہ ایسا پیدا
کہ بہر شکل ہو اک تازہ محل صورت

یا بنائی کوئی صورت کہ جسے دیکھ کے ہو
ہیکل روم سے بتخانہ چیں تک حیرت

بے مقدر نہ پڑے صورت بہبود نظر
دور سا آئینہ دل سے نہ ہو زنگ کلفت

پڑھوں اک مطلع برجستہ میں اس موقع پر
جس کو سن کر کہیں احسنت سب اہل فطنت

گر نہ دے صاحب جوہر کو مقدر عزت
جوہر فرد ہے بالفرض تو کیا ہے قسمت

کیا ہوا علم معقول سے اگر آگہی کی ہے
نیک ہے یاوری بخت نہیں کیفیت

فاعلی چرخ بھی ہو تو سے تو کیا گر تیرے
شغل دہقان فلک رکھتے ہوں طالع ثابت

دور گردوں نہ موافق ہو تو ہوا خفیف
جز انتقال میں تو جنبش ہی اٹھائے محنت

آگے برگشتگی بخت کے چلنے کی نہیں
نظری و عملی کوئی ہی تیری حکمت

گو فصاحت میں تو سحبان ہے ولے بے تقدیر
حرف مطلب پہ زباں کو ہو تری سو لکنت

ریاضی میں ہے صناع اگر بخت ہیں بد
نقش باطل ہے تری شکل وہ جس میں صنعت

کیا ہوا جانا اگر مسئلۂ بیرو سنار
پستی بخت سے تجھکو جو نہیں ہے رفعت

جو مقدر میں نہ آئے نہ تری اسطرلاب
طالع بد سے اگر نیک نہ آئے ساعت

عمر سے ہو نہ کبھی چارۂ آزار نصیب
بو سینا ہے تو کیا سینہ میں خون حسرت

دو دوائیں ترے نسخہ میں ہوں اپنے تقدیس
نہ ہو با خاصہ تاثیر نہ بالکیفیت

علم نیرنج سے گر ہو ... تو کچھ
بے مقدر نہ ہو حاصل ثمر خوش لذت

علم سے جو سبق آموز ملائک تھا وہ دیکھ
بخت بد سے ہوا مستوجب رجم و لعنت

ہوا مسجود ملائک یہ ظلوم و جہول
یعنی انساں قوی بخت و ضعیف الخلقت

گر تصوف سے ہو صوفی سجادہ نشیں
بے مقدر نہ کرامت ہو نہ خرق عادت

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں بحث ودی
کبھی لیجاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت

کبھی میں نفی حقیقت میں تھا سوفسطائی
کبھی میں معتزلی باعث رد ردیت

کبھی میں جبری و مجبور بعقل و تدبیر
کبھی میں قدری و مختار بقدر طاقت

گہہ ملاحد کی تھی تردید کلام الحاد
گہہ وجودی و شہودی سے بیان وحدت

جوں مهندس کبھی مالوف بشکل و مقدار
جوں محاسب کبھی مصروف بضرب و قسمت

کبھی حرفوں سے تھا مطلوب مثال جفار
کبھی کچھ نقطہ سے مقصود تھا رمال صفت

خانۂ کعبہ سے خارج کبھی شکل داخل
شکل خارج تھی کبھی داخل بیت غربت

کبھی کرتا تھا قران مہ و زہرہ پہ نظر
کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت

کبھی افسون و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم
کبھی تجویز زکوٰۃ اور کبھی قصد دعوت

کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے
ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت

کبھی میں رہتا سر دوئی میں ایسا مشغول
کہ نہ تھی ایک نفس ضبط نفس کی فرصت

سیمیا سے کبھی تصویر کش موہومات
کیمیا سے کبھی میں زرکش گنج دولت

کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس
کبھی علامہ کبھی صوفی صافی طینت

کبھی میں قرب فرائض سے تھا عالی درجہ
کبھی میں قرب نوافل سے تھا والا رتبت

ماہر موسقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت

کبھی میں شاعر غرا و ادب دان بلیغ
نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت

کبھی کرتا تھا عروضی کا کبھی میں قافیہ تنگ
طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کبھی پیش نظر انجیل و زبور و توریت
کبھی مصحف میں نظر میری سیر ہر آیت

کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے موبد
ژند و پاژند میں کرتی تھی مری تبعیت

کبھی یہ آگہی شاستر و بید پر ان
کروں اک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

کبھی میں حل معما و لغز میں ذی ہوش
کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت

آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو ہاں بلہ کو اہل جنت

جابجا عالمِ مستی میں قدم کو لغزش
دمبدم نشۂ صہبا سے زباں کو لکنت

آکے اُس رشکِ مسیحا نے کہا بالیں پر
لا تنم قم کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت

شوخ بختی سے نہ اتنا نمک افشاں ہو کہ ہو
بادۂ میکدۂ عیش کی گم کیفیت

کیا سبب ہوتا کدورت سے نہیں کیوں خالی
دل ترا شیشۂ ساعت کی طرح یک ساعت

بزمِ مستی میں تو منہ بول رہیگا کب تک
صورتِ شمع سحر سوختہ روتی صورت

[illegible] دل سے تری گوشۂ تنہائی میں
بنگئی شعلۂ جوالہ کمندِ وحدت

[illegible]ت ضائع نہ کر اُٹھ بسترِ اندوہ سے تو
چل درِ میکدہ تک ہے حرکت سے برکت

[illegible] باطل سے نہ کر دل کو خنک تو اپنے
ہے تجھے مثلِ سحر یک دو نفس کی مہلت

دیکھ تو کیا اُفقِ مشرقِ انوار سے ہے
جلوہ افروز رُخِ بانوئے صبحِ عشرت

[illegible]ہیں سرِ عرصہ ہے برگشتہ عناں
اشہبِ یوم سبک سیر ہے سوئے ساحت

جانبِ شرق ہے نوری فلق بال کشا
جانبِ غرب ہے پروازِ غرابِ ظلمت

چرخِ مینائی پہ اک سبز پری کا عالم
شفقِ صبح پہ اک لال پری کی حالت

نکہتِ گل جو ہوا میں تو ہوا عطر فشاں
تازگی گل کو چمن میں تو چمن کو نزہت

[illegible] ہی جاتے ہیں سب غنچے زہے جوشِ نشاط
لوٹے ہی جاتے ہیں گل بل بے ہنسی کی شدت

[illegible] جوش پہ ہے رحمتِ باری کہ کہیں
نہ رہی کلفتِ عصیاں سے جہاں میں ظلمت

طفلِ نوشق کی مشقی کی طرح سو سو بار
دھووے مستوں کے سیہ نامہ کو ابرِ رحمت

کہے یہ رند کہ او زاہد فروش آگ نہ پھانک
مانگے گر بادۂ نو زہد کہن کی قیمت

قُل ہوا زہد کا قلیا ہوئی زاہد کی تمام
سنتے ہی قلقلِ مینائے شرابِ عشرت

[illegible]س قدر سازِ طرب ساز کی آواز بلند
چھیڑیں گر تاج کھرج کا تو ہو پیدا ہیبت

نغمہ بر لب کہیں مطرب پسرِ زہرہ جبیں
جام در دست کہیں غنچۂ مہ طلعت

لیے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی
اُٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت

چشمِ سرمست مئے نازمیں کا جل پھیلا
لبِ رنگوں پہ مسی کی پڑی پھیکی رنگت

علم سے لاکھ ہو شیخی پہ تری بے تقدیر — نہ کہے کوئی تجھے شیخ علیہ الرحمۃ

یہ مقالات مثالِ قصصِ مصنوعہ — ہوئے یکبار جو افسانۂ خوابِ غفلت

لگ گئی آنکھ مری دیکھتا کیا خواب میں ہوں — کہ مجسم نظر آئی ہے نویدِ بہجت

اللہ اللہ رے حسن اس کا کہ سر تا بقدم — تھا وہ خالق کا تماشائے ظہورِ قدرت

یاد کرتا قدِ رعنا کو ہے اُس کے زاہد — دمِ تکبیر جو کہتا ہے سدا قد قامت

چشمِ وحشی کو اگر اپنی وہ دکھلائے تو ہو — چشمِ آہو سے ہرن نشۂ جامِ وحشت

دلِ شامت زدہ کے درپئے تدبیرِ ہلاک — زلف واژوں بھی وہ رخسار پہ واژوں بخت

آتشِ حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی — موجۂ دودِ لطیف اُسکی بھووں کی حالت

فوجِ مژگاں وہ بلا ہو دے صف آرا تو کرے — دستِ بیداد سے یکدست دو عالم غارت

چاہِ بابل وہ ذقن اور دھواں زلف کا عکس — دلِ گرفتارِ عذاب اس میں ہو ہاروت صفت

لعلِ شیریں کی حلاوت پہ جو دے جاں عاشق — تو دمِ نزع بھی عناب کا چاہے شربت

نہ دمِ شرمِ تبسم سے لب اُسکے خوگر — نہ تغافل سے اُن آنکھوں کو نگہ کی عادت

کھولدے معنیٔ معدوم کمر کی جنبش — واکرے عقدۂ موہوم لبوں کی حرکت

شوخی و نازکی تعریف میں اس کی مطلع — وہ پڑھوں میں کہ جسے سُنکے ہو دل کو فرحت

شوخی اُس چہرے میں یوں گل میں ہو جیسے حمرت
نازیوں چشم میں نرگس میں ہو جیسے نکہت

لبِ پاں خوردہ کی شوخی کے ہے آگے اک بات — گر لگا دے وہ مسیحا پہ بھی خوں کی تہمت

نازک اندام وہ اور سنگدل اُن سے بھی سوا — آیا جن سنگدلوں کے لئے ہے ثمّ قست

سیلی سینہ پہ نہ تھی جعدِ پسِ پشت کا عکس — نظر آتا تھا صفائی سے الف کی صورت

چمپئی رنگ کا وہ اپنے دکھا کر عالم — ایک عالم کا ہو دل لیکے بغل میں چمپت

اللہ اللہ رے تری تمکنت اُن سے تمیز — واہ رے تیرا تبختر تری بل بے نخوت

قہر انداز بلا نازِ قیامت طناز — سحر چشمک ستم ایما و کرشمہ آفت

ماہِ نو ایک فلک پر ترے نو بردوں میں
تو فلک تو روان ہیں ترے قدیم بخدمت

کیسۂ گوہرِ انجم ترا صرفِ انعام
طاقِ اطلس گردوں ترا دقفِ خلعت

نیتِ نیک تری آئینۂ حسنِ عمل
عمل خیر ترا جلوۂ حسنِ نیت

ذہنِ عالی ہے ترا طائرِ شاخِ سدرہ
طبعِ رنگیں تری گلچینِ ریاضِ جنت

تیرا انفعال جہاں کے لیے برہانِ کرم
تیرا اکرام زمانہ کو دلیلِ رحمت

علمِ ظاہر ہے یکساں تجھے دور و نزدیک
نورِ باطن سے برابر ہے حضور و غیبت

ذہنِ صافی ہے ترا پردہ درِ غیب
موشگافی ہے تری کوہ شگافِ دقت

عقل میں تمس سا ہے تو علم میں کانِ گوہر
نقل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت

تری تدبیر ہے از دفترِ ہوش و فرہنگ
تیری شمشیر ہے از جوہرِ فتح و نصرت

دعوتِ صدق پہ لائے تری ایمان تصدیق
دستِ ہمت پہ کرے تیرے سخاوت بیعت

تجھسے راضی ہے خدا اور خدا کے محبوب
تیرا حامی ہے نبیؐ اور نبیؐ کی عترت

عزم کو ہے ترے ہر عزم میں عزمِ بالجزم
قصد کو تیرے ہے ہر قصد میں قصدِ سبقت

قوتِ روحِ ملائک چمنِ قدس میں ہو
ذاتِ قدسی کا تری عطرِ قبائے عفت

کیا اللہ نے جب تجھ سا ولی نعمتِ خلق
کیونکہ واجب نہ خلائق کو ہو شکرِ نعمت

نطقِ شیریں سے تری عام حلاوت ہو اگر
ثمرِ تلخ ہو حنظل کا سبوئے شربت

شوکتِ عقربِ جرارہ کی مانند رہے
دلِ حاسد میں خلش گر ترا رشکِ شوکت

روشِ شیشہ ہر اک سنگ ہو ریزہ ریزہ
پڑے البرز پہ گر گرز کی تیرے ضربت

سرکشف وار چھپاتا ہے فلک زیرِ سپر
کیا غضب ہے تری شمشیرِ غضب کی ہیبت

آئے طوفاں جو ترے قہر کا طغیانی پر
کشتیِ نوح بھی اعدا کی ہو گرداب صفت

وہ تری تیغ کی برش ہے کہ سایہ جس کا
کردے اک دم میں ہیولیٰ سے مفارق صورت

تیرا بدخواہ رہے حرز سے یاں تک محروم
دیں نہ تعویذ اُسے تا بہ نشانِ تربت

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گرد زمیں
تیرے توسن کی جو کاوے کی اُڑا جائے پھرت

سبے تک آیا نظر ان مہ و انجم کا جبین — ہو گیا زرد رخ شمع و چراغ خلوت

چونکے مرغ سحری جوش سے آواز خروس — ہو گئی خواب کو آوازہ کوس رحلت

باغ عالم میں ہیں مرغان اولی اجنحہ تک — مثل مرغان سحر نغمہ طراز عشرت

دی ہے مسجد میں مؤذن نے اذاں بہر نماز — باوضو ہوکے نمازی نے ہے باندھی نیت

ہوئی بتخانہ سے ناقوس کی پیدا آواز — چلے پوجا کو برہمن کوئی لیکر مورت

اُٹھے مے خوار صبوحی کے لیے لیکے سبو — کہ عداوت ہے اگر کیجیے ترک عادت

اک طرف سے ہوئی گھڑیال کی آواز بلند — ایک جانب سے لگی آنے صدائے نوبت

سحر عید ہے کہ عید کا سامان نشاط — روز شادی کی ہے آمد شب غم کی رخصت

آج وہ دن ہے کہ آغوش تسلی کرے تجھکو — سرے طوبیٰ تک ہے ہر شاہد والے قامت

اب ہیں بیدار ترے بخت مددگار نصیب — اب قوی ہیں ترے طالع تری یاور قسمت

فکر کر تہنیت عید کا اس شاہ کے تو — دور میں جس کے ہے ہر تیغ صلابت دولت

وہ شہنشاہ بہادر شہ کسرے انصاف — خسرو جم خدم و داور دارا حشمت

قوت ملت و دیں قامع کفر و الحاد — حامی شرع نبی ماحی شرک و بدعت

حکم شرعی سے کرے سلب وہ سب جذبۂ شوق — مرد مجذوب سے گر ترک ہو ستر عورت

کون اُس کا نہیں وصاف صفات نیکو — کون اُس کا نہیں سرگرم ثنا و مدحت

سنتے ہی میں نے بھی وہ مطلع روشن لکھا — مطلع صبح کو ہو سامنے جس کے خجلت

منخسف رخ ترا اے سایۂ رب العزت
کھولدے تاکی نعمت علما کو در نعمت

تیرا دروازۂ دولت ہے مقام امید — تیرا دیوان عدالت ہے محل عبرت

تیرا ایوان بہار آئین صدر رونق — تیری نیت چمن آرائے ہزار امنیت

تیرے عشرت کدہ میں بار کسے غیر نشاط — تیرے خلوت کدہ میں دخل کسے جز طاعت

صفحۂ علم پہ ہر جبیں سے تو ہمزانو — حجلۂ عیش میں ناہید سے تو ہم صحبت

حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش
دستِ حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج

شش جہت پر جو ہے غالب تہ اسرِ نحیہ امن
فتنہ کو اُٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج

نہ بجھے آب سے آتش نہ حسن آتش سے جلے
ایک سے ایک موافق کہ مریخان و مریخ

تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم
صفحہ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج

لایا ہے معنیٔ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ
ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج

خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ
رنگ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج

بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

قصیدہ نمبر ۱۶

سنہ ۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اُس بُڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا تھا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر دینگے ؎

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

اسی عرصہ میں ایک دن میں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے انہیں ترتیب دیا تھا۔ [illegible] لے۔ اُٹھی تب قطعہ پڑھا

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر

اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرا
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھئی وہ شعر؟ میں نے کہا۔ اب کیا ضرورت رہی آنکھیں بند کر کے فرمایا۔ یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے!

اس قصیدہ پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت فرمایا۔

کیا ترے فیل کے اوصاف لکھوں میں کہ وہ ہے
ابر رفتار جبل پیکر و گردوں رفعت

اُس کی خرطوم ہے گر طرۂ لیلےٰ کی مثال
تو ہیں دندانِ صفا ساعد سلمےٰ کی صفت

کیا عجب گر ہو تپِ لرزۂ ہیبت سے تری
نبض کی طرح رگِ سنگ میں پیدا سُرعت

آب بارانِ کرم تیرا ہے وہ شربتِ خضر
برسے لالہ پہ افیوں میں نہ ہو سمیّت

عدل کے لفظ کو دیتا نہیں نقطہ کوئی
عدل سے تیرے جو موقوف ہے رسمِ رشوت

عہد میں تیرے عجب کیا سرِ داغِ دلِ شمع
شعلہ میں مرہم کافور کی ہو خاصیت

پہنچے گر بہرِ سرِ جیب رفو سوزن و کلبتون
ہے نہایت سے تری دایہ کا دستِ شفقت

دورِ انصاف میں گر تیرے ہو کشتہ سیماب
زلزلہ شعبدہ پڑھے دینی ہوس کو دعوت

دیا اللہ نے وہ قلبِ مصفا تجھکو
اے شہنشاہِ صفا ذہن و سراپا صفوت

فردِ تفصیل حوائج ہے رخِ حاجتمند
عرض حاجت کی نہیں سامنے تیرے حاجت

عید کو دیکھ ترے ساتھ خلائق کا ہجوم
کہے عارف کہ یہ کثرت میں ہے ظاہر وحدت

لکھے گر خامہ ترا وصف شمیمِ اخلاق
تو ہر اک نقطہ ہو اک نافۂ مشکِ تبت

منتہی ہوں نہ کبھو تیرے صفاتِ نیکو
گر بیاں کیجیے تا حشر صفت بعد صفت

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
کہ زباں کو ہے نہ یارا نہ قلم کو طاقت

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں
با شکوہ و حشم و جاہ بعمر و صحت

خیر خواہوں کے ترے چہرے پہ ہو رنگِ نشاط
اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشکِ حسرت

قطعہ در تہنیتِ جشنِ نوروز

خسروا سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تری دی ہے چمن کو سبا کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر یارنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج
تنِ پیران کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ ملکہ کمتر
آگے ہمت کے تری گوہرِ شہوار کے گنج

نہ کیونکہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئی ہے نظر اک قدرتِ خدائے قدیر

ظہورِ نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیمِ نکہتِ گل مظہرِ لطیف و خبیر

شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرصِ عنبرِ تر ہے زمیں تو گردِ عبیر

حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالمِ بالا بھی عالمِ تصویر

جہاتِ ستہ سے بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جمِّ غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قاتل
مہِ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمینِ میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لذت شستہ ہو دیوار قہقہہ تعمیر

دیا ہے نخ کو دھو تیر نے غسلِ صحت سے
ضمیرِ خلق سے ہے شاہِ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا ہے کہ مثلِ نبضِ مسیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شکستہ تھا ترے یمنِ شفا سے کامل ہے
جو لا علاجِ مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر
تو صورتِ بشر ہوشمند خوش تقریر

اشارہ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے مجنوں کے خواب کی تعبیر

جمیل کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرہ عین بھی ہو چشمِ بصیر

نہ موجِ مے کو ہو پیچش نہ شیشے لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماریٔ فراق و زحیر

نہ برق کو تپِ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو
شرابِ تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر

تری ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

ق
شکستِ دل کو ترے یمنِ تندرستی سے
کرے درست اگر مومیائی تدبیر

تو ہوئے کاسۂ چینی کو چارہ سازِ قضا
نکالے کاسۂ چینی سے شکلِ موئے خمیر

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آوازِ خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلید قفلِ دلِ تنگ و خاطرِ دلگیر

کرے ہے والبِ غنچہ درِ ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم کے کھول کر زنجیر

کچھ انبساطِ ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر

قفس میں بیضہ کے بھی [illegible] نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن بت نہ صفیر

اثر سے بادِ بہاری کے [illegible] ساتے ہیں
زمیں پہ مہرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر

نکل کے سنگ سے گر مو [illegible] تخم فشاں
تو سبز فیضِ ہوا سے ہو وہ برنگِ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی [illegible] برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے [illegible] ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر

نہ خارِ دشت ہے نرمی میں خوابِ مخمل سے
ہر ایک تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت [illegible]
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر

یہ آیا جوش میں بارانِ رحمتِ باری
کہ سنگ سنگ میں سنگ [illegible] کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل [illegible] ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن ہے دشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی [illegible] آب
ہر اک گہر گہرِ شب چراغ پر تنویر

کرے ہے صبح شکرخندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح ہم آمیختہ ہوں شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو
سوادِ مشکِ ختن پہ ہے لاکھ آہو گیر

نہال شمع سے ہر شب چُنے گلِ شب بو
بہارِ عیش میں گلچیں کی طرح ہے گلگیر

بنے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
سیاہ رنگِ گلِ آفتاب ہو تنشیر

رہے ہے چرخ پہ ہر [illegible] جو [illegible] کش
بایں درازیِ [illegible] آفتاب ساغرگیر

عجب نہیں ہے کہ آرائش [illegible] سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پہ جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

غیر بے مایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبط ہوس
بن گیا ژالہ جو آگ سے نہ پگھلا گوہر

جوہر خوب کو درکار ہے آرائش خوب
خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھہرا گوہر

سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغز وقار
جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر

ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد
ہو نہ ہم صحبت تار رگ خارا گوہر

دلخراش اور ہے طاقت بدو دل ہے عجز
کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

فیض کو علم بالا کی ہے شرط اعتقاد
قطرۂ بے آب طباشیر سے یکتا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرط نظر
کور کیا جانے یہ کیا ہے کہ جھوٹا گوہر

صاف باطن کی موجب قدر کہ ظاہر ہو درست
ہو دل بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی حرمت ہے اگر قدر تو جوشش جوہر کی
تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

خلش خار جنوں سے ہے پروتا کیا کیا
ہر قدم پر ہو مرے آبلۂ پا گوہر

دل عاشق میں کرے کیونکہ نہ آنسو ہو اثر
اسی الماس سے بنتا ہے یہ دندا گوہر

ذوق موقوف کر انداز غزل خوانی کو
ڈھونڈا اس بحر میں اب تو کوئی ایسا گوہر

غوطۂ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر
آگے تقدیر سے تر مہرہ ملے یا گوہر

اثر مدح سے اس خسرو دریا دل کے
کہ سخن قابل لائق دل دانا گوہر

وہ بہادر شہ غازی کہ برنگ نیساں
روز برساتا ہے ابر کرم اس کا گوہر

جشن سے اس کے ہے آئین کا دریا باری
جتنے بھرتے ہیں برنگ کف دریا گوہر

زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو
سینۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر

پہنے گر گوش صدف تک یہ نوید عشرت
اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر

کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی کہ اس دولت کاش
ہوتا میں دانۂ انگور نہ ہوتا گوہر

بہ دل آب میں کثرت سے حبابوں کے بھنور
مانگ میں مثل بت خویشتن آرا گوہر

ٹوٹا ہے کشمکش عیش سے جو سبحہ کا ہار
بھر شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر

گل شگفتہ میں یہ قطرۂ باراں سے بہار
بھر دیے درج یاقوت میں گویا گوہر

چلے نہ اس شرفی آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اُس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہِ والا گہر بہادر شاہ
سراجِ دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

شہِ بلند نگہ شہریار والا جاہ
خدیوِ مہر کلہ خسروِ سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر

زمیں پہ سبزہ جو تیرے سحابِ بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کے بنے اکسیر

ق
بچشمِ مہر اگر تیرا آفتاب لقا
کرے نگاہ کرے سیر آبجو و آبِ غدیر

تو عکسِ فلس سے ہو ماہیوں کی ثروت شکار
نگینِ دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لیے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لیے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوقِ ثنا نے مدح خواں تیرا
غلام پیر کہن سال اک فقیر حقیر

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر

الٰہی آب پہ تا ہو زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک کو چھوڑے نہ تا دامنِ مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادر قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل
سپاہ وافر و ملکِ وسیع و گنجِ خطیر

قصیدہ نمبر ١٧

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر
اک گہر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا
تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو ور خورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو
مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت
غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر

ہے دلِ صاف کو عزلت میں بھی گردوں سے غبار
گرد آلود ہی ہو اتنہا گوہر

کورِ باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت
کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر

دور میں اُس کے ہو گر مرتکبِ مے کوئی
کرے ہر قطرہ کلیجے میں خراشِ الماس

مے اگر آبِ بقا بھی ہو تو ہو وہ زہراب
جس کے پینے سے ہو جینے ہی سے مے خوار کو یاس

دعوے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح
تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

کہتے اس آبِ شر انگیز کو ہیں آج بشر
کہ یہ روغن ہے سرِ آتشِ شرّ خنّاس

تا نہ باقی رہے مے اور نہ مے میں مستی
توڑتا سنگِ نمک سے ہے وہ شیشہ کا گلاس

احتساب اس کا جو دے سنگ پہ شیشہ کو ٹپک
تو صدا ہو نہ ملند اُس سے بجز حمد و سپاس

مدح حاضر ہیں پڑھوں اُس کے کوئی مطلع میں
کہ سخن فہم و سخنور کا ہے وہ قدر شناس

نطقِ شیریں وہ ترا شہد کہ ہر درد کو راس
شان میں جس کے شہا فیہ شفاء للنّاس

ہندوی زلف کے ہے پاس سدا مصحفِ رخ
عہد میں تیرے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

ہو میائی ہو حمایت ترے حق میں اُس کے
سخت گیری سے فلک توڑے کسی کی گر آس

بوٹی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آئے
بل بے ہمت ترے نزدیک یہ پتھر ہے وہ گھاس

چمنِ دہر میں نرگس بھی تری بخشش سے
رکھتی اک کاسۂ زر ہے، اور اک سیمیں طاس

کیا عجب فیض سے گر ابرِ کرم سے تیرے
بیدِ مجنوں میں ہو پیدا ثمرِ سیب و گلاس

تیری شمشیر کے آگے نہیں کھتی ہرگز
مغربی تیغِ مہِ نو کی شہا رتبۂ داس

فیضِ تعلیم سے تیرے ہو جو منکرِ انساں
احمق النّاس اُسے جانے ملکہ شناس

لوحِ تقدیر کے لکھے کو پڑھے حرف بحرف
تربیت سے تری اُمّی بھی ہو یہ حرف شناس

یوں ترا حاسدِ پُر عیب ہے عالم میں حقیر
اسپِ بد فال کوئی جیسے میانِ نخّاس

دیکھے آہو کو جو ضیغم تو وہیں عدل ترا
ڈھانک دے آنکھوں کو اُسکی روشِ گاؤ خراس

زہے خورشید کے طالع کہ شعاعِ خورشید
دم تزئین ترے گھوڑے پہ لگے جل تطاس

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اُٹھ[illegible]
جس طرح عاشقِ دل باختہ کے ہوش و حواس

پہنچے اس عرش فلک سے [illegible]
[illegible] قیاس

دوستوں کو ہوتے گنج گہرِ روز نصیب ۔۔۔ ہو نہ جز اشک سرِ دامنِ اعدا گوہر

قصیدہ نمبر ۱۸

ہے وہ جاندارو ہے مے نافعِ اعضا و حواس ۔۔۔ کہ دلِ مردہ ہو زندہ تنِ بے حس حساس

قطرۂ مے سے ترقیِ حواسِ خمسہ ۔۔۔ یوں ہو جس طرح کہ اک نقطہ سے ہوں پانچ پچاس

ہووے اس دُغنِ کبریت سے مثلِ زرِ سرخ ۔۔۔ رنگِ رخسار جو کلفت سے ہو ہم رنگِ نحاس

خشک مغزوں کو جو ہو بوئے گلاب اس کی بد ۔۔۔ تردماغ اتنا ہو دم لینے نہ دے فرطِ عطاس

قلبِ ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو تو کیوں ۔۔۔ قلبِ انساں میں تھوڑے سے مبدل ہو ہراس

اس کی دولت سے عجب کیا دلِ مفلس ہو غنی ۔۔۔ کہ یہ ہے شربتِ دینار علاجِ افلاس

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوے سے کہے ۔۔۔ آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس

اللہ اللہ رے تری مستی و بالادستی ۔۔۔ شب کیے مست کہ کر لی گردِ دلِ مساس

سلسبیل آکے اگر خلد سے ہو آبِ سبیل ۔۔۔ کہے مے نوش کہ بجھتی ہے کہیں اس سے پیاس

زندگانی سے ہے مقصود شراب و ساقی ۔۔۔ اور باقی تو ہے سب وہم و خیال و وسواس

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو ۔۔۔ پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاسِ انفاس

بیٹھ گوشہ میں نہ تو چھوڑ کے اس جلسہ کو ۔۔۔ دیکھ رندانِ خراباتِ نشیں کا اجلاس

مے نہیں برقعِ مینا میں مگر جلوہ فروز ۔۔۔ کوئی خورشید لقا ہے شفقی رنگ لباس

ہے خنک دل کبھی تو اس سے ہو سرگرمِ نشاط ۔۔۔ غم کو جا دل میں نہ دے جی کو نہ رکھ اپنے اداس

دل جو گھر غم کا ہو گیا اس میں ہو سرمایۂ عیش ۔۔۔ وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلے میں چیل کے ماس

دل پر وسوسہ کی ہوتی ہے مے سے واشد ۔۔۔ کھلتا ہے ہاتھ سے ساقی کے یہ قفلِ وسواس

یہ کتنا ہی تھا جو دل نے مرے مجھ سے کہا ۔۔۔ توبہ کر توبہ نہ کر اتنی زیادہ بکواس

مژدہ اربدِ افعال کا تو نام نہ لے ۔۔۔ [illegible] بادشہِ پاک انفاس

[illegible] کو کیا محکم اساس

نازک ایسی کمر اُس کی کہ سمجھنا مشکل — جس طرح شعر خیالی میں ہوں معنیٔ ادق
ہے گراں اس پہ نزاکت سے نہ باندھے ہرگز — گر ہو تارِ نظرِ دیدۂ عنقا منطق
اُس کا زانو وہ مصفّا کہ اگر دیکھے اُسے — آئینہ آبِ خجالت میں رہے مستغرق
کیا کہوں ساقِ بلوریں کی صفائی اُس کی — شمع گر دیکھے اُسے شرم سے آجائے عرق
قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن — نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق
آکے بالیں پہ وہ طنّاز سراپا انداز — مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگیں ناحق
مژدۂ عید سے ہے گلشنِ عالم میں بہار — نغمۂ عیش سے ہے بزمِ جہاں میں رونق
دوش پہ سروِ لبِ جو کی ہے اک سبز قبا — بر میں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں یلمق
جوشِ سبزہ سے ہے وہ فرشِ سرِ صحنِ چمن — کوئی مخمل اسے کہتا ہے کوئی استبرق
باغِ عالم میں ہے یہ جوشِ بہارِ عشرت — ٹپکے ہے نخل سے مستی میں ہمیشہ راوق
تو بھی کر تہنیتِ عید کا اُس کے ساماں — کہ ہے وہ خسروِ دیں حامیٔ دینِ برحق
وہ بہادر شہِ غازی کہ دمِ معرکہ ہوں — اُسکے تیروں کی ہدف اُسکے حسودوں کی حدق
مدح اُس کی ہے مناسب تجھے بلکہ انسب — یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق
سُن کے یہ میں نے کہا مدح میں اُسکی مطلع — جس پہ احسنت کہیں مجھ کو لبید و عمعق

تو ہے وہ نائبِ ختمِ رُسُل اے سایۂ حق
کہ ترے سایہ میں ہے گلشنِ دیں کو رونق

ابرِ رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق — کیونکہ سایہ میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق
کس کا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو — جو ترا امر ہے الحق جو کہے تو صدق
ذکرِ حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور — کرتا میخانہ میں ہے شیشہ بھی حق حق
گر کرے نشو و نما نامیۂ فیض ترا — گل جو ہو شمع سے پیدا تو گلاب و زنبق
حرفِ ہیبت کا تری کوئی زباں پہ آیا — ہوگئی وقتِ کتابت جو زبانِ خامہ کی شق
نطقِ شیریں سے ترے ہو کے صدف [illegible] — [illegible] ہو رزق

تیرا ہاتھی ہے فلک کا کہکشاں ہے خرطوم
کان دو تو مہ و خور دم ہے ذنب سر ہے راس

ذنب و راس وہ جن سے ہوں سیہ بخت عدو
ماہ و خور وہ کہ ہوا خواہ ہوں روشن انفاس

رنگ ہاتھی کا سیہ اور وہ دانت اُسکے سفید
کہتا ہے دیکھ کے یہ ظلمت و نور اپنا قیاس

طرفہ صنعت سے لپیٹا ہے شب یلدا نے
صفحۂ صبح منور کو مثال قرطاس

ختم کرتا ہے سخن ذوقؔ دعا پر اس طرح
تا ہو دریا میں گہر کان میں پیدا الماس

تو شہ بحر و بر اے شاہ سکندر فر ہو
دے خدا عمر خضر تجھکو حیات الیاس

عید ہر سال ہو نوروز تجھے با عیش و نشاط
تو ہمیشہ رہے خوش اور ترا بدخواہ اُداس

قصیدہ نمبر ۱۹

ایک خورشید لقا طرفہ جوان ارشق
تاب رخسار فلق سرخی رخسار شفق

وہ جبیں ماہ مبیں اُس پہ خط چین جبیں
تھی وہ انگشت نبی جس نے کیا ماہ کو شق

کرے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابرو تلوار
باندھکر کھینچ لے دل زلف مسلسل کی رسن

تیر انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گذار
چشم ابلق تو نگہ ترک سوار ابلق

غمزہ و ناز کرشمہ وہ بلا غارت گر
کہ نہ چھوڑیں تن عشاق میں جاں ایک رمق

سرو قامت سمن اندام گلستاں رخسار
ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق

سرو قامت سے اگر اُسکے ہو طوبیٰ سرکش
راست ہاں راست ہے یہ کل طویل احمق

شکر آمیختہ بادام مقشر دنداں
سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق

کھلنا اُسکے دہن تنگ کا ایسا مشکل
جیسے دشوار ہو مفہوم کلام مغلق

مصحف روے کتابی کو جو دیکھو اُس کے
تو کہیں صورت اخلاص نہ یا دُمطلق

لوح رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاض گردن
تاکہ ہو سرخی سنجرف نہ خون ناحق

دست دیا زو و دبر و دوش عجب صبح بہار
پنجہ و پنجۂ خورشید و حنا رنگ شفق

سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا
[illegible] اس میں بجائے درق

خدا نے دی اور خود دسرا انجام کیا۔ اللہ اللہ ان دنوں کا جوشِ طبع بھی یاد رہے گا۔ عجیب عالم تھا۔

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق ‖ پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوشِ نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن ‖ گلشن میں گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیبِ چمن شانِ چمن ‖ ہر سیمبر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سربسر مہتاب و انجم جلوہ گر ‖ اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوشِ بہار و موجِ گل ‖ دندانِ یاں خوردہ ہیں یا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر مجمعِ پیر و جواں اک طرفہ مشرق ہے کہ واں ‖ روشن دل و رنگیں ادا نورِ سحر رنگِ شفق

جامِ بلوریں میں ہے یوں عکسِ شرابِ لالہ گوں ‖ ہو جیسے کیفیت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

حسنِ گل و مہتاب نے جوشِ گلِ سیراب نے ‖ کیا باغ میں چمکا دیا نورِ سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگِ گل آلودۂ شبنم جو کل ‖ خجلت سے پانی ہو گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی ‖ کس رنگ ہوں ملکر جدا نورِ سحر رنگِ شفق

ساقی ہے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پہ ‖ آب و ہوا جائے فزا نورِ سحر رنگِ شفق

جشنِ بہادر شاہ ہے روزِ علوِ جاہ ہے ‖ ہے اسلیے بہجت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ خسروِ روشن گہر جس کو خجل ہوں دیکھکر ‖ ماہ و ثریا و سہا نورِ سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں ادر وہ ثنائے رنگِ دل ‖ ہوں دیکھکر غرقِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق ‖ ذرہ ہے تیرے فیض کا نورِ سحر رنگِ شفق

اے آفتابِ عز و شاں تیری جبیں سے ہے عیاں ‖ نورِ بقیں رنگِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روشن بیانی سے تری رنگیں کلامی سے تری ‖ شرمندہ ہوتا ہے سدا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ سیمگوں ایواں ترا وہ سائباں رنگیں گھچا ‖ لیں دام اب جیں سے صفا نورِ سحر رنگِ شفق

فانوسِ شیشہ لعلگوں روشن تری محفل میں یوں ‖ گویا کہ شیشہ میں بھرا نورِ سحر رنگِ شفق

ناتوانوں کو جو دے زورِ حمایت تیری — مارے لات اُڑ کے سرِ فیلِ دماں بچۂ بق
کہتے ہیں برقِ جہاں جس کو وہ ہے اک ادنیٰ — توپخانہ میں ترے توپ پہ زرّیں بیرق
کوتہی جس بنا پہ کرے کاہکشاں کی بھی کمند — وہ تری ہمّتِ عالی کا ہے عالی جوسق
قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحابِ ہمّت — بوٹی اکسیر کی پیدا ہو بجائے سرِق
کرتا ادنےٰ کو جو اعلےٰ نہ ترا منصوبہ — یاں تا شطرنج میں فرزیں کا نہ رتبہ بیذق
کرتا اک جست میں ہے ماہیِ گردوں کا شکا — طائرِ تیر ہوائی ترا مثلِ لقلق
ق
اے شہِ دادگر اے خسروِ انصاف پرست — اللہ اللہ رے عدالت کا تری نظم و نسق
اتنا عالم میں حذر خوں سے ہے خونخواروں کو — خونِ فاسد کو بھی ہرگز نہ کرے نوش علق
پرتو افگن ہو اگر روشنیِ طبع تری — ابرق آئینہ ہو اور سنگِ سیہ ہو ابرق
مشتری بھی ترے سطرنج کا اک مُہرہ ہے — آفتاب ایک ترے نسخہ کا گر ہے ورق
ق
ابر ہے گرچہ مثالِ نمدِ نم دیدہ — گر تری برقِ غضب جھاڑ دے اُس پر چقمق
توسنِ تابہ سے بھی جل اُٹھے زیادہ وہ شتاب — آگ لگجانے میں دیر اُس کے نہ ہووے مطلق
تیرے توسن میں وہ جلدی کہ اگر چھیڑ دے تو — یوں وہ اُڑ جائے کہ جیسے سرِ آتش زیبق
ق
شمس کو پہنچے تری رائے سے یوں بیش قمیں نور — تو ہو مغرب میں گرائے پرتوِ نورِ مطلق
جس طرح روشنیِ قلب سے اہلِ اشراق — عرصہ دور سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق
ق
ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح — تاکہ ہوں ارض و سما دونوں طبق زیرِ طبق
ہووے ہر سال مبارک تجھے عیدِ رمضاں — اور دشمن کو سے تیرے سدا رنج و قلق

قصیدہ نمبر ۲۰

ایک دن فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سال جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے۔ دل نے کہا کہ قصیدہ لکھیے اور ایسا لکھیے کہ اُستاد بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا۔ یہ طرح

بلکہ ہو جوش بہاران کرم سے تیرے
کیا عجب شاخ میں آہو کے گلِ رنگا رنگ

تیرے انصاف سے ہے بزم جہاں میں شاہا!
شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ

ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتش قہر
تو سمندر رہے پانی میں بجائے خرچنگ

ق
زیر راں تیری ہے وہ توسنِ چالاک کہ تو
چھیڑ دے ایک ذرا اُس کو جو وقت صفِ جنگ

یوں کرے جست کہ جیسے سر میدانِ نبرد
منہ سے اُڑ جائے حریفوں کے ترے خوف سے رنگ

رکھتی سرعت ہے تپ لرزۂ ہیبت سے ترے
نبض محموم کی مانند جبل میں رگِ سنگ

مرغِ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ
اور جگہ چوب قفس کے ہے ترا تیر خدنگ

ہووے حاسد کو نہ آزارِ حسد سے صحت
تاکہ دارو نہ پیالے میں بھرے تیری تفنگ

مفسد و حاسد و غماز و عدو سے سرکش
زیرِ شمشیرِ غضب تیرے ہوں چاروں چورنگ

آ نہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام
ہوتا ہے قافیہ سنجوں کا یہاں قافیہ تنگ

ق
کرتا اس رنگ سے ہے ختم سخن دیکے دعا
ذوق جو ہے ترا مداح محبتِ یک رنگ

گلشنِ دہر میں ہر سال مبارک تجھکو
جشنِ نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ

اور ترے حاسدِ بد بیں کو دکھا میں لاکھوں
خسر وار دزنئے رنگ فلک کے نیرنگ

قصیدہ نمبر ۲۲

حبذا ساقی فرخ رخ و خورشید جمال
مرحبا مطرب باروت فن و زہرہ خصال

بارک اللہ کہ درافشاں ہے تو اے ابر بہار
خیر مقدم کہ خزاں سے ہے تو اے باد شمال

للہ الحمد لبالب ہے مے عیش سے جام
شکر للہ زرِ گل سے ہے چمن مالا مال

جوش روئیدگی سبزہ سے ہوجائیگا سبز
گل زمینِ چمنِ حسن میں تا دانۂ خال

اللہ اللہ رے سرسبزیِ گلزار جہاں
کیا عجب ہو روش خضر اگر رنگِ بلال

شررِ تیشۂ فرہاد سے پیدا ہوئے گل
بل بے جوش گلِ خودرو سر دامانِ خیال

انصاف نے تیرے سہا سیماب و آتش کو کیا ‏— یوں جمع جیسے ایک جا نورِ سحر رنگِ شفق

تیری امان و حفظ سے ہو جائے حق میں شمع کے ‏— تارِ فتیل آبِ بقا نورِ سحر رنگِ شفق

خورشید تجھ سے فیض کو پہنچے تو مشرق میں ہو ‏— جزو درو لعلِ بے بہا نورِ سحر رنگِ شفق

جس پر کہ تو ہووے غضب ہو اُسکے حق میں کیا عجب ‏— سیلِ فنا برقِ بلا نورِ سحر رنگِ شفق

شمشیر کی تیری چمک خونِ عدو سے یک بیک ‏— دکھلائے ہے روزِ وغا نورِ سحر رنگِ شفق

پیکانِ تیر الماس گوں منہ سرخ سوفار و نکلے یوں ‏— گویا لگا کر پر اُڑا نورِ سحر رنگِ شفق

جلوہ ہے تیری مہر کا شعلہ ہے تیرے قہر کا ‏— ہے جس کو عالم جانتا نورِ سحر رنگِ شفق

اسپ خرابستہ ترا وہ نقرہ خنگِ بادپا ‏— غیرت سے جس کی اُڑ گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ق

اب ذوق کی ہے یہ دعا جب تک ہے شاہنشہا ‏— خورشید و مہ ارض و سما نورِ سحر رنگِ شفق

جب تک لباسِ دہر کو صابون و زنجرف ہو ‏— زینت دہ صبح و مسا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر جشن فرخ ہو تجھے اس طرح آب و تاب سے ‏— ہوں تیرے محتاجِ ضیا نورِ سحر رنگِ شفق

شاہا زمانہ میں ہو تا با آبرو داو سرخرو ‏— ہو جلوہ گر مشرق سے تا نورِ سحر رنگِ شفق

دشمن کا تیرے منہ ہو فق اور خون بھی دل میں ہو کے شق ‏— دیکھے نہ وہ اس کے سوا نورِ سحر رنگِ شفق

قصیدہ نمبر ۲۱

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ ‏— دیکھکر بھاگ گئے جیسے رنج ہزاروں فرسنگ

بل بے بالیدگی عیش کہ برگِ گل پر ‏— قطرہ شبنم کا ہے مینا سے شرابِ گلرنگ

واہ کیا گلشنِ آفاق میں ہے جوشِ بہار ‏— چہچہے کرنے لگی بلبلِ تصویرِ فرنگ

کلکِ نقاشیِ قدرت سے گلستاں میں ہے آج ‏— تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقشِ ارژنگ

خسروا آج کیا تو نے وہ جشنِ نوروز ‏— دیکھکر جس کے تجمل کو ہو جمشید بھی دنگ

ہے ترے بزمِ طرب میں پئے رسمِ نوروز ‏— صورتِ بیضۂ رنگیں فلکِ مینا رنگ

مشک افشاں ہو جائیں جو تری نکہتِ خلق ‏— نافِ آہوئے ختن سے نہ ہو کم داغِ پلنگ

ہووے جوں چادرِ مہتاب گلیمِ شبِ تار
رخ پہ نور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلق ہی رہا
دستگیری نے لیا تیری جو گرتوں کو سنبھال

گر ترے قہر کی گرمی تبِ محرق بن جائے
لبِ دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال

قوتِ ماسکہ ممسک کے قوے سے گم ہو
فیض جاری سے ترے بخل کو یاں تک ہو زوال

حکمت آموز ترا علم جہاں ہو تو وہاں
نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطوں کو مجال

ہو تری عقل سے عاجز دمِ بحثِ معقول
اک مقابلہ میں [illegible] کی عقلِ فعال

ق
دم ہے کیا بادِ صبا میں کہ دمِ سیرِ جہاں
تیرے گلگونِ سبک سیر [illegible] نقارے کی زباں

یوں ہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے
اور جب جائے کہاں سے وہ [illegible] مثلِ خیال

ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری
جب اڑان اس میں ملک کی تو نظر نے [illegible]

جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اس کا
[illegible] و ماہی کا وہاں سب [illegible]

زیب تن اس کے جو ہے ہندی کا ہر گل تصویر
پھرتا [illegible] قوس نہال

اس فلک سیر کو جو [illegible]
[illegible] سیرِ فلک [illegible]

ق
تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ
سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال

کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے
نیشکر راہ میں مانگیں گر اس سے اطفال

جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں
اس کی مستک پہ شہا جلوہ نما یوں ہے ہلال

ہے جو اس فیل کی خرطوم سرافیل کا صور
آئے اعدا پہ قیامت سرِ میدانِ قتال

اس کے دانت ان کے لیے ہیں وش تیرِ شہاب
ہے جن اعدا کو سرِ اوجِ شیاطیں کی مثال

ق
آبداری میں تری تیغ کہ ہے برق کی موج
کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش سیال

تیری شمشیر کو ہے خونِ عدو روز مباح
یہ غلط تیسرے دن ہوتا ہے مردار حلال

طائرِ روحِ عدو کے لیے صیادِ اجل
سبزۂ تیغ میں جو ہر سے لگا رکھتا ہے جال

طاقتِ دم زدن اس دور میں ہے کس کو رہی
دیکھ کر تیرا النسق اے شہِ فرخندہ خصال

پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس
لب پہ آ جائے ہے سینے سے پئے استقبال

جوشِ فوارہ ہے وہاں کثرتِ تارِ بارش
سرِ مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ باراں
ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آبِ زلال

معجزِ بادِ بہاری ہے مانندِ عصائے موسیٰ
شجرِ خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

ذوقِ مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص
شوقِ آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال

شورِ بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل
بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیت سے
اس ہوا میں ہے بطِ مے کہ اڑو لے پر و بال

ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب
رقصِ مستاں میں رہے وجد کناں شاملِ حال

بیدموں کو جو حیات آرہ گر عیسیٰ دم
شمعِ مردہ کی رگِ تار سے کھولیں قیفال

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز
جنبشِ دستِ مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار
صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گرد ملال

روزِ جشن آج ہے اُسکا کہ جسے کہتی ہے خلق
نائبِ ختمِ رسل ظلِ خدائے متعال

وہ بہادر شہِ غازی کہ اگر تیغ اُس کی
اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکوخوئے نکوروئے وخجستہ منظر
وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال

وہ مسیحا دم و یوسف رُخ و داؤد الحاں
وہ سلیماں روش و موسیٰ کف و صالح اعمال

چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخا
چشمۂ فیض و سپہرِ کان عطا بحرِ نوال

آسماں جاہ و عطارد قلم و مہرِ علم
مشتریِ دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسرو و جم حشم و دادگر کسریٰ انصاف
شاہِ دارا دل و سلطان سکندر اقبال

مدح حاضر میں پڑھوں اسکی وہ مطلع جس سے
ہمسری کی نہ رکھے مطلعِ خورشید مجال

ہو تری یک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال
مہر سے گر مہِ کامل ہو دو ہفتے میں ہلال

نیرِ جاہ ترا وہ جسے تا دورِ فلک
نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ وبال

آگئے بخشش کے ترے خرمنِ دو یکدانہ
آگے ہمت کے ترے کوہ طلا یک مثقال

ہو توی دست اگر زورِ رعایت تیرے — شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگانِ غزال

تقویت دیوے اگر پاسِ حفاظت تیرا — شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنۂ زمانہ خالی — نیلہ دنی ہے نکیموں کی خیال کہنا محال

ق
آتش و آب میں یہ رابطۂ مدل ہے — دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

کاکلِ موجِ دخاں کے لیے اُلٹے دریا — لے ترِ آب سے شانہ پرِ ماہی کا نکال

خبرِ جملۂ عشرت ہے ترا جشنِ سعید — مبتدا جس کا تھا غرۂ ماہِ شوال

ہوتی ہے حیرتِ توصیف سے تیری شاہا — روشِ غنچۂ تصویر زباں منھ میں لال

ق
بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے — یہ جو ہے ذوقِ ثنا خواں ترا اوج سگال

جشن ہر سال ترا ہووے مبارک تجھ کو — رہے جب تک کہ زمانہ میں حسابِ مہ و سال

قصیدہ نمبر ۲۳

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخ محیل — واہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل

دُزدِ زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش رُبا — لاکھ بیہوشیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار — کہ ہے حفظِ خدا جس کی نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی — زنگ دیتا ہے چھپا جوہرِ شمشیرِ اصیل

پیشِ دشمن نہ گزر حق سے نہیں سانچ کو آنچ — بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز — ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں بے قیدِ علائق کسی عالم میں بزرگ — رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل

ہے تہِ خاک بھی قاروں کو سفر حشر تلک — نہیں تا تختِ ثریٰ منزلِ آرامِ بخیل

عید یکروزہ جہاں میں رمضاں ہے یکماہ — بعد ہے کثرتِ تکلیف کی یاں عیشِ قلیل

کشتِ سبزِ فلکِ دوں سے نہ رکھ چشمِ ثمر — خوشۂ فیض سے بے بہرہ ہے یہ مزرعِ نیل

قابلِ انسان کی صحبت کے ہے انسان نہ ملک — بن گیا پیشِ نبیؐ صورتِ دحیہ جبریلؑ

نگہ وہ ہے خم میں ہے کہ شیشہ میں کیا کیا ہے سکر
رُخ کرتی ہے کس مست کی قالب تبدیل

تہنیت ہوں جو تو آج اس شہ دریا دل کا
جس کے نزدیک ہے اک قطرۂ کم قلزم و نیل

وہ بہادر شہ والا نسب و پاک گہر
حشمتِ چرخ سریر و شہِ خورشید اکلیل

ماہ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے
نظرِ مہر میں ہے اس کے وہ نورِ تکمیل

تو عجب ہے یہ شکل تقریب اس کا
اللہ اللہ رے ترے شکل شہنشاہ شکیل

مدح جامع میں پڑھوں مطلع روشن ایسا
مطلع شمس کو بھی جس کے ہو واجب تخجیل

بندہ شاہانِ سلف کے سمجھے یوں ہے تفضیل
جیسے کتب توریت و زبور و انجیل

تو ہے اس نظم میں عزت وہ اولادِ بشر
جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

تو فزا ہے [illegible] جب [illegible]
آئیں آنکھوں سے نظر معنیٔ اللہ جمیل

روئے نیکو جب دل [illegible]
دوں کیونکر کہ الحُسن الی الحُسن یمیل

ہے [illegible]
برجِ شاہی میں ہے خورشید فلک کی تحویل

دانش آموز [illegible]
بید مجنوں کو بنا دے ابکی اللسان عقیل

جوہر تیغ اجل ایک ترے حکم کی نقش
یہ تمنی قضا حکم کی تیری تعمیل

عہد میں تیرے جو ہو [illegible] تعدی سے مسدود
کھلے فعل متعدی سے نہ باب تفعیل

تشنۂ ذوقِ حلاوت ہوں نہ کیونکر سیراب
تیری شیریں سخنی سے انہیں شربت کی سبیل

نکتہ چینوں کے لیے نکتہ ہے جب [illegible] ترا
قابضِ طبع رواں ہے روشِ دانۂ بیل

جب ہوں مرغانِ ہوا تیرے نشانِ بندوق
نسر طائر کو بھی تو سمجھے اک اڑتی ہوئی چیل

مہرۂ پشت عدو میں ترا [illegible] وہ
رشتۂ مہرۂ تسبیح کی مانند دنبیل

طائر روح عدو کے لیے ہے سر پرواز
تیر کی تیری صدا جیسے کبوتر کو غلیل

ق

وہ قیامت ہے تری نوبت کا شورِ غوغا
دم نہ مارے کبھی سن پائے جو گھوڑوں کی صہیل

نالۂ بوق کی ہیبت سے کہ پھونک سکے پاؤ
گوچہ صور سے گزرے جو دم اسرافیل

یارب ہمیشہ دولھا دلہن میں رہے سہاگ
جب تک کہ ہووے نیچے زمیں اوپر آسماں

مہندی کے وصف لکھنے کے قابل نہیں کہ ہے
نیلا سا ایک کاغذ بے مسطر آسماں

جو برج اُڑے ہے اُڑکے یہ ہوتا ہے وہ بلند
رکھ لے ہے سر یہ مثلِ گُلِ احمر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جاے صبح تلک گوہر آسماں

پہنچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

عیش و طرب کو مژدہ کہ کرتا جہاں میں ہے
زہرہ سے اب قرآن مہ انور آسماں

ہنگام بزمِ عقد ستاروں کے واسطے
کیا کیا سجے ہے اوج و شرف کے گھر آسماں

بدبیں کے ہے نظر کے جلانے کے واسطے
انجم سپند آگ شفق مجمر آسماں

جس وقت سہرہ باندھ کے دولھا ہوا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں

کرتا تھا اِن یکاد کو دم پڑھکے دمبدم
دولھا کے صبح دم رخِ روشن پر آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخلِ آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخِ خشک تمنا کو نخلِ سبز
درپردہ مثلِ پردۂ بازی گر آسماں

شادی کا اُس کے نورِ بصر کے ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طواف در آسماں

وہ شاہِ نامور کہ بہادر شہ اس کا نام
ہو حکم سے نہ اُس کے کبھی باہر آسماں

وہ آفتابی اُس کی تجمل جس سے آفتاب
وہ چتر اس کا جس سے نہ ہو ہمسر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے
مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ ساز میں یہ دیکھے جو فرخ فر آسماں
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں

نہ آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں

خطبہ کے واسطے ترے نامِ بلند کے
گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسماں

وہ بحرِ بے کراں ہے تری ہمتِ وسیع
ہے بُلبُلا سا ایک کنارے پر آسماں

اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں

افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب اگر
مثلِ حباب جامے سے ہو باہر آسماں

شادی کی اس کی دھوم ہے آج آسماں تلک
تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں

فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کو ہے جس کی جھکاتا سر آسماں

ہے اس کی بارگاہ میں مانندِ چوبدار
حاضر عصا کے کاہکشاں لے کر آسماں

اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر سرور
ہے پیر پہ جوانوں سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں

فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کے ہو کم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

تو رونقِ جنت مطبخِ عالی میں اس قدر
ہے جس کا ایک تودۂ خاکستر آسماں

اس روشنی کی چند دکھا دیجیے بیاں
نازاں ہے آفتاب کے پنجہ پہ آسماں

ابرِ بہار دودِ چراغاں سے تو بہ تو
ہوں سات آسماں کی جگہ ستر آسماں

چشمِ قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند
کاجل لگائے اس کے دھوئیں سے گر آسماں

کر ڈالے پارہ پارہ فلیتوں کے واسطے
مہتاب کو سمجھ کے کہن چادر آسماں

یہ کہنہ و سیاہ وہ خوش رنگ و نو بہ نو
فائق ہو کیا سبوچۂ ساچق پہ پر آسماں

تھلیوں میں ہیں وہ نقل ہے ان کا عکس اگر
لے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں

آرائش ایسی اور وہ گلہائے رنگ رنگ
اوڑھا ساچن میں غنچۂ نیلوفر آسماں

بنوائے اس میں پھول طلائی و نقرئی
لے لے کے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں

نقار خانہ کی ہے چراغاں سے وہ شکوہ
گویا ہے اک زمیں پہ پڑا اخضر آسماں

ق
کرتا ہے رقص تہنیت پہ نقار خانہ کی
شہنائی کی صدا کو جو سن کر آسماں

آوازۂ دمامۂ نوبت سے گونج اٹھا
وہ جو سب آسمانوں کے ہے اوپر آسماں

دولھا دلہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی
آیا ہے اک سہاگ پڑا بن کر آسماں

جائے عجب نہیں ہے کہ عطرِ سہاگ کے
شیشہ کے شیشہ بھر کے لنڈھا دے گر آسماں

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا
نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نہالِ تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا
نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جب تک نشاط افزا
شرابِ عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشنِ جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکامِ شریعت سے
خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محرابِ عبادت سے
نمازِ اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے
ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیبِ منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آئیں
قلمزن تا ہو مشک افشاں و کاغذ خط سے مشک آگیں
زباں پہ تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہلِ سخن تحسیں
ترا مداح دائم خسرو ذوقِ سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعاگو ہو ثناگر ہو

اشعار متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ

قصیدہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے ۔۔۔ قصدِ صید افگنی کیا جس دم
خونِ نخچیر سے ہوا سارا ۔۔۔ دامنِ دشت لالہ زارِ ارم
نہ بچا اُس شکار افگن سے ۔۔۔ صید کوئی سوائے صیدِ حرم
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ ۔۔۔ ہوئے مسکن پذیرِ دشتِ عدم
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ ۔۔۔ ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
سمجھے شیر آپ کو ہزار غنیم ۔۔۔ اُس کے پر سامنے ہے مثلِ غنم
شیر گردوں بھی اسکے لشکر میں ۔۔۔ پاسے ہرگز نہ قدرِ شیرِ علم

سرِ ہفت آسماں جبتک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو

رہے نامِ سلیماں تا نگینِ حکمرانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے

رہے نامِ فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے

ترا اے خسروِ ذوالاحتشم عالم مسخر ہو
سرِ پر سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخارِ ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
زمیں میں تا ہو کان اور کان میں ہو جوہرِ کانی

رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
پئے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضے میں بحرِ پُر گہر ہو کانِ پُر زر ہو

بھبک تا عود کو آتش میں اور آتش کو مجمر میں
رہے نافہ میں مشکِ اذفر اور بو مشکِ اذفر میں

گُلِ تر تا ہو گلداں میں تری بو تا گلِ تر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں

ترے ابرِ کرم سے باغِ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خُلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریقِ رہبری میں خضر جب تک ہو ہدایت فن
رہے ادریس تا قطعِ تعلق سے جناں مسکن

سہارا ہووے تا بحرِ غریق الیاس کا دامن
مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن

چراغِ عمر سے تیری جہاں سارا منور ہو
فروغِ اسلام کو ہو رونقِ دینِ پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
ثریا تورتن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو

کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
کرے وسمہ سے تا قوسِ قزح سبزا اپنے ابرو کو

لبِ پاں خوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیری انگشتِ سناں پر ہو

دستِ ہمت نے ترے کھوئی رُپئے کی یہ قدر	چٹکیوں میں ہیں اُڑاتے اُسے کیا کیا صراف
دیتا ہے تیری فوج میں نقارہ جب فلک	آتا ہے صاف چوب کی صورت نظر ہلال
تا نسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے	منظور تجھکو جبکہ شکارِ پرند ہو

مطلع قصیدہ مدح حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ

قصیدہ مرقومۃ الذیل آغاز شباب کا تھا والد مرحوم نے ایام جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ اُستاد مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔ یہ چند اشعار یادگار رہے۔ اللہ ع۔ تو باقی و یادگار باقی +

آج کچھ ایسی ہوائے عیش کی تاثیر ہے	ہر ورق کاغذ کا رشکِ گلشنِ کشمیر ہے
گو نہالِ دشت کو شوقِ حنابندی نہیں	ہاتھ کیوں مہندی سے رنگتا برگِ بید انجیر ہے
مدح حاضر میں سنائے مطلع روشن کہ ذوق	منتظر مشرق میں بیٹھا مہر پُر تنویر ہے
نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے	ہر اذاں میں شامل اور داخل ہر تکبیر ہے

بادشاہی قصہ خوانوں میں میر امیر علی نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ اُنہوں نے اُستاد مرحوم سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہدیجئے کہ داستان میں جب ایسا موقع آتا ہے تو اشعار حسبِ دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہجاتا ہے۔ اُستاد مرحوم نے حسبِ عادت وعدہ کر لیا مگر پورا کرنے کی فرصت کہاں۔ جب کئی تقاضے گزر گئے۔ اور اُنہوں نے پھر کہا تو ایکدن فرمایا کہ جب ہم بادشاہ کے لئے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا۔ اس میں طبیعت پر زور ڈال کر کہینگے۔ تمہارا کام ہو جائیگا ہمارے قصیدہ کا ایک جزو ہو جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا +

مخمس در مدح

خسروا چڑھ کے سرِ گنبدِ دوّار ہلال
خود لب عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ہلال
حاضرِ خدمتِ عالی ہے بہرکار ہلال
گرز بردار ہے خورشید کا ندار ہلال
آسماں لے کے سپر چلتا ہے تلوار ہلال

دستِ ہمت ترا خورشید سے ہے بالاتر
تیری بخشش سے ہے نیساں عرقِ شرم میں تر
آئیں تیرے درِ دولت پہ گدا یا نہ اگر
اپنے کاسے میں بھرے چرخ وہیں لعل و گہر
اور کشتی میں بھرے درہم و دینار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
عید ہر سال ہو فرخ تجھے با حشمت و جاہ
تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دولتخواہ
اور جو حاسد ہیں ترے واسطے اُن کے ہمراہ
چرخ پر تیز کرے خنجر خونخوار ہلال

قصیدۂ ناتمام درمنقبت

لکھوں جو میں کوئی مضمونِ ظلمِ چرخِ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں
یہ حال ہے مرا ضعفِ دماغ سے کہ مجھے
صدائے صورِ قیامت ہے ہر مگس کی طنیں
زمانہ عربدہ پرداز و بخت بدانساز
ستارہ بدسیرِ کاش و چرخ برسرِ کیں
عجب نہیں ہے کہ راہب خطِ چلیپ سے
بنا دے تیرے طویلہ کے واسطے خر زیں

رباعیاتِ مدح

شاہا تجھے با دولت و بختِ فیروز
فرخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز
ہے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہرِ عالم افروز

خورشید سے یکروز جہاں میں نوروز
ہے تجھکو زمانہ میں شرف دوازدہ ماہ
اور تجھ سے جہاں روز مسرت اندوز
اور ہے مہر جہاں تاب کو یکماہ یک روز

کہتا ہے یہ فیروزی رنگ نوروز
ہو دشمن سرکش کے لیے سہم الموت
تو موصوف اعدا پہ مقرر فیروز
اے شاہ عدو کش ترا تیر دل دوز

دعا ہے ذوق کی یہ خلعت بلیعہدی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
مبارک آپ کو یا آفتابی و کرسی
بحق سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

اشعار قصیدہ

آگے تیری طبع موزوں کے ہے اک نخل عبث
فیض سے تیرے نہ کیونکر اک جہاں سرسبز ہو
یہ جو کرتے ہیں عدو [illegible]
ذات ہے تیری [illegible] حیات

اشعار قصیدہ ہفتدہ زبان

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
جوش روئیدگی سبزہ یہ یاد آئی ہے
جس طرح شعلہ کا عالم ہو یہ فانوس خیال
آب وایلوا ہوئے [illegible]
آیت [illegible] اللہ [illegible]
خوف سے یوں ترسے [illegible]

شاہا یہ عمر و دولت و اقبال و عز و جاہ
بلکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز
فرخ یہ تجھکو سالگرہ ہو ہزار سال
ہوں جس میں بے شمار گرہ [illegible]

کوہ اور آندھی میں ہیں گر آتش و آب خاک باد
تاکہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست پون باز
چل [illegible]
چھو [illegible]

سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں انہیں سامنے سے اُٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے؟

یہ درست ہے کہ گراں سنگ قرض تھا اور گرانبہا فرض تھا جس سے آج میں ہلکا ہوا۔ لیکن مہروں کا ساتھ ہے، اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے۔ ہائے دلکیر محنت تھی۔ لیکن دلپذیر محنت تھی۔ سخت کام تھا۔ مگر مزے کا کام تھا۔ اور ثواب پر انجام تھا کہ اُستاد کا کلام تھا۔ اب یہ کام کہاں آہ اُستاد کہاں۔ اُستاد! خیر آزاد! بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں کہ بہار نظر اور سماعت وغیرہ وغیرہ۔ ایک ایک کرکے انسان سے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ تب وہ کیا کرتا ہے۔ صبر کرتا ہے بس صبر کرکہ یہ نعمت بھی رخصت ہوئی۔ اور نہ کروگے تو کیا کروگے۔ بندگی کا عالم بے چارگی کا ماتم ہے۔

خاتمۂ تحریر بس دعا پر ہے کہ:-

الٰہی تو جانتا ہے۔ آزاد نے جو کچھ کیا نیک اور پاک عقیدت سے کیا ہے اور میرے حکم سے کیا ہے۔ اس خدمت کو قبول کر۔ کلام کو عمر دے۔ نام کو روشن کر اور آزاد کے حال پر رحم کر کہ تو

ارحم الراحمین

نیرنگِ خیال

مع ازدیاد مضمون نظمِ اُردو

بظاہر ایک خیالی تصویر ہے۔ مگر دور اندیشی کی آنکھ سے زمانہ اور اہل زمانہ کو جس نظم و نثر کی ضرورت ہے اس کا جگہ جگہ پر وا ز بتایا گیا ہے۔ اندر سبھا اور چہار درویش جیسے افسانوں کو طاق پر رکھکر ملٹن اور شکسپیر کے کلام کا اندز۔ کالیداس کے ترانے متقدمین شعرائے اُردو کے تخیلات کا بین فرق ثابت کرتا ہے کہ نظم ہو یا نثر اسے تشبیہ اور استعاروں سے برہنہ کرکے اگر دیکھا جائے تو تحوان مندرجہ مفید اور کارآمد مغز ہونا چاہئیے۔ جامعیت کی علیحدگی کے بعد نتیجہ خیز مادہ ہونا لازمی ہے ورنہ بیکار ہے۔ تحصیل لاحاصل ہے۔ اور ایسی نثر کی اب ضرورت نہیں جو تکمیل مطالب سے قاصر ہو۔ تمثیلاً مغربی زبان کے جواب مضمون Essay اور پیش کرکے شعرا اور اہل قلم کو ہدایتیں ہیں کہ مشرقی زبان اُردو کے مالک بن کر مغربی خزانوں پر بھی متصرف ہوں۔ اور دونوں زبانوں کے تجربے سے ایک ایسا مواد پیدا ہو جس سے ملک سیراب ہو اور زبان کا خزانہ مالا مال ہو جائے۔ ان تمام مطالب کو مولینا نے نظم کے بدلے نثر کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ نیرنگ خیال کے تخیل اور نثر لطیف کو ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے۔ اس سے بہتر کوئی کتاب زبان اُردو کے پاس نہیں جو نثر کے عجائب خانہ میں رکھی جائے باایں ہمہ ایسی عدیم المثال مشعل ہدایت کی قیمت صرف ۸ ؍

نصیحت کا کرن پھول

اس روشن خیالی کی چمک ملک میں ابھی نہ تھی کہ ملک کی آبادی کا نصف حصہ یعنی مخدرات عصمت اُس وقت تک تاریکی میں بھی جس کا درد رکھتے ہوئے مولینا آزاد نے نصیحت کا کرن پھول تعلیم نسواں ایک دلچسپ افسانے کے طور پر ایک میاں بیوی کی بحث نہایت نتیجہ خیز پیرایہ میں لکھا ہے کہ ہونہار کو تیلیوں کی نمود بہتر ہے یہ تو ثابت ہوتا ہے آسان اُردو سیدھے سادے فقرے روزمرہ کی بول چال اور ناصحی دلبستگی کا سامان ہے۔ قیمت صرف ۸ ملنے کا پتہ آزاد بکڈپو دہلی